CALL No. { ۳۷۰۰۵۱ / ۲۷۱ } ACC. No. ۱۲۶۴۲

AUTHOR

TITLE تعلیم

URDU STACKS



THE BOOK MUST



MAULANA AZAD LIBRARY
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY

RULES:—

1. The book must be returned on the date stamped above.
2. A fine of Re. 1-00 per volume per day shall be charged for text-books and 10 Paise per volume per day for general books kept over - due.



سلسلۂ انجمن ترقی اردو

فلسفۂ تعلیم

یعنی

حکیم ہربرٹ سپنسر کی کتاب "ایجوکیشن" کا

ترجمہ

جس کو مولوی خواجہ غلام الحسنین صاحب پانی پتی نے

حسب فرمایش "انجمن ترقی اردو"

باضافہ دیباچہ و تذکرہ مصنف و حواشی

کثیرہ و دیگر امور ضروریہ مرتب کیا

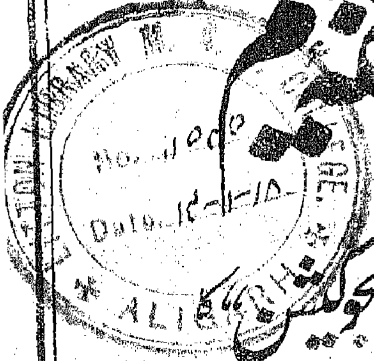
اور

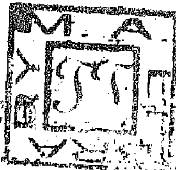
ڈیوٹی بک ڈپو مدرسۃ العلوم علیگڈھ

نے

مطبع مفید عام آگرہ میں باہتمام محمد قادر علیخان صاحب چھپوایا

۱۹۰۶ء





بسلسلۂ انجمن ترقی اردو

فلسفۂ تعلیم

یعنی

حکیم ہربرٹ سپنسر کی کتاب "ایجوکیشن" کا

ترجمہ

جس کو مولوی خواجہ غلام الحسنین صاحب پانی پتی نے

حسب فرمایش "انجمن ترقی اردو"

باضافہ دیباچہ و تذکرہ مصنف و حواشی

کثیرہ و دیگر امور ضروریہ مرتب کیا

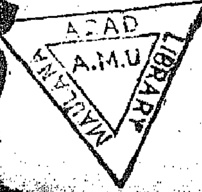
اور

ڈپوٹی بک ڈپو مدرستہ العلوم علیگڈھ

نے

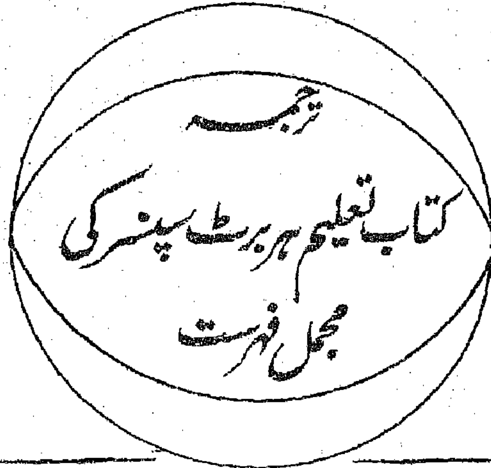
مطبع مفید عام آگرہ میں باہتمام محمد قادر علیخان صوفی چھپوایا

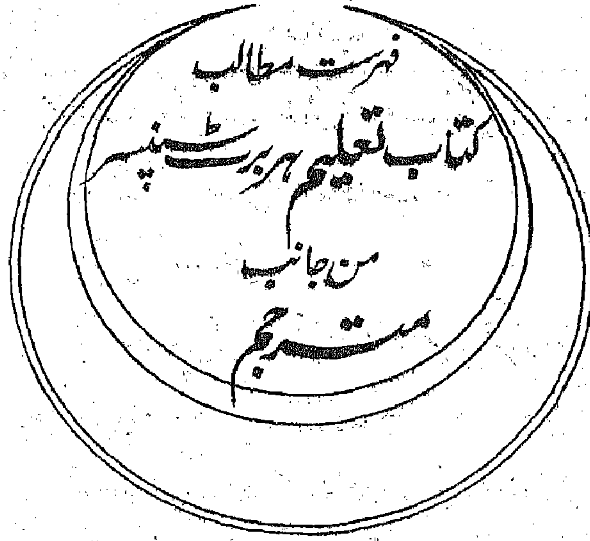
۱۹۰۶ء



URDU STACKS


M.A.LIBRARY, A.M.U.
U1462


ترجمہ
کتاب تعلیم ہربرٹ سپنسر کی
مجمل فہرست



فہرست مطالب
کتاب تعلیم ہربرٹ سپنسر
من جانب
مترجم

باب دوم

تعلیم عقلی

(صفحات ۸۹-۱۶۴)

باب سوم

تعلیم اخلاقی

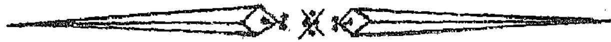
(صفحات ۱۶۳-۲۲۱)

باب چہارم

تعلیم جسمانی

(صفحات ۲۲۱-۲۹۷)

باب گیارہ



۲۵۸



۳۷۰۰۱
۲۶۱
۲۷۹۳

تعلیم کے متعلق یہ چند باب جو میں نے لکھے ہیں جب ان کے اصل اڈیشن کی مانگ بڑھنے لگی۔ تو مجھے خیال پیدا ہوا کہ ایک ایسا اڈیشن شایع کرنا مناسب ہے۔ جو بآسانی عام لوگوں میں زیادہ اشاعت پاسکے اضلاع متحدہ (امریکہ) میں اس کتاب نے بہت کچھ اشاعت حاصل کی ہے۔ اور ممالک فرانس و جرمنی و اٹلی و روس و ہنگری و ہالینڈ و ڈنمارک کی زبانوں میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں[۱]۔ ان واقعات نے مجھے اس بات کا یقین کرنے کے لیے اور زیادہ تقویت دی کہ انگلستان میں وسیع تر اشاعت کی غرض سے۔ اس کتاب کے ایک ارزاں اڈیشن کی ضرورت ہے۔

---

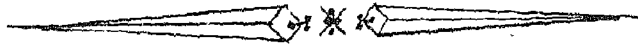
۱ اب (۱۸۹۹ء میں) سپین۔ سویڈن۔ بوہیمیا۔ یونان۔ جاپان۔ چین اور بلگیریا کی زبانوں اور سنسکرت و عربی کا اضافہ کرسکتے ہیں۔

متن میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی - اگر زیادہ اہم مشاغل درپیش نہ ہوتے تو میں بہ غور اس کتاب پر نظر ثانی کرتا - مگر بجائے اس کے کہ زیادہ اہم کاموں کو ملتوی کیا جاتا - میں اس پر نظر ثانی کرنے سے باز رہا -

چوں کہ قیمتی اڈیشن کی فروخت ابھی - جو اُسی کارخانہ کا شایع کیا ہوا ہے جس نے یہ ارزاں اڈیشن شایع کیا ہے - بدستور جاری رہیگی اس لیے کتاب کی فرمایش کے وقت یہ ضرور بتانا چاہیے کہ کون سا اڈیشن مطلوب ہے - گراں یا ارزاں -

لنڈن

ستمبر ۱۸۶۸ء





تمہید محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سولھواں سالانہ اجلاس - جو ہندوستان کے قدیم دارالسلطنت شہر دہلی میں ۲۷ دسمبر ۱۹۰۲ء سے ۴ جنوری ۱۹۰۳ء تک رہا - پچھلے تمام اجلاسوں میں ایک خاص امتیاز رکھتا ہے - چوں کہ ان دنوں دہلی میں حضرت شاہنشاہ معظم ایڈورڈ ہفتم کے جشنِ تاجپوشی کی تقریب تھی - اس لیے یہ اجلاس اس قدر بارونق تھا کہ گذشتہ اجلاسوں میں اُس کی نظیر نہیں ملسکتی - اس کانفرنس کے صدر انجمن ہز ہائینس سر آغا خاں تھے - اسی کانفرنس میں لارڈ کچنر بہادر کمانڈر ان چیف سر مائیکل ہیکس بیچ سابق وزیر خزانہ انگلستان - اور سر منچرجی بھاؤنگری ممبر پارلیمنٹ جیسے معزز اور سر برآوردہ ارکان سلطنتِ برطانیہ نے شریک ہوکر مسلمانوں کے تعلیمی معاملات سے ہمدردی ظاہر کی - اسی کانفرنس میں شمس العلماء مولانا خواجہ الطاف حسین حالی نے اپنی لاجواب نظم پڑھکر سنائی - جس کی یادگار میں مدرسۃ العلوم علی گڈھ کے لیے دو ہزار روپیہ سے زیادہ چندہ جمع ہوگیا - اسی کانفرنس میں - کانفرنس کی تجاویز پر پوری طرح عمل کرنے کے لیے خاص انتظام

کیا گیا - اِسی کانفرنس میں مقاصد کانفرنس کو وسعت دی گئی - اور صیغۂ علمی - صیغۂ اصلاح تمدّن اور صیغۂ امورِ متفرقات کانفرنس کے ساتھ شامل کیے گیے -

انجمن اُردو کا قیام

صیغۂ علمی کی عملی کارروائی کا آغاز اِس طرح ہوا کہ ۴ جنوری ۱۹۰۳ء کو کانفرنس کے ایک غیر معمولی اجلاس میں انجمن ترقی اُردو کی بنیاد قایم ہوئی - اور بزرگان ذیل اُس کے عہدہ دار اور کارکن قرار دیے گیے -

۱- ٹی - ڈبلیو - آرنلڈ[1] صاحب - ایم - اے - پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور — صدرِ انجمن

۲- شمس العلماء ڈاکٹر مولانا نذیر احمد خاں صاحب ایل - ایل - ڈی

۳- شمس العلماء مولانا خواجہ الطاف حسین صاحب حالی — نائب صدرِ انجمن

۴- شمس العلماء خان بہادر مولوی ذکاء اللہ صاحب

۵- شمس العلماء مولانا محمد شبلی نعمانی .. سکرٹری

۶- منشی حامد علی صاحب صدیقی .. .. اسسٹنٹ سکرٹری

اِس کے بعد ۸ اپریل ۱۹۰۳ء کو انجمن اُردو کا دستور العمل چھپا کر شایع کیا گیا - چونکہ یہ ایک علمی انجمن ہے - اور کسی مذہب و ملّت سے اِس کو کچھ سروکار نہیں ہے - اِس لیے ملک کے روشن خیال اور علم دوست اصحاب نے - بلا تخصیص کسی فرقہ کے انجمن کے ساتھ ہمدردی ظاہر کی - اور سیکڑوں آدمیوں نے اُس کا رُکنِ اعانت بننا منظور کر لیا -

---

[1] - پروفیسر آرنلڈ صاحب حال ہی میں ہندوستان سے قطع تعلق کر کے ولایت چلے گیے ہیں - اور اُن کی جگہ جناب مسٹر بیل صاحب ایم - اے ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب - اپنی اعلیٰ علمی قابلیت اور اُس ہمدردی کی وجہ سے جو اُن کو اہلِ ملک کی تعلیمی ترقی کے ساتھ ہے - صدرِ انجمن منتخب ہوئے ہیں - صاحب ممدوح نے اس سے پہلے ہی انجمن کا رُکنِ اعزازی ہونا خوشی کے ساتھ منظور کر لیا تھا -

انجمن مذکور کا مقصد

انجمن کا بڑا مقصد یہ ہے کہ اُردو زبان کو علمی حیثیت سے ترقی دی جائے - اور فضول کتابوں کا جو ذخیرہ آئے دن بڑھتا جاتا ہے - اُس کو روکا جائے مختلف علوم و فنون کی عمدہ عمدہ اور مفید کتابیں انگریزی عربی وغیرہ سے اُردو میں ترجمہ اور تالیف کرائی جائیں اور اس طرح ملک میں علم کا صحیح مذاق پیدا کیا جائے

"ایجوکیشن" کے ترجمہ کا عام اشتہار

جون سنہ ۱۹۰۳ء میں انجمن نے چند کتابوں کے ترجمہ کا ایک عام اشتہار دیا - اور یہ شرط قرار دی کہ جو لوگ اُن میں سے کسی کتاب کا ترجمہ کرنا چاہیں - اُس کے ابتدائی دس صفحوں کا ترجمہ بطور نمونہ سکریٹری صاحب کے پاس بھیج دیں - جس شخص کا ترجمہ پسند ہوگا اُس سے تمام کتاب کا ترجمہ کرایا جائے گا - ان کتابوں میں سے ایک مشہور و معروف فلسفی ہربرٹ سپنسر کی کتاب "ایجوکیشن" تھی اس کتاب کے ترجمہ کے متعلق انجمن نے جو رائے قائم کی ہے وہ سکریٹری صاحب کی سالانہ رپورٹ سے واضح ہوتی ہے جس کا اقتباس ذیل میں درج ہے :-

"یہ کتاب مشہور فلاسفر ہربرٹ سپنسر کی تصنیف ہے جس کا موضوع تعلیم ہے یہ کتاب اس رتبہ کی ہے کہ اگر انجمن اُردو کی طرف سے صرف یہی ایک کتاب ترجمہ ہو کر شائع ہوتی تو انجمن مبارک باد کی مستحق تھی - چونکہ یہ کتاب ایک معرکۃ الآرا کتاب تھی اس لیے اس کے ترجمہ میں نہایت احتیاط سے کام لیا گیا - ترجمہ کا عام اشتہار دیا گیا - اور ہندوستان کے مختلف حصوں سے پانچ ترجمے آئے - یہ تمام ترجمے شمس العلماء ڈاکٹر مولوی نذیر احمد صاحب - خان بہادر شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ صاحب - شیخ محمد اقبال صاحب ایم - اے - مسٹر آرنلڈ صاحب پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور - اور دیگر ممبروں کے پاس اظہار رائے کے لیے بھیجے گئے باتفاق آراء مولوی غلام الحسنین پانی پتی کا ترجمہ پسند کیا گیا"[۱]

---

[۱] دیکھو سالانہ رپورٹ انجمن ترقی اُردو بابت سنہ ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۲ - مرتبہ شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی ناظم سررشتہ علوم و فنون حیدرآباد دکن -

اس ترجمہ کی نسبت بعض بزرگوں کی رائیں کتاب کے آخر میں درج ہیں۔

کتاب کی تقسیم قبل اس کے کہ ترجمہ کی بابت کچھ تحریر کیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اصل کتاب "ایجوکیشن" کے مضامین کا ایک مختصر سا خاکہ کھینچ دیا جائے۔ تاکہ مصنف کے خیالات کا ایک عام نقشہ ناظرین کے ذہن میں جم جائے۔ اور مطالب کتاب کے سمجھنے میں سہولت ہو۔ مصنف نے اپنی کتاب کو چار بابوں میں تقسیم کیا ہے پہلا باب بطور مقدمۂ کتاب کے ہے۔ دوسرے باب میں تعلیم عقلی۔ تیسرے میں تعلیم اخلاقی اور چوتھے میں تعلیم جسمانی سے بحث کی گئی ہے۔

باب اوّل کا خلاصہ باب اوّل کا عنوان یہ ہے "کون سا علم سب سے زیادہ قیمتی ہے"؟ اس میں اوّل یہ بتایا ہے کہ لوگ ہر ایک معاملہ میں آرائشی اور نمائشی چیزوں کو مفید اور ضروری چیزوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور تعلیم و تربیت میں بھی اسی قاعدہ کی پابندی کی جاتی ہے۔ بچوں کو مفید اور بکار آمد علوم کی تعلیم نہیں دی جاتی۔ بلکہ ایسے علوم سکھائے جاتے ہیں۔ جن کو عوام الناس عمدہ خیال کرتے ہیں۔ اس سے تعلیم کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ جو بچے اس قسم کی تعلیم پاتے ہیں وہ بڑے ہو کر اپنے فرائض کو کما حقہ ادا نہیں کر سکتے۔

اس کے بعد مشاغل زندگی کو بلحاظ اُن کی عظمت و ضرورت کے پانچ حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) وہ کام جو بلا واسطہ "حفاظت نفس" میں مدد دیتے ہیں۔ مثلاً چوٹ ٹکر وغیرہ کے صدمہ سے اپنے آپ کو بچانا۔

(۲) وہ کام جو بالواسطہ "حفاظت نفس" میں مدد دیتے ہیں۔ یعنی۔ اپنی ضروریات زندگی کا بہم پہنچانا۔

(۳) وہ کام جو اولاد کی تعلیم و تربیت سے متعلق ہیں۔

(۴) وہ کام جو فرائض تمدّن اور باہمی معاشرت سے متعلق ہیں۔

(۵) وہ کام جو شخصی تفریح اور حظّ نفس سے متعلق ہیں۔

اِن پانچوں مشاغل کی اضافی قدر و قیمت کا بیان کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ بچوں کو اِن پانچوں چیزوں کی تعلیم ایک مناسب اندازہ کے ساتھ دینی چاہیئے۔ یعنی جو امور "کامل معاشرت" میں زیادہ ممدّ و معاون ہوں اُن کی تعلیم زیادہ دی جائے اور جن کو "کامل معاشرت" سے کم تعلق ہو اُن پر نسبتاً کم توجہ کی جائے۔

اِس کے بعد تعلیم کی اِن پانچوں شاخوں پر علیحدہ علیحدہ نہایت شرح و بسط کے ساتھ عالمانہ اور محققانہ بحث کی ہے۔ جس کی بیسیوں مفید اور کار آمد باتیں اور مختلف علوم کے مسائل ضمناً آ گئے ہیں۔ یہاں اُن کا مجمل بیان کیا جاتا ہے۔

تعلیم کی پہلی شاخ یعنی "بلاواسطہ حفاظتِ نفس" کے متعلق لکھا ہے کہ اس کا انتظام قدرت نے زیادہ تر اپنے ہی ہاتھ میں رکھا ہے۔ بچہ ابتدائے سنِ تمیز سے خود بخود اُن چیزوں سے بچتا ہے۔ جن سے صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ مثلاً کسی اجنبی آدمی یا جانور سے بچنا۔ سخت تیز اور نوک دار چیزوں سے بچنا۔ جیسے اینٹ پتھر۔ چاقو۔ چھری وغیرہ۔ اِس لیے اس تعلیم پر زیادہ توجہ کی ضرورت نہیں۔ مگر "بلاواسطہ حفاظتِ نفس" کی ایک اور قسم بھی ہے مثلاً وہ امراض اور تکالیف جو آہستہ آہستہ کام تمام کر دیتی ہیں۔ اِن سے ضرور بچنا چاہیئے۔ اس کے بعد بیماری کے نقصانات بیان کر کے اس بات پر زور دیا ہے کہ قوانین صحت کی واقفیت ہر شخص کے لیئے لازمی ہے۔ اور فزیالوجی (علم الاعضاء) کو نصاب تعلیم میں داخل کرنا ضروری ہے

تعلیم کی دوسری شاخ یعنی "بالواسطہ حفاظتِ نفس" جس کا مقصد حصولِ معاش ہے اس پر بھی مفصل بحث کی ہے۔ اور یہ ثابت کیا ہے کہ زندگی کے تقریباً تمام کاموں

میں سائنس کی واقفیت نہایت ضروری ہے۔ مثلاً صنعت و حرفت کے کاموں میں حساب کی ضرورت ہے۔ فن تعمیر، نجّاری پیمائش اور ریلوے کے تمام کاموں میں علم ہندسہ کی ضرورت ہے۔ تمام دستکاریوں کا دار و مدار علم جر ثقیل پر ہے۔ علم الحرارت۔ علم مناظرہ و مرایا۔ علم برق۔ علم مقناطیس۔ اور علم کیمیا کے حیرت انگیز کرشمے طرح طرح کی صنعت و حرفت میں مدد دیتے ہیں۔ علم ہیأت۔ علم طبقات الارض۔ علم الحیواة۔ علم المعاشرت کو بھی صنعت و حرفت سے بہت کچھ تعلق ہے۔ غرض کہ ہر ایک کام اور پیشہ میں سائنس کی واقفیت نہایت ضروری ہے۔ اور روز بروز اُس کی ضرورت بڑھتی جاتی ہے۔ اِس لیے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ سائنس کی کافی تعلیم مدارس کے نصاب میں ضرور داخل ہونی چاہیئے۔

تعلیم کی تیسری شاخ "تربیت اولاد" پر بحث کرتے ہوئے یہ دکھایا ہے کہ والدین عموماً اولاد کی تربیت کے اُصول سے بالکل ناواقف اور غافل ہیں۔ اِس ناواقفیت اور غفلت سے جو خوفناک اور مضر نتائج آیندہ نسلوں کی جسمانی۔ عقلی اور اخلاقی حالت پر مترتّب ہوتے ہیں۔ اُن کو نہایت موثر اور درد انگیز الفاظ میں بیان کیا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ بچوں کی قسمت کا بنانا یا بگاڑنا بہت کچھ والدین ہی کے اختیار میں ہے۔ آخر میں یہ بتایا ہے والدین کو فزیالوجی (علم الاعضاء) اور سائی کالوجی (علم النفس) سے تھوڑی بہت واقفیت ضرور ہونی چاہیئے۔

تعلیم کی چوتھی شاخ یعنی فرائض تمدّن کے ضمن میں علم تاریخ پر مفصّل بحث کی ہے اور یہ دکھایا ہے کہ جو تاریخیں مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔ وہ عموماً بے کار اور فضول واقعات سے پر ہوتی ہیں۔ جن کے پڑھنے سے بچوں کو فرائض

تمدن کے ادا کرنے میں کسی قسم کی ہدایت حاصل نہیں ہوتی - اس کے بعد یہ بتایا ہے
کہ تاریخ کی کتابوں میں کس کس قسم کے واقعات درج ہونے چاہئیں - اور پھر یہ ثابت
کیا ہے کہ سائنس کے بغیر علم تاریخ محض بے کار ہے - اور تاریخ کی کنجی
سائنس ہے -

تعلیم کی سب سے آخری شاخ یعنی مشاغل تفریح - جن میں مصوّری
موسیقی - شاعری وغیرہ داخل ہیں - اُن کو باقاعدہ حاصل کرنے کے لیے
بھی سائنس کی سخت ضرورت ہے - اس بحث کو تفصیل کے ساتھ مدلّل بیان کیا ہے
اور اس کی توضیح کے لیے مثالیں بھی دی ہیں - شاعری کی بحث میں مصنف نے
ایک نہایت عمدہ اور صحیح خیال ظاہر کیا ہے - جو عام اذہان سے بالاتر ہے کہ
"سائنس بجائے خود شاعری ہے" اور اپنے دعویٰ کا نہایت عمدہ
اور دلچسپ ثبوت دیا ہے -

تعلیم کی پانچوں شاخوں پر بالتفصیل بحث کرنے کے بعد مصنّف نے ایک
نہایت ہی ضروری مضمون پر قلم اُٹھایا ہے - یعنی "زبان اور سائنس کا مقابلہ"
اس مقابلہ میں سائنس کی تعلیم کو زبان کی تعلیم پر نہایت قوی دلائل
کے ساتھ ہر ایک اعتبار سے فوقیت دی ہے - اور ثابت
کر دیا ہے کہ سائنس کی تعلیم قوت حافظہ اور قوت فیصلہ دونوں کو ترقی دیتی ہے - اس سے
عقلی اور اخلاقی تعلیم بلکہ مذہبی تعلیم بھی حاصل ہوتی ہے - سائنس کی مذہبی حیثیت
پر خاص کر بہت عمدہ بحث کی ہے - اور یہ بات بخوبی ثابت کی ہے کہ سائنس بے دینی
کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ سائنس سے غفلت کرنی بے دینی ہے - سائنس اس امر کو
تسلیم کرتا ہے کہ علّت العلل کی حقیقت کا ادراک انسانی عقل بلکہ خیال و قیاس سے بھی
برتر ہے - یہ بحث خاص کر آج کل کے نئے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے مفید اور قابل غور ہے -

اِن تمام مباحث کے بعد باب اوّل کے خاتمہ میں اُس سوال کا جواب دیا ہے
جو اس باب کے عنوان پر درج ہے۔ یعنی کون سا علم سب سے زیادہ قیمتی ہے؟
اور وہ جواب یہ ہے کہ "سائنس ہی سب سے زیادہ قیمتی علم ہے"۔
زندگی کے پانچوں مشاغل کے لیے سائنس نہایت ضروری ہے۔ یہاں تک کہ
عقلی و اخلاقی و مذہبی تعلیم کے لیے بھی سب سے زیادہ قیمتی علم سائنس ہی ہے۔
اور تہذیب و تمدّن کا وجود ہی سائنس کی بدولت ہے۔

باب دوم کا خلاصہ | باب دوم میں عقلی تعلیم سے بحث کی گئی ہے تمہید میں یہ بیان کیا
گیا ہے کہ ہر ایک زمانہ کا طریقۂ تعلیم و تادیب اُس زمانہ کی معاشرت
کے موافق ہوتا ہے۔ جس زمانہ میں بادشاہ مطلق العنان ہوتے تھے اور
عام طور پر خود مختاری کا دور دورہ تھا۔ اور خفیف جرموں پر سخت سزائیں ملتی تھیں۔ اُس
زمانے میں مدارس کی تادیب بھی ویسی ہی سخت ہوتی تھی۔ مگر آج کل جس طرح بادشاہوں
کے اختیارات محدود اور رعایا کی آزادی زیادہ ہو گئی ہے۔ اسی طرح معلّموں
کے اختیارات بھی کم ہو گیے ہیں۔ اور بچوں کی تعلیم و تربیت میں سخت گیری
کم ہونے لگی ہے۔

اس کے بعد یہ بحث کی ہے کہ یہ جو آج کل تعلیم کے بہت سے جدید طریقے
پیدا ہو گیے ہیں۔ اور ہر شخص اپنے طریقہ کی حمایت اور دوسرے طریقوں کی مذمّت
کرتا ہے۔ یہ بات درحقیقت مفید ہے۔ کیونکہ ہر ایک طریقہ میں جتنی غلطی ہے
وہ بحث و مباحثے کے بعد رفتہ رفتہ دور ہو جائے گی۔ اور جتنی خوبی ہے وہ عام طور
پر تسلیم کر لی جائے گی۔ اور آخر کار ایک صحیح اور کامل طریقہ تعلیم پر سب کا اتفاق
ہو جائے گا۔

مصنّف نے اس کے بعد ایک عام قاعدہ بیان کیا ہے کہ ایک

غلطی کے دور ہو جانیکے بعد دوسری متضاد غلطی کو کچھ عرصہ تک عروج حاصل ہو جاتا ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ صرف جسم کی پرورش میں لوگ ہمہ تن مصروف اور عقلی تربیت سے غافل رہتے تھے۔ پھر وہ زمانہ آیا کہ لوگوں نے جسمانی تربیت سے غفلت کرکے صرف عقلی تربیت کو اپنا مقصد قرار دیا۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ لوگ ان دونوں متضاد طریقوں کو جو افراط و تفریط سے خالی نہیں ہیں۔ سمجھنے اور جسم اور نفس دونوں کی غور و پرداخت کرنے لگے ہیں۔

اس بحث کے بعد تعلیم کے قدیم اور جدید طریقوں کا باہم موازنہ کرکے جدید طریقہ کی فوقیت بمفصل طور پر ظاہر کی ہے۔ اور قوت مشاہدہ کو باقاعدہ ترقی دینے کی عظمت و ضرورت ثابت کرکے یہ نتیجہ نکالا ہے۔ کہ ہر ایک علم و ہنر میں ترقی حاصل کرنے کے لیے کامل مشاہدہ نہایت ضروری اور کامیابی کا جزو اعظم ہے۔ اسی ضمن میں ملک سوئٹزرلینڈ کے ایک مشہور شخص پسٹالوزی کے مجوزہ طریقہ تعلیم کی تنقید اور اوس کے حسن و قبح پر مفصل بحث کی ہے۔ بعد ازاں عقلی تعلیم کے سات اصول لکھے ہیں جن کے موافق بچوں کی تعلیم و تربیت ہونی لازم ہے۔

اس کے بعد یہ بتایا ہے کہ تعلیم زمانۂ شیرخواری ہی سے شروع ہو جانی چاہیئے۔ مثلاً رنگ۔ روشنی اور آواز کی مختلف قسموں سے شیرخوار بچوں کو واقفیت پیدا کرانا۔ جب بچہ کسی قدر بڑا ہو جائے تو اسی سلسلہ میں اوس کو اسباق الاشیاء کی تعلیم دینی چاہیئے۔ اس تعلیم کے طریقہ اور فوائد پر مفصل بحث کرکے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہی سبق تمام آیندہ علم کی بنیاد ہیں۔ یہی تعلیم بچہ کو سائنس کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

اسباق الاشیاء کے بعد مصوری کی تعلیم اور اوس کی ضرورت کا بیان

ہے۔ اور مصوری کی تعلیم کا طریقہ اور اُس کے فوائد بتا کر مصوری کے مروّجہ طریقہ تعلیم کی خرابیاں دکھائی ہیں۔ اس کے بعد ہندسۂ عملی اور ہندسۂ عقلی کی تعلیم اور اُن کے فوائد پر شرح و بسط کے ساتھ بحث کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی علم ہندسہ کو بچوں کے لیے دل کش بنانے کا طریقہ بھی بیان کیا ہے۔

آخر میں تعلیم کے دو ضروری اُصول۔ جن پر عموماً بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔ بیان کیے ہیں۔ یعنی

اوّل ۔ طریقہ تعلیم ایسا ہونا چاہیے۔ جس سے نفس کی تربیت خود بخود ہو سکے اور معلم یا والدین کی مدد کی ضرورت بہت کم ہو۔

دوم ۔ تعلیم سے بچوں کو خوشی حاصل ہو۔ اور تحصیل علم اُن کے لیے ناگوار نہ ہو۔

اس کے بعد ان اصولوں کی عظمت و منفعت پر نہایت تفصیل اور خوبی کے ساتھ بحث کر کے باب دوم کو ختم کیا ہے۔

باب سوم کا خلاصہ

باب سوم میں اخلاقی تعلیم کا بیان ہے۔ اوّل یہ بحث اُٹھائی ہے کہ مدارس کے نصاب تعلیم کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اخلاقی تعلیم اُس میں داخل نہیں کی گئی۔ اور اخلاقی تعلیم کی خرابی کو والدین اور خاص کر ماؤں کی غفلت یا ناواقفیت سے منسوب کیا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے بچوں کو کبھی کچھ حکم دیتے ہیں۔ اور کبھی کچھ۔ بچوں کو اس بات کا پتہ نہیں لگتا کہ ہم کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہ کرنا چاہیے۔ اسکے بعد یہ بیان کیا ہے کہ والدین کی طبیعت کی اصلاح ہوتے ہوتے ہوگی۔ کیونکہ کسی معاملہ کی اصلاح یک لخت نہیں ہو سکتی۔ ترقی ہمیشہ آہستہ آہستہ اور بتدریج ہوا کرتی ہے۔ بعد ازاں بچوں کے ساتھ والدین کے عام برتاؤ اور اُن کی سخت گیری کی چند مثالیں

دے کر یہ بات ثابت کی ہے کہ جب تک والدین کا اخلاق عمدہ نہ ہو۔ اولاد سے نیک اخلاقی کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔ اس کے ساتھ ہی اس مسئلہ پر بحث کی ہے کہ "آباؤ اجداد کے خصائل اُن کی اولاد کو وراثۃً پہنچتے ہیں"۔ اخلاقی تعلیم قوم کی عام خصلت اور انسانی فطرت کی عام حالت کے موافق ہوتی ہے سخت آدمیوں کے ساتھ سخت اور نرم آدمیوں کے ساتھ نرم برتاؤ کیا جاتا ہے اکھڑ اور ناشائستہ لوگوں کو اُن کے قصوروں پر سخت اور بھاری سزائیں اور نرم اور شائستہ لوگوں کو نرم اور خفیف سزائیں دی جاتی ہیں۔ جب قوم عام طور پر اکھڑ اور درشت مزاج ہوتی ہے۔ تو بچوں کی طینت بھی اسی قسم کی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی تعلیم و تربیت میں زیادہ سختی کی ضرورت پڑتی ہے۔ برعکس اس کے جوں جوں قوم کے عادات و خصائل شائستہ اور معقول ہوتے جاتے ہیں۔ بچوں کی تعلیم و تربیت میں بھی اسی نسبت سے نرمی برتی جاتی ہے۔

اِن تمہیدی بیانات کے بعد اصل مقصد کی طرف رجوع کی ہے۔ اور یہ دکھایا ہے کہ قدرت بچہ کو کیونکر تربیت کرتی ہے۔ والدین کو بھی اس طریقہ کی پیروی لازم ہے۔ یعنی بچوں کو اُن کے قصوروں پر قدرتی سزائیں دینی چاہئیں نہ کہ مصنوعی۔ قدرتی سزاؤں کی خصوصیتوں پر مفصل بحث کی ہے۔

اس کے بعد تربیت اخلاق کے قدرتی طریقہ کی چند عام فہم مثالیں دی ہیں۔ اور قدرتی اور مصنوعی سزاؤں کا فرق اچھی طرح سمجھایا ہے۔ بعد ازاں قدرتی طریقہ تربیت کے چار فائدے بیان کرکے اس امر کا فیصلہ کر دیا ہے۔ کہ بچوں کا قصور خفیف ہو تو۔ اور سخت ہو تو۔ دونوں صورتوں میں ہمیشہ قدرتی طریقہ پر کاربند رہنا چاہیئے۔ آخر میں بچوں کے ساتھ سختی

کرنے کے مفید نتائج بیان کیئے ہیں - اور اس بارہ میں سے جان لاک وغیرہ کی رائیں لکھی ہیں - اور اخلاقی تربیت کے متعلق آٹھ نصیحتیں لکھ کر اس باب کو ختم کیا ہے - یہ نصیحتیں گویا تمام باب کا خلاصہ اور عملی ہدایتوں کا مجموعہ ہیں -

باب چہارم کا خلاصہ

باب چہارم میں تعلیم جسمانی سے بحث کی گئی ہے - اس مضمون کی تمہید اس طرح اٹھائی گئی ہے کہ ہر طبقہ کے لوگ حیوانات کی پرورش اور اُن کی نسل بڑھانے کا بہت کچھ شوق رکھتے ہیں - مگر اپنے بچوں کی پرورش اور اُن کے رکھ رکھاؤ کی طرف سے عموماً غافل ہیں - پھر جسمانی تربیت کی ضرورت جتا کر یہ بحث کی گئی ہے کہ اس کا انتظام سائنس کے مسلمہ حقائق کے موافق ہونا چاہیئے - اس کے بعد پُرخوری اور کم خوری کے عیوب بیان کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ کم خوری بہ نسبت پُرخوری کے - زیادہ مضر ہے - بچوں پر کھانے پینے کی روک ٹوک ہرگز نہیں کرنی چاہیئے - بلکہ اس معاملہ کو اُن کی طبیعت پر چھوڑ دینا چاہیئے - تاکہ وہ اچھی طرح سیر ہو کر کھانا کھائیں - کیونکہ اشتہا ہی انسان اور حیوان دونوں کے لیئے عمدہ رہبر ہے -

اس کے بعد یہ بحث کی ہے کہ مقوّی اور غیر مقوی خوراک کا اثر حیوانات پر کیا ہوتا ہے - اس کی بہت سی مثالیں دی ہیں - اور اس بحث سے حسب ذیل نتائج نکالے ہیں :-

اوّل - بچوں کی خوراک - عمدہ - مقوی - اور زود ہضم ہونی چاہیئے -

دوم - خوراک اول بدل کر دینی چاہیئے - اور دسترخوان پر کئی طرح کی چیزیں ہونی چاہئیں -

سوم - خوراک بہت کافی ہونی چاہیئے -

خوراک کے بعد لباس پر بحث کی ہے - اور بچوں کو ناکافی لباس پہنانے کے نقصانات بیان کر کے لباس کی بابت یہ چار ہدائتیں لکھی ہیں:-

(۱) لباس نہ تو اس قدر زیادہ ہونا چاہیئے کہ بدن میں شدید حرارت پیدا ہو جائے اور نہ اس قدر کم کہ سردی معلوم ہو -

(۲) لباس مہین کپڑے کا نہیں ہونا چاہیئے - بلکہ دبیز کپڑے کا ہونا چاہیئے -

(۳) مضبوط ہونا چاہیئے کہ نہ زیادہ گھسے اور نہ زیادہ پھٹے -

(۴) رنگ پکا ہونا چاہیئے کہ جلد نہ اُڑ جائے -

لباس کے بعد ورزش کی بحث شروع کی ہے - اس میں اول یہ بتایا ہے کہ لڑکوں کی ورزش پر تو لوگ توجہ کرنے بھی لگے ہیں - مگر لڑکیوں کی ورزش سے اب تک غافل ہیں - اس کے بعد اُن اعتراضات کو رفع کیا ہے جو لڑکیوں کی ورزش پر عموماً کیے جاتے ہیں - اسی ضمن میں کھیل کود کے فائدے اور جمناسٹک کے نقصانات بیان کر کے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اگر "کھیل کود کے ساتھ کسی قدر جمناسٹک کی جائے تو وہ مفید ہو سکتی ہے - مگر کھیل کود کو ترک کر کے جمناسٹک پر ورزش کا دارومدار رکھنا مضر ہے"

اس کے بعد ایک نہایت ضروری سوال اُٹھایا ہے کہ "نئی تانتی" کی طاقت اور اُس کا اُٹھان "روبہ تنزل ہے" اس کے متعدد اسباب بیان کیے ہیں - مگر خاص سبب "دماغی محنت کی کثرت" قرار دیا ہے - یہ امر تمام اہل ملک اور خاص کر اُن لوگوں کے لیے قابل غور ہے - جو یونیورسٹی کی تعلیم کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھ لیتے ہیں - اور سب کام چھوڑ کر اُسی کے پیچھے پڑ جاتے ہیں -

اس کے بعد مصنف نے کثرت مطالعہ کے مضر نتائج - جو جسم اور

صحت پر مترتب ہوتے ہیں - نہایت خوبی اور تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں -
اور بہت سی چشم دید مثالوں - مدارس کے دستور العملوں اور نیز اپنے ذاتی
تجربہ سے اس بیان کو مدلل کیا ہے - اسی ضمن میں طوطے کی طرح حفظ یاد
کر لینے کے پانچ نقصان نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کر کے یہ لکھا
ہے کہ یہ جابرانہ طریقہ تعلیم بہ نسبت مردوں کے عورتوں کے حق میں زیادہ مضر ہے
جس کی وجہ سے تعلیم یافتہ عورتیں عموماً زردرو اور بدشکل ہو جاتی ہیں - اور
اُن کا اُٹھان باقاعدہ نہیں ہوتا - اسی بحث میں یہ بات جتا دی ہے کہ
مرد - عورتوں کی علمی لیاقت پر گرویدہ نہیں ہوتے - بلکہ زیادہ تر اُن کے جسمانی حسن
اور اخلاق قابلیتوں پر مائل ہوتے ہیں - اس لیے عورتوں کو اس قدر عقلی تعلیم
دینا جس سے اُن کے نمو اور صحت کو نقصان پہنچے سخت غلطی ہے - اعلیٰ
تعلیم ضرور ایک عمدہ شے ہے - بشرطیکہ اس سے کوئی جسمانی
نقص پیدا نہ ہو -

آخر میں بتایا ہے کہ بچوں کی جسمانی تربیت میں عموماً چار نقص
پائے جاتے ہیں یعنی :-

اوّل - بچوں کو ناکافی خوراک دی جاتی ہے -

دوم - ناکافی لباس پہنایا جاتا ہے -

سوم - ناکافی ورزش کرائی جاتی ہے (کم از کم لڑکیوں سے)

چہارم - عقلی محنت بہت زیادہ لی جاتی ہے -

اس باب کے خاتمہ پر یہ ہدایت کی ہے کہ صحت کا قائم رکھنا
انسان کا فرض ہے - اور قوانین صحت کی تمام خلاف ورزیاں
جسمانی گناہ ہیں -

کا کسی قدر حال بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً

(۱) ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کی عموماً دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ لفظی رعایت قایم رہے۔ اور لفظ کے مقابلہ میں لفظ رکھ دیا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ لفظی رعایت کو نظر انداز کرکے صرف اس بات کا التزام کیا جائے کہ مصنف کا خیال اپنی عبارت میں ادا ہو جائے۔ اگر پہلے اُصول کی پوری پابندی کی جائے تو ترجمہ بامحاورہ اور عام فہم نہیں ہو سکتا۔ خاص کر عالمانہ اور فلسفیانہ تصانیف کا ترجمہ تو بالکل مُغلق اور چیستاں بن جاتا ہے۔ لیکن اگر دوسرے اُصول کو اختیار کیا جائے۔ تو مصنف کا مطلب بہت کچھ صاف اور واضح ہو سکتا ہے اور اُس کے سمجھنے میں چنداں دقت باقی نہیں رہتی۔ مگر اس صورت میں ایسے ترجمہ پر مشکل ہی سے ترجمہ کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ کیونکہ وہ ایک قسم کی تالیف ہو جاتی ہے۔ چوں کہ "انجمن ترقی اُردو" کا یہ مقصد تھا کہ "ایجوکیشن" کا ترجمہ کیا جائے۔ نہ یہ کہ اُس کے مطلب کو اپنی عبارت میں ادا کیا جائے۔ اِس سبب میں نے اِس ترجمہ میں بین بین طریقہ اختیار کیا ہے۔ یعنی لفظی رعایت کو حتی الامکان ہاتھ سے نہیں دیا۔ اور ساتھ ہی اِس بات کی کوشش کی ہے کہ عبارت اردو روزمرہ کے خلاف نہ ہو۔

(۲) ترجمہ میں کہیں کہیں انگریزی اسلوب بیان کو قصداً قایم رکھا ہے۔ تاکہ اُردو زبان میں عالمانہ اور فلسفیانہ خیالات کے ادا کرنے کی قوت اور وسعت پیدا ہو۔ اِس مقصد کے پورا کرنے کے لیے اپنی طرف سے الفاظ کے اضافہ کی ضرورت محسوس ہوئی ہے جن کو عموماً خطوط وحدانی میں لکھ دیا ہے۔

(۳) اگرچہ ترجمہ میں اتنا وانہ تصرف نہیں کیا اور لفظی رعایت کو تا بمقدور ہاتھ سے نہیں

دیا - تاہم محض زبان کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ ترجمہ بقول بعض اہل الرائے کے عام طور پر بجائے خود ایک اصل تصنیف معلوم ہوتی ہے اور بادی النظر میں یہ خیال پیدا نہیں ہوتا کہ یہ کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے -

(۴) نہ صرف مصنّف کے خیالات کو با محاورہ اُردو میں ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے بلکہ حتی الامکان اُس کی طرز تحریر اور زور قلم کو بھی قایم رکھا گیا ہے - اگرچہ اس امر کا پورا پورا التزام مترجم کی قدرت سے باہر تھا - مگر پروفیسر مولوی محمد اقبال صاحب ایم - اے کا یہ خیال کہ "اس ترجمہ میں ہربرٹ سپنسر کی جھلک نظر آجاتی ہے" ظاہر کرتا ہے کہ مترجم کو اس مقصد میں ایک حد تک کامیابی ہوئی ہے -

(۵) اصل کتاب میں مختلف علوم و فنون کی سینکڑوں اصطلاحیں اور ہزاروں الفاظ ایسے آئے ہیں جن سے اس ملک کے انگریزی دانوں کے کان عموماً نا آشنا ہیں اور اُردو میں اُن کے لیے مناسب الفاظ موجود نہیں ہیں - اس لیے ایسے الفاظ و مصطلحات کا سمجھنا اور پھر اُن کے لیے عربی فارسی کے موزوں الفاظ تلاش یا وضع کرنا مترجم کے لیے ایک بہت مشکل کام تھا - مگر خدائے تعالےٰ کے فضل و کرم سے یہ دقّت رفع ہو گئی - اور انگریزی الفاظ اس ترجمہ میں اس قدر کم ہیں کہ گویا نہ ہونے کے برابر ہیں - ان میں سے اکثر انگریزی الفاظ تو پہلے ہی سے اردو میں عام طور پر مستعمل ہیں - ان کے علاوہ چند گنتی کے انگریزی لفظ ہیں جو ضرورۃً استعمال کرنے پڑے ہیں - مگر ایسے تمام الفاظ کی مفصل تشریح ذیلی حاشیوں (فٹ نوٹوں) میں جا بجا کر دی گئی ہے - ترجمہ شروع کرنے سے پہلے مصنّف کا دیباچہ پڑھ کر معلوم ہوا تھا کہ "ایجوکیشن" کا ترجمہ عربی میں ہو چکا ہے - مگر باوجود تلاش کے عربی ترجمہ دستیاب نہ ہو سکا - اگر یہ ترجمہ بہم پہنچ جاتا تو مجھے اُردو ترجمہ کرنے میں کسی قدر سہولت ہوتی - اور اکثر اصطلاحات کے لیے بہتر الفاظ مل جاتے -

(۶)۔ اصل کتاب میں ہر باب کا مضمون مسلسل چلا جاتا ہے۔ اور اُس کی تقسیم نہیں کی گئی۔ ترجمہ میں یہ بات مناسب خیال کی گئی کہ ہر فقرہ (پیرے) کے شروع میں ایک حاشیہ کی سرخی (مارجنل نوٹ) بطور خلاصہ مضمون قائم کر دی جائے۔ تاکہ ناظرین کو مطالب کے سمجھنے اور ذہن نشین رکھنے میں مدد ملے۔ اور ایک نظر ڈالنے سے مضمون کا نقشہ دل میں اُتر آئے۔ ان سرخیوں کے قایم کرنے میں جن کی تعداد دو سو پچاس کے قریب ہے مترجم کو بہت کچھ محنت اُٹھانی پڑی ہے۔ اُمید ہے کہ ان کی وجہ سے ناظرین کو مطالعہ کتاب کے وقت فہم مطالب میں پوری مدد ملے گی۔

(۷) حاشیہ کی سرخیوں کے علاوہ جابجا ذیلی حاشیے (فٹ نوٹ) دئے گئے ہیں۔ جن میں اکثر تاریخی نوٹ ہیں۔ یعنی جن مشہور اشخاص کا نام کتاب میں آیا ہے۔ اُن کا مختصر سا حال لکھ دیا گیا ہے۔ اور بعض حاشیوں میں مطالب متن کی تشریح کی گئی ہے مصنف کے نوٹ اصل کتاب میں تین چار ہی ہیں۔ ان نوٹوں کے سوا باقی نوٹ مترجم نے اپنی طرف سے اضافہ کیے ہیں۔

(۸) ترجمہ کے شروع میں ایک مفصل اور مسلسل فہرست مضامین اضافہ کی گئی ہے۔ ایسی فہرست اصل کتاب میں نہیں ہے۔ بلکہ اُس کے آخر میں ایک انڈکس (فہرست مضامین بہ ترتیب حروف تہجی) ہے۔ اس انڈکس کا ترجمہ اُردو میں بے کار تھا۔ جدید انڈکس تیار کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ یہی فہرست جو ترجمہ میں اضافہ کی گئی کافی ہے۔

(۹) کسی کتاب کے پڑھتے وقت مصنف کے حالات معلوم کرنے کی خواہش قدرتی طور پر دل میں پیدا ہوتی ہے۔ ناظرین کے اس اشتیاق کو پورا کرنے کے لیے مصنف کا تذکرہ بھی ترجمہ کے ساتھ لگا دیا گیا ہے۔ یہ تذکرہ مختلف اخبارات و رسائل کے مطالعہ کے بعد ترتیب دیا گیا ہے۔ جس میں ہربرٹ سپنسر کی تعلیم

تربیت۔ اُس کی تصنیفات۔ انشا پردازی۔ علمی لیاقت۔ عادات
وخصائل وغیرہ کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اب تک اُردو زبان میں ہربرٹ سپنسر
کے حالات اس قدر تفصیل کے ساتھ قلم بند نہیں ہوئے۔

مترجم کی خاص مشکلات یوں تو ایک زبان سے دوسری زبان میں مطالب خیز ترجمہ کرنا کوئی
آسان کام نہیں ہے۔ مگر علمی وفلسفی اور خاص کر ہربرٹ سپنسر جیسے شخص کی تصانیف
کا ترجمہ کرنا سخت مصیبت ہے۔ اس موقع پر چند خاص خاص دقتوں کا
ذکر کیا جاتا ہے۔

(ا) ہربرٹ سپنسر کا علم نہایت وسیع۔ اس کی عام واقفیت غیر محدود۔ اور خیالات
نہایت گہرے ہیں۔ جب وہ کسی مضمون پر قلم اٹھاتا ہے۔ تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ
اُس کے دل میں خیالات کا ایک دریا اُمڈا چلا آتا ہے۔ اور پڑھنے والا اُس
دریا کی رَو کے ساتھ ساتھ بہتا چلا جاتا ہے۔ اُس کے فلسفیانہ مطالب کے سمجھنے
کے لیے نہایت غوص اور تعمق کی ضرورت ہے۔ اور اکثر حالتوں میں بغیر کامل غور و
خوض کے اُس کے ایک جملہ کا ترجمہ بھی محال ہوتا ہے۔ یہی دقت "ایجوکیشن" کے
ترجمہ میں شروع سے لے کر آخر تک پیش آئی ہے۔

(ب) اگرچہ اس کتاب کا مقصد "تعلیم" ہے۔ اور اس میں فلسفۂ تعلیم سے بحث
کی گئی ہے۔ تاہم اس میں بہت سے علوم وفنون کا ذکر ضمناً آگیا ہے۔ مثلاً
علم النفس[1]۔ علم الحیواۃ[2]۔ علم الحیوانات[3]۔ علم الاعضاء[4]۔ علم المعاشرت[5]
علم اللسان[6]۔ علم ہندسہ[7]۔ علم ہیئت[8]۔ علم مناظرہ ومرایا[9]۔ علم جر ثقیل[10] علم طبیعی[11]
علم کیمیا[12]۔ علم طب[13]۔ علم تشریح الابدان[14]۔ علم الٰہیات[15]۔ علم اقتصاد[16]۔
فن انجینیری[17]۔ فن مصوری[18]۔ فن بت تراشی[19]۔ فن موسیقی[20]۔ فن شاعری[21]
فن فصاحت وبلاغت[22]۔ فلسفۂ تاریخ[23]۔ فلسفۂ حسن[24]۔ فلسفۂ اخلاق[25]

فلسفۂ سیاست۔

ان علوم و فنون کی اصطلاحیں جابجا اس کتاب میں آئی ہیں۔ اور بعض علوم و فنون
کے مسائل مجمل طور پر بیان ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پوری کامیابی کے ساتھ
اس کا ترجمہ وہی شخص کر سکتا ہے۔ جو علوم و فنون مذکورۂ بالا میں ید طولےٰ رکھتا ہو۔
یا کم از کم ترجمہ کرنے سے پہلے اصل کتاب کے مطالب پر پوری طرح عبور حاصل
کرے۔ مترجم کو ان جملہ علوم و فنون کی پوری واقفیت تو کجا ابتدائی واقفیت کا
بھی دعویٰ نہیں ہے۔ البتہ اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ کہ مطالب
کو اچھی طرح سمجھ کر کتاب کا ترجمہ جتی الامکان صاف اور بامحاورہ اردو
میں کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ترجمہ میں لفظ لفظ پر دقت کا سامنا
تھا۔ اور جن صاحبوں کو انگریزی کی فلسفیانہ کتابوں کے ترجمہ کا تجربہ ہے۔ وہ
اس بات کو ضرور تسلیم کریں گے کہ لبا اوقات ایک ہی جملہ کا ترجمہ کرنے۔ اردو میں
ایک علمی اور سنجیدہ طرز بیان پیدا کرنے۔ اور انگریزی کو اردو کے قالب میں ڈھالنے
کے لیے کئی کئی گھنٹے لگ گئے ہیں۔ بلکہ ایک مناسب اور موزوں لفظ کی
تلاش میں بعض اوقات کئی کئی دن گزر گیے ہیں۔

(ج) ترجمہ میں بہت سی ایسی صورتیں پیش آتی ہیں۔ جہاں لفظ کی جگہ لفظ رکھنے
سے کام نہیں چل سکتا۔ بلکہ ایک لفظ کا مطلب ایک مرکب ناقص یا ایک جملہ
میں ادا کرنا پڑتا ہے۔ اور جب ایک لفظ کا مفہوم کئی کئی لفظوں میں ادا ہو۔ تو عبارت
کی سلاست اور مضمون کی روانی میں سخت خلل واقع ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے
اس لیے نشست الفاظ اور اردو روزمرہ کا خیال رکھنا۔ تنافر کلمات
سے بچنا۔ اور ایسے معترضہ جملوں سے پرہیز کرنا۔ جو فہم مطالب میں مخل ہوں
نہایت سخت اور دقت طلب کام ہے۔ ہربرٹ سپنسر کی تصانیف

کے ترجمہ میں یہ دقت خاص کر پیش آتی ہے۔

رسم خط اور کتابت کی خصوصیتیں

یہ کتاب خاص اہتمام کے ساتھ چھپوائی گئی ہے۔ اور رسم خط اور کتابت میں بہت سی باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے مثلاً:-

(۱) سررشتۂ تعلیم پنجاب کی ابتدائی تعلیمی کتابوں کے موافق یائے معروف (ی) یائے مجہول (ے) ہائے مخلوط (ھ) - نون غنہ وغیرہ کی پوری پابندی کی گئی ہے اور صحت کا بھی پورا خیال رکھا گیا ہے۔

(۲) ہر لفظ کو علیحدہ علیحدہ لکھا گیا ہے۔ مثلاً "اُس کو" "نہ کرنا" "کرنے کے لیئے" "اُس کے لیے" لکھا ہے "اُسکو" "نکرنا" "کرنیکیلئے" "اُسکیلئے" نہیں لکھا۔

(۳) جملہ اعلام یعنی خاص اشخاص یا خاص مقامات کے نام جلی قلم سے لکھے گئے ہیں۔ اِس کے علاوہ جو الفاظ اور جملے مترجم کی رائے میں خاص طور پر قابل غور تھے اُن کو بھی جلی قلم سے لکھا ہے۔ حاشیہ کی سرخیوں اور ذیلی حاشیوں کو متن کی نسبت خفی قلم سے لکھا ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس متن میں جہاں مصنف نے دیگر اشخاص کی رائیں نقل کی ہیں۔ اُن کو بھی خفی قلم سے۔ اور دونوں طرف جدول سے کسی قدر ہٹا کر لکھا ہے۔ بعض جگہ عربی الفاظ کی تحریر میں خط نسخ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اِس اختلاف تحریر کی وجہ سے مطالب کتاب پر عبور حاصل کرنے اور اُن کو ذہن نشین کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ یکساں تحریر کی وجہ سے پڑھنے والے کی طبیعت اُکتا جاتی ہے۔ اصل کتاب میں یہ خصوصیت نہیں ہے اُس کا خط تین چار مقاموں کے سوا بالکل یکساں چلا آتا ہے۔

(۴) اصل کتاب کی طرح ترجمہ میں بھی رموز اوقاف (پنکچوایشن) کی پوری پابندی کی گئی ہے۔ اور پورے وقفہ۔ تھوڑے وقفہ۔ سوال۔ تعجب۔ ندا مقولہ وغیرہ کی علامتوں کا احتیاط کے ساتھ۔ لحاظ رکھا گیا ہے۔ تاکہ عام عبارت

اور خاص کر طویل جملوں کے پڑھنے اور سمجھنے میں بہت کچھ سہولت ہو۔

شکریہ "ایجوکیشن" میں چند لاطینی اور فرانسیسی عبارتیں آئی ہیں۔ پروفیسر ٹی۔ ڈبلیو آرنالڈ صاحب۔ ایم۔ اے۔ سابق پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور (حال مقیم انگلستان) نے میری استدعا پر اُن عبارتوں کا انگریزی میں ترجمہ کر دیا تھا۔ جس سے میں نے اُن کا اُردو ترجمہ کیا ہے۔ پروفیسر صاحب موصوف کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں شمس العلماء جناب مولانا خواجہ الطاف حسین صاحب حالی کا شکریہ ادا کرنا بھی میرا فرض ہے۔ جنھوں نے اپنا بیش قیمت وقت صرف کر کے اس ترجمہ کے بعض حصّوں پر نظر ثانی کی تکلیف گوارا کی۔ اور بعض مناسب الفاظ و مصطلحات کے بہم پہنچانے میں مجھے نہایت قیمتی مدد دی۔ ناشکری ہوگی۔ اگر اس موقع پر مولوی سید ممتاز علی صاحب۔ مالک رفاہ عام سٹیم پریس۔ و اڈیٹر اخبار "تالیف و اشاعت" لاہور کا شکریہ نہ ادا کیا جائے۔ جن کے حسنِ انتظام سے یہ ترجمہ اس قدر خوبی کے ساتھ چھپ کر تیار ہوا۔[1]

معذرت میں نے اس کتاب کے ترجمہ میں اپنی طرف سے کوشش و محنت کا کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ مگر کوئی انسان سہو و نسیان سے خالی نہیں ہو سکتا اور میں تو خود ہی اپنی زبان دانی اور علم و فہم کے قصور کا معترف ہوں۔ حتی الامکان بھی کوشش کی گئی ہے۔ کہ مصنّف کے خیالات کو سنجیدگی اور صفائی کے ساتھ بامحاورہ اور برعایت الفاظ اُردو زبان میں ادا کیا جائے۔ مجھے اُمید ہے کہ ناظرین اس ترجمہ پر رائے قایم کرتے وقت اِن اُمور کو ضرور مدنظر رکھیں گے۔ کہ "ایجوکیشن" اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے جو اُردو میں ترجمہ ہوئی ہے۔ یہ کوئی معمولی کتاب نہیں۔ بلکہ ایک ایسے شخص کے دل و دماغ کا نتیجہ ہے جو زمانہ میں اپنا مثل نہیں رکھتا تھا۔ اس کے مطالب کو دوسری زبان میں ادا کرنا۔ یا ترجمہ کرنا تو ایک

[1] یہ پہلا اڈیشن اس کتاب کا ان کے اہتمام سے طبع ہوا تھا۔

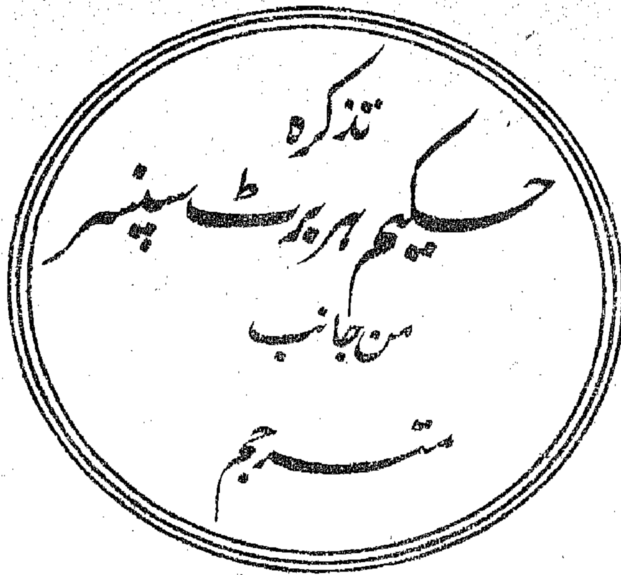
حرف رہا۔ اُن کا سمجھنا ہی سخت مشکل ہے۔ یہ کتاب اکثر علوم وفنون کے اصطلاحات ومسائل سے پُر ہے۔ اس قسم کے ترجمہ کا کوئی پہلا نمونہ میرے پیش نظر نہ تھا۔ اُردو زبان میں بحالت موجودہ ایسے دقیق اور فلسفیانہ مطالب کے ادا کرنے کی قابلیت بہت کم ہے۔ علمی اصطلاحات کا کوئی لغت بھی اُردو میں موجود نہیں ہے۔ جس سے ترجمہ میں سہولت ہوتی۔

آخر میں ناظرین باتمکین کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ اس ترجمہ میں جہاں کہیں کوئی سقم نظر آئے ازراہ کرم مترجم کو اُس سے مطلع فرمائیں۔ اس قسم کی تمام صلاحیں یا اصلاحیں شکرگزاری کے ساتھ قبول کی جائیں گی۔ اور طبع ثانی میں ضروری ترمیم کی جائے گی۔

خاکسار

مترجم





ولادت اور ابتدائی تعلیم ہربرٹ سپنسر ۲۷- اپریل سنہ ۱۸۲۰ء کو بمقام ڈربی واقع انگلستان پیدا ہوا اس کا باپ ڈربی میں مدرس ریاضی اور انجمن فلسفہ کا سکرٹری تھا۔ اور چچا پادری تھا- اول باپ کی نگرانی میں اور پھر ایک پرائیویٹ اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی- چچا کو اُس کی تعلیم و تربیت کا بہت خیال تھا- اور اپنے فرائض منصبی ادا کرنے کے بعد جو کچھ وقت ملتا- اُس کو اپنے بھتیجے کی تعلیم و تربیت میں صرف کرتا تھا- ہربرٹ سپنسر کو بچپن ہی سے سائنس کا شوق تھا- زبانوں اور صرف و نحو کی طرف اُس کو رغبت نہ تھی- خوش قسمتی سے اُس کو ایک سمجھدار باپ ملا تھا جس نے اپنے لڑکے کو اُس کے قدرتی میلان کے خلاف صرف و نحو وغیرہ پڑھنے پر کبھی مجبور نہیں کیا بلکہ اُس کو اُس کی رائے پر چھوڑ دیا- کہ جو چاہے سو پڑھے -

یونیورسٹی کی تعلیم سے مستفید نہ ہوتا اور انجنیری کا پیشہ اختیار کرنا اس وقت یونیورسٹی کے نصاب میں السنۂ قدیمہ یعنی یونانی- لاطینی وغیرہ کی تعلیم

لازمی قرار دی گئی تھی - اس لیے یونی ورسٹی کی تعلیم پا کر ڈگری حاصل کرنا ہربرٹ سپنسر کے
لیے ایک امر محال تھا - اب اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اس کو کسی کام میں
لگایا جائے - اس زمانہ میں غالباً صرف انجینئری ایسا پیشہ تھا جس میں ایسے اشخاص
جو السنہ قدیمہ کی تعلیم حاصل کرنا نہ چاہیں - داخل ہو سکتے تھے - غرض ہربرٹ سپنسر کو
سر چارلس فاکس کے پاس ریلوے انجینئر کا کام سیکھنے کے لیے بھیجا گیا اور وہ
۱۸۳۷ء میں ۱۷ سال کی عمر میں سول انجینئر بن گیا - نوجوان انجینئر نے آٹھ سال تک
اس پیشہ کو جاری رکھا - اور اس اثنا میں انجینئری کے ایک رسالہ میں مضامین بھی لکھتا
رہا - مگر ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات انجینئری جیسے محدود پیشہ میں اس کا
دل نہ لگا اور ۱۸۴۵ء میں انجینئری چھوڑ کر علمی مشاغل میں مصروف ہو گیا -

عہدہ انجینئری سے دست برداری اور علمی مشاغل میں مصروفیت

۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۳ء تک رسالہ اکانومسٹ کا اسسٹنٹ ایڈیٹر رہا اور لندن میں مستقل
سکونت اختیار کر کے رسالہ ویسٹ منسٹر ریویو میں کثرت سے مضامین لکھنے شروع
کیے - یوں تو ابتدا ہی سے اس کو تصنیف و تالیف کا شوق تھا - مگر اس زمانہ میں جبکہ وہ
انجینئر تھا - عام لٹریچر کے میدان میں - اس نے طبیعت کی جولانی کا ثبوت اس طرح دیا کہ ۱۸۴۲ء
میں رسالہ نان کنفارمسٹ میں ایک سلسلہ مضامین لکھنا شروع کیا جس کا عنوان تھا
”گورنمنٹ کی حد مناسب“ یہ مضامین پسند کیے گئے اور اگلے سال کتاب کی شکل میں طبع کیے
گئے - ان مضامین میں ملکی طور معاشرتی امور سے بحث کی گئی ہے - اور ان میں اس خیال
کی جھلک پائی جاتی ہے - جس نے رفتہ رفتہ ارتقا کی شکل اختیار کی جو آخرکار ہربرٹ سپنسر
کی شہرت کا باعث ہوا -

۱۸۵۵ء میں یعنی ڈارون کی کتاب آریجن آف سپیشیز (انواع کی اصلیت)
کے چھپنے سے چار سال پہلے - اس نے اپنی کتاب پرنسپلز آف سائی کالوجی

(اصول علم النفس) چھپوائی - اُس کی تیاری مین اُس نے اس قدر محنت اُٹھائی کہ صرف ۱۸ مہینے میں اُس کو پورا کر دیا جس سے اُس کی صحت نہایت خراب ہوگئی - وہ تقریباً دو سال تک سخت بیمار رہا - اور اس عرصہ میں تصنیف و تالیف کا کام بالکل معطل رہا۔ ۱۸۵۵ء سے ۱۸۵۹ء تک اُس نے مختلف اخباروں اور رسالوں میں مضامین لکھے -

ہربرٹ سپنسر کی زبردست اور عالمانہ تصنیف سسٹم آف سنتھیٹک فلاسفی

۱۸۶۰ء میں سسٹم آف سنتھیٹک فلاسفی (نظام فلسفہ ترکیبی) کے نام سے اُس نے ایک نہایت ضخیم کتاب لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا - اور اُس کے مضامین کا ایک خاکہ کھینچ کر بطور ایک اشتہار کے شایع کیا - اس کتاب کے مختلف حصے وقتاً فوقتاً چھپ کر شایع ہوتے رہے - اس کے بعد یہ تمام مجموعہ حسب ذیل دس ضخیم جلدوں میں چھاپا گیا -

(۱) فسٹ پرنسپلز .. .. .. (اصول اولیہ) .. .. ایک جلد
(۲) پرنسپلز آف بیالوجی .. .. .. (اصول علم الحیات) .. .. دو جلد
(۳) پرنسپلز آف سائی کالوجی .. .. (اصول علم النفس) .. .. دو جلد
(۴) پرنسپلز آف سوشی آلوجی .. .. (اصول علم المعاشرت) .. .. تین جلد
(۵) پرنسپلز آف ایتھکس .. .. (اصول علم الاخلاق) .. .. دو جلد

ہربرٹ سپنسر اس کتاب کی تکمیل میں بڑی دلیری اور صبر و استقلال کے ساتھ مصروف رہا اور اگرچہ اس عرصہ میں اُس کی صحت اچھی نہیں رہی اور اُس کو طرح طرح کی مشکلات اور مایوسیوں کا مقابلہ کرنا پڑا - مگر ہمت مرداں مدد خدا کے آخرکار ۱۸۹۶ء میں ۳۶ سال کی محنت شاقہ کے بعد اُس کو پورا کیا - یہ وہ کتاب ہے جس نے اُس کا نام تمام علمی دنیا میں مشہور کر دیا اور اُس کی بے نظیر علمی لیاقت اور خداداد قابلیت کا سکہ بٹھا دیا -

تصانیف پر ایک اجمالی نظر

کتب مذکورہ بالا کے علاوہ اس نے فلسفہ - سائنس - اور ملکی معاملات میں بہت سی کتابیں - رسالے اور مضامین لکھے

ہیں۔ ان میں شاید سب سے زیادہ عام پسند اور مقبول کتاب "ایجوکیشن" (تعلیم) ہے۔ اس میں عقلی و اخلاقی و جسمانی تعلیم پر نہایت قابلیت اور عالمانہ طریقہ سے بحث کر کے یہ بات ثابت کی ہے کہ اصلی و حقیقی تعلیم وہی ہے جو نفس کو خود بخود نشو و نما پانے اور ترقی حاصل کرنے میں مدد دے۔ اور یہ بتایا ہے کہ ہر قسم کی تعلیم میں ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ آسان سے مشکل تک مبہم سے معین تک۔ مادیات سے تجردات تک۔ عملی سے عقلی تک بتدریج ترقی ہو۔ انگریزی زبان میں اس مضمون پر اس سے بہتر کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔ اس کی خوبی اور عام مقبولیت کا اندازہ صرف اس امر سے ہو سکتا ہے کہ ۱۸۹۹ء تک دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے ۱۶ ترجمے شایع ہو چکے ہیں یہاں تک کہ سنسکرت۔ یونانی۔ چینی اور جاپانی زبانوں میں بھی اس کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ اردو زبان اس وقت تک محروم تھی۔ مگر اب "انجمن اردو" کی سرپرستی سے اس زبان میں بھی اس کا ترجمہ ہو گیا ہے۔

ہربرٹ سپنسر نے کس قسم کی تعلیم پائی تھی اور انشا پردازی میں اُس کا کیا مرتبہ ہے؟

ہربرٹ سپنسر کی جسمانی صحت اچھی نہیں تھی اور جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا۔ اس کے باپ نے کبھی اُس پر لکھنے پڑھنے کا دباؤ نہیں ڈالا۔ وہ کھیتوں اور میدانوں میں سیر و تفریح کے لیے نکل جایا کرتا تھا۔ بچپن میں اُس کو کیڑے پکڑنے اور پودے جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ اس کا قول ہے کہ بچوں کو تعلیم دینے اور علم کا شوق دلانے کے لیے قدرتی طریقہ یہی ہے۔ جو کھیل کا کھیل ہے۔ اور تعلیم کی تعلیم۔ اس مضمون کو نہایت خوبی کے ساتھ اُس نے اپنی کتاب ایجوکیشن میں لکھا ہے۔ غرض ہربرٹ سپنسر نے بچپن ہی سے تقریباً سائنس ہی کی تعلیم پائی تھی۔ اگرچہ اُس نے رسمی علوم یعنی السنہ قدیمہ اور صرف و نحو کی تعلیم نہیں پائی تھی۔ یہاں تک کہ یونانی زبان کا ایک حرف تک نہیں جانتا تھا۔ مگر اُس نے حیوانات و نباتات و جمادات اور

اجرام سماوی وغیرہ موجودات قدرت کا علم حاصل کیا تھا۔ اکثر اشخاص ان رسمی علوم کی تعلیم پر اس وجہ سے زور دیتے ہیں کہ اُن سے اپنی مادری زبان کے صحیح استعمال میں مدد ملتی ہے۔ یہ دلیل کس قدر سبک اور کم وزن ہے! باوجودیکہ ہربرٹ سپنسر نے رسمی تعلیم حاصل نہیں کی۔ تاہم وہ نہایت صحت و درستی اور فصاحت و بلاغت کے ساتھ انگریزی لکھتا ہے۔ نئے الفاظ حسب ضرورت بڑی خوبی کے ساتھ گھڑ لیتا ہے۔ اپنے خیالات کو نہایت آزادانہ اور موثر طریقہ میں ظاہر کرتا ہے اور زمانہ حال کا کوئی مصنف انشاپردازی میں اُس سے سبقت نہیں لے گیا۔

زبانوں کی تعلیم کے متعلق ہربرٹ سپنسر کی رائے

ہربرٹ سپنسر کے نزدیک ضرورت سے زیادہ زبانوں کی تعلیم محض تضیع اوقات۔ اور اصلی و حقیقی علم کے حاصل کرنے میں سدراہ ہے۔ اُس کا قول ہے کہ بچوں کو مختلف زبانیں سکھانے کا جو دستور ہو گیا۔ اُس کی بنیاد صرف نام و نمود پر ہے۔ کسی فائدہ پر۔ جس طرح وحشی باشندے اپنے بدن کو رنگ لیتے ہیں۔ جس سے بجز نمود کے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اسی طرح لڑکوں اور لڑکیوں کو مختلف زبانیں سکھانے کا اصل منشا یہ ہے کہ لوگوں کی نظروں میں اُن کی قدر و منزلت ہو۔ اُس نے زبان اور سائنس کی تعلیم کا مقابلہ کر کے دکھا دیا ہے کہ سائنس کی تعلیم ہر ایک اعتبار سے زبان کی تعلیم پر فوقیت رکھتی ہے۔

ملکی معاملات میں ہربرٹ سپنسر کی رائے

ملکی معاملات میں ہربرٹ سپنسر کی رائے نہایت آزاد تھی۔ حال میں جو لڑائی سرکار انگریزی اور قوم بوئر کے درمیان بمقام ٹرانسوال واقع جنوبی افریقہ پیش آئی تھی اور کئی سال تک جاری رہی تھی۔ وہ اس لڑائی کا سخت مخالف تھا۔ اُس نے اہل جاپان کو صلاح دی تھی کہ اگر تم لوگ بچنا چاہتے ہو تو اہل یورپ سے الگ رہو ورنہ اپنی آزادی کھو بیٹھو گے۔

اُس کی کتاب "سوشیل سٹیٹکس"، پولیٹیکل فلاسفی (فلسفہ سیاست) میں مشہور کتاب ہے اور بعض یونی ورسٹیوں میں داخل درس ہے۔ مگر انگلستان میں اُس کی رائے کی عموماً مخالفت کی گئی تھی۔

مذہب کے متعلق اُس کی رائے

مذہب کے متعلق اُس کی یہ رائے نہایت منصفانہ اور قابل وقعت ہے کہ سائینس اور مذہب ایک دوسرے کے مخالف نہیں بلکہ ممد و معاون ہیں۔ اُس کا قول ہے کہ سائینس اُن توہمات کا دشمن ہے۔ جو مذہب کے نام سے مشہور ہیں۔ نہ کہ اصلی و حقیقی مذہب کا۔ جس کو یہ توہمات محض پوشیدہ کر دیتے ہیں۔ یہ خیال باطل ہے کہ سائنس لامذہبی کی تعلیم دیتا ہے لامذہبی کی تعلیم دینا تو ایک طرف سائنس سے غفلت کرنی بے دینی ہے۔ اُس نے صاف صاف اقرار کیا ہے کہ غایت العلل (خدائے تعالےٰ) کی ماہیت کا سمجھنا نہ صرف عقل انسانی بلکہ خیال و قیاس سے بھی بالاتر ہے۔ سائنس ایک خاص حد تک ہماری رہنمائی کر سکتا ہے۔ جس کے آگے کا حال ہم مطلق معلوم نہیں کر سکتے۔ اس مضمون پر ہربرٹ سپنسر نے اپنی کتاب ایجوکیشن میں بڑی خوبی کے ساتھ بحث کی ہے۔ یہ اُس شخص کی رائے ہے جس نے تمام عمر سائینس اور فلسفہ کے مطالعہ میں گزار دی ہے۔ اور جو اپنے زمانہ کا سب سے بڑھ کر فلسفی ہوا ہے۔ جو لوگ سائنس کی ابجد پڑھ کر ہمہ دانی کا دعوےٰ کرنے لگتے ہیں۔ اور رازہائے سربستہ کی گرہ اپنے ناخن تدبیر سے کھولنا چاہتے ہیں۔ یا الٰہی اسرار کے عقدہ کو اپنی ناقص اور محدود عقل کے ذریعہ سے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو ہربرٹ سپنسر کی رائے سے ہدایت حاصل کرنی چاہئے۔

تصانیف کی ناقدری و مالی نقصانات میں ہربرٹ سپنسر کی مستقل مزاجی

ہربرٹ سپنسر کی اس قدر تصنیفات کا حال معلوم کر کے شاید کوئی شخص یہ نتیجہ نکالے

کہ اُس نے اپنی کتابوں سے لاکھوں روپیہ پیدا کیا ہوگا۔ مگر درحقیقت یہ بات نہیں ہے
جس طرح علمی تصانیف کی زمانہ میں عموماً ناقدری ہوا کرتی ہے اسی طرح انگلستان میں
بھی ایک عرصہ دراز تک اُس کی کتابوں کی قدر نہیں کی گئی۔ نفع تو درکنار کتابوں کی فروخت
سے لاگت بھی وصول نہیں ہوتی تھی۔ اس موقع پر اُسکی تصانیف کی ناقدری کا حال
بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ۱۸۵۰ء میں اُس نے اپنی پہلی کتاب سوشل سٹیٹکس
چھپوانے کا ارادہ کیا۔ تو اُس کو کوئی ایسا شخص نہ مل سکا جو اُس کی اشاعت کی
جھکھوں میں پڑے۔ اس لیے مجبوراً اپنے خرچ سے چھپوا کر اُس کو کمیشن پر فروخت کے
لیے دے دیا۔ اس کتاب کی صرف سات سو پچاس جلدیں طبع ہوئی تھیں۔ جن کے
فروخت ہونے میں چودہ سال سے کم صرف نہیں ہوئے۔ پانچ سال کے بعد اُس نے
پرنسپلز آف سائی کالوجی (اصول علم النفس) چھپوائی۔ اس کے چھاپنے کے لیے
بھی کسی کتب فروش یا مالک مطبع نے حامی نہ بھری۔ اس لیے اس کتاب کی اشاعت
بھی کمیشن پر کرائی گئی۔ اسکی بھی سات سو پچاس جلدیں طبع ہوئی تھیں۔ مگر اُن کو بھی فروخت
ہوتے ہوتے ایک مدت لگ گئی۔ چنانچہ ہربرٹ سپنسر افسوس کے ساتھ لکھتا ہے
کہ "میں نے بہت سی جلدیں تو مفت بانٹ دیں۔ اور باقی ماندہ کتابیں ساڑھے بارہ
سال میں فروخت ہوئیں"

اِن واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ اِن دونوں مشہور و معروف اور قابل قدر
کتابوں سے اُس کو مطلق نفع نہیں ہوا۔ نفع تو درکنار اُس کا سارا سرمایہ اِن کتابوں
میں صرف ہوگیا۔ اور وہ سچ مچ محتاج ہوگیا۔ اسی طرح اپنا "مجموعہ مضامین" اور
"کتاب تعلیم" چھپوا کر اور چند سال بعد اُس کو بخوبی تجربہ ہوگیا۔ کہ فلسفیانہ تصانیف
سونے کی چڑیا یا جواہرات کی کان نہیں ہیں۔ چنانچہ اُس نے لکھا ہے کہ "میں نے
اپنی تمام کتابوں سے نقصان ہی نقصان اُٹھایا ہے"

سنہ ۱۸۶۰ء میں جب اُس نے "سسٹم آف سنتھیٹک فلاسفی" (نظام فلسفہ ترکیبی) کے عنوان سے اپنی سب سے زیادہ ضخیم اور مشہور و معروف کتاب چھپوانے کا ارادہ کیا۔ تو اور بھی زیادہ آفت کا سامنا تھا۔ مصنف کے پاس اُس کی اشاعت کے لیے روپیہ نہ تھا۔ وہ پہلے ہی اپنا سرمایہ پبلک کی ناقدری کی نذر کر چکا تھا۔ اور کوئی صاحب مطبع یا کتب فروش ایسا مل نہیں سکتا تھا جو اتنی بڑی کتاب کے چھپوانے کا بیڑا اُٹھا سکے اور اپنے روپیہ کو خطرہ میں ڈالے۔ خاص کر ایسی حالت میں جب کہ ہربرٹ سپنسر کی کتابوں کی پہلے ہی بہت کچھ ناقدری ہو رہی تھی۔ اس لیے اُس نے یہ ترکیب نکالی کہ اُس کتاب کے کچھ خریدار پیدا کیے۔ اور اُس کے حصے سہ ماہی رسالوں کی شکل میں چھاپنے شروع کیے۔ ہربرٹ سپنسر کہتا ہے کہ "جب اس کتاب کی پہلی جلد فسٹ پرنسپلز (اصول اولیہ) قریب الختم تھی تو میں نے دیکھا کہ مجھے نقصان ہوا ہے۔ دوسری جلد پرنسپلز آف بیالوجی (اصول علم الحیات) کی اشاعت کے زمانہ میں بھی مجھ کو نقصان رہا۔ اسی طرح تیسری جلد کی اشاعت کے درمیان میں نقصان رہا۔ یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ میرا تمام اثاثہ برباد ہو رہا ہے۔ اُس وقت میں نے اپنے حساب کتاب کی جانچ پڑتال کی تو معلوم ہوا کہ میں نے پندرہ سال کے عرصہ میں تخمیناً بارہ سو پونڈ یعنی اٹھارہ ہزار روپیہ برباد کیا ہے۔ اور اگر اس میں سود بھی شامل کیا جائے تو بارہ سو پونڈ سے بھی زیادہ ہوگا۔ چونکہ میں کنگال ہوتا چلا جاتا تھا۔ اس لیے میں نے خریداروں کو باقی ماندہ کتاب کی اشاعت بند کرنے کا اشتہار دے دیا"۔ مگر عین تنگی کے وقت اُس کو ایک ترکہ مل گیا۔ جس کی وجہ سے کام برابر چلتا رہا۔ پہلے بھی دو دفعہ اُس نے کتابوں کی اشاعت بند کر دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ مگر ع

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

حسن اتفاق سے دونوں دفعہ ایسی ہی مدد اُس کو مل گئی - اس لیے اُس کا کام رُکنے نہیں پایا - کوئی اور شخص ہوتا تو ایسے بے سود سودے میں کبھی اپنا روپیہ برباد نہ کرتا اور ایک دفعہ نقصان اُٹھا کر آیندہ کے لیے اُس کو کان ہو جاتے مگر ہربرٹ سپنسر ہی کا حوصلہ تھا کہ باوجود متواتر ناکامی اور ناامیدی کے ہمت نہ ہاری - تاہم اِس بات کے معلوم ہونے سے کسی قدر تسلی ہوتی ہے کہ انجام کار اُس کو اپنی محنت کا کچھ نہ کچھ معاوضہ مل گیا - جب سے اُس نے اپنی تصانیف کا سلسلہ جاری کیا تھا اُس سے چوبیس [۲۴] سال بعد نفع نقصان برابر ہوا - تجارت پیشہ آدمی ذرا اس معاملہ پر غور کریں کہ چوبیس [۲۴] سال تک ایک شخص دماغی محنت کرے - اور اپنا ہزار ہا روپیہ برباد کرے - پھر بھی اُس کو کچھ معاوضہ نہ ملے - اور معاوضہ ملے تو یہ ملے کہ اُس کی جو حالت ابتدا میں تھی چوبیس [۲۴] سال کے بعد بھی وہی حالت برقرار رہے! اِس میں شک نہیں کہ اس وقت سے ہربرٹ سپنسر کو اپنی کتابوں سے آہستہ آہستہ خاصی آمدنی ہونے لگی تھی مگر غور کرو ایسے شخص کی جرأت وہمت اور صبر واستقلال پر جو باوجود مفلسی اور تنگدستی کے اسقدر مالی نقصانات برداشت کرے!

یہ تو ابتدائی زمانہ کا ذکر تھا - مگر آخر زمانہ میں بھی اُس کو کچھ زیادہ فائدہ نہیں ہوا - چنانچہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اُس نے اپنی کتاب سوشیولاجیکل ٹیبلز کی تیاری میں دو ہزار نوسو اٹھاون پونڈ یعنی چوالیس ہزار تین سو ستر روپے صرف کیے جس کی نسبت اُس نے بطور مزاح کے یہ کہا تھا کہ "اگر میری عمر سو برس سے زیادہ ہو تو بھی جو روپیہ میرے ہاتھ سے نکل گیا ہے مجھے اُس کے واپس ملنے کی کوئی توقع نہیں ہے"

اس کے فلسفہ اور علمی لیاقت پر ایک سرسری نظر

یہ کہنا کچھ بے جا نہ ہوگا کہ ہربرٹ سپنسر نے فلسفہ کی کایا پلٹ دی ہے - اُس نے قدیم طریقہ کو چھوڑ کر تحقیقات

اور استدلال کا ایک جداگانہ اور نیا طریقہ نکالا ہے۔ جس نے علمی دنیا کے خیالات میں ایک سخت تلاطم اور حیرت انگیز انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ ڈارون نے صرف انواع کی اصلیت کی بنیاد قانون ارتقا پر رکھی ہے مگر ہربرٹ سپنسر نے یہ قانون تمام کائنات کے لیے عام قرار دیا ہے۔ ڈارون نے صرف نباتات اور حیوانات کی انواع کی اصلیت پر محض ان کی جسمانی ساخت اور افعال اعضاء کے اعتبار سے اپنی توجہ مبذول کی تھی۔ مگر ہربرٹ سپنسر نے یہ تعلیم دی ہے کہ قانون ارتقا کا عمل موجوات عالم کی ہر ایک شے پر۔ عام اس سے کہ وہ ذی روح ہو یا غیر ذی روح۔ مادی ہو یا غیر مادی۔ حاوی ہے اور حیوانات و نباتات وجمادات سے لے کر نفس ناطقہ اور انسانی خیالات سب اس قانون کے تابع ہیں۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ڈارون کی کتاب آریجن آف سپیشیز (انواع کی اصلیت) کے طبع ہونے سے پہلے مسئلہ ارتقا کا خیال ہربرٹ سپنسر کے ذہن میں آ چکا تھا۔ اس لیے یہ خیال غلط ہے کہ ہربرٹ سپنسر اس مسئلہ میں ڈارون کا شاگرد ہے۔ ان کا باہمی تعلق استاد و شاگرد جیسا نہیں ہے بلکہ وہ ایک دوسرے کے ہم سر ہیں۔ انیسویں صدی عیسوی اور خاص کر اس کا پچھلا نصف حصہ علم کی ترقی اور علمی کوشش کا زمانہ تھا اور لوگوں نے خیالی اور ہوائی باتوں کو چھوڑ کر عملی اور حقیقی علم کی طرف توجہ شروع کر دی تھی۔ اس لیے زمانہ کو ایسے معلم کی ضرورت تھی جو حال کی علمی تحقیقات کے نتائج کے موافق فلسفہ پر نظر ثانی کر کے اس کو نئے سانچے میں ڈھال دے۔ یہ شخص ہربرٹ سپنسر تھا۔ ممکن ہے کہ وہ بعض اعلیٰ مسائل پر آخری فیصلہ کرنے سے قاصر رہا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان مسائل کا جو حل اس نے پیش کیا ہے وہ ناکافی ہو اور جو نتائج اس نے نکالے ہیں ناقابل اطمینان ہوں۔ مگر اس کے

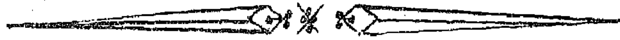
ساتھ ہی یہ بات ضرور تسلیم کرنی پڑے گی کہ اُس نے علم کے تمام پراگندہ ذخیرہ کو باقاعدہ مرتب کرنے کی ایک نرالی کوشش کی ہے۔ اور بہت سے بحث طلب مضامین پر بالکل نئی روشنی ڈال دی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے۔ کہ روشنی کا ایک دریا بہا دیا ہے۔ ایک حکیم کا قول ہے کہ "آج تک جس قدر علم دنیا نے حاصل کیا ہے۔ اُس کو ہربرٹ سپنسر نے اپنے دماغ میں مرتب رکھنے کے بعد کتابیں لکھی ہیں" ایک اور مصنف کہتا ہے کہ اگر افلاطون اِس وقت زندہ ہوتا اور پچھلے بائیس سو برس کی علمی ترقی سے واقف ہوتا تو وہ بھی ہربرٹ سپنسر سے بہتر نہیں لکھ سکتا تھا"

عادات وخصائل ہربرٹ سپنسر۔ نڈر اور مستقل مزاج آدمی تھا؟ اُس نے مفلسی کے مصائب کو جواں مردی اور صبر کے ساتھ برداشت کیا جس کام کا بیڑا اُٹھایا تھا اُس کے پورا کرنے میں تمام عمر مصروف رہا۔ اور محنت کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اگرچہ اُس کی محنت کی داد جیسی کہ چاہیئے نہیں ملی۔ تاہم وہ علمی تصانیف میں برابر مصروف رہا۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ کتابیں لکھنے سے اُس کا مقصد لوگوں کو فائدہ پہنچانا تھا نہ کہ روپیہ کمانا۔ اُس کی طبیعت نہایت غیور اور آزاد واقع ہوئی تھی اِس کے دوستوں نے بارہا۔ اُس کی مدد کرنی چاہی۔ مگر اُس نے گوارا نہ کیا۔ برطانیہ کلاں۔ یورپ۔ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں نے متعدد مرتبہ فلسفہ کے اعلیٰ سے اعلیٰ عہدے اُس کے لیے پیش کیے۔ مگر اُس نے اُن کو منظور نہ کیا۔ اور شکریہ کے ساتھ ہمیشہ انکار کرتا رہا۔ اُس نے علم کو علم کی غرض سے حاصل کرنے کا نہایت عمدہ ثبوت دیا۔ اور دوسروں کا دست نگر رہنے کے بجائے اپنے دست وبازو پر بھروسہ کرنے کا عملی نمونہ دنیا کو دکھا دیا۔

وفات ہربرٹ سپنسر اپنی ضعیفی اور بیماری کی وجہ سے پچھلے دس پندرہ سال سے بالکل گوشہ نشین تھا۔ اپریل ۱۹۰۳ء میں اُس کے ہزاروں مداحوں اور

قدردانوں نے اس کی تراسیویں (۸۳) سالگرہ کی خوشی میں ایک جلسہ منعقد کیا اور یہ دعا کی تھی کہ خدا اس کو بہت سے ایسے سال دیکھنے نصیب کرے۔ مگر مشیت الٰہی میں کچھ اور ہی تھا۔ تقریباً سات ماہ کے بعد اس نامور حکیم نے ۸ دسمبر سنہ ۱۹۰۳ء کو تقریباً چوراسی (۸۴) برس کی عمر میں انتقال کیا۔ یہ کہنا کہ ہربرٹ سپنسر اپنے زمانہ کا سب سے بڑا فلسفی اور قدیم زمانہ کے مشہور ترین فلاسفہ کے برابر تھا۔ اُس کی زیادہ تعریف نہیں ہے۔ ہربرٹ سپنسر کے انتقال کی وجہ سے انگلستان سے ایک ایسا آدمی گم ہو گیا جس کی شہرت عالمگیر تھی۔ مگر حقیقت میں اُس کی موت سے نہ صرف انگلستان اور یورپ کو بلکہ بالعموم تمام دنیا کو نقصان پہنچا ہے۔

اہل ہند کے لیے یہ بات قابل فخر ہے کہ ہربرٹ سپنسر کی یادگار قایم کرنے کے لیے سب سے پہلے ایک معزز ہندوستانی نے پندرہ ہزار (۱۵۰۰۰) روپیہ کی معقول رقم دینے کا وعدہ کیا ہے اور اس طرح قدردانی کا فرض ادا کر کے ایک حد تک اپنے ہم وطنوں کو سبک دوش کر دیا ہے۔



تعلیم

١/٦٢
٢٢٩٣

باب اوّل

کونسا علم سب سے زیادہ قیمتی ہے؟

قدامت کے اعتبار سے آرائش - لباس سے مقدم ہے -

یہ مقولہ صحیح ہے کہ قدامت زمانہ کے اعتبار سے آرائش - لباس سے مقدم ہے - جو لوگ بہت کچھ جسمانی تکالیف اس غرض سے اُٹھاتے ہیں کہ اپنے بدن کو سوئی سے گود کر خوب صورت بنائیں - وہ موسم کی سخت سے سخت گرمی سردی کی بھی برداشت کر لیتے ہیں - اور اپنی تکالیف کو رفع کرنے کی کوشش نہیں کرتے - ہمبولٹ[51] صاحب بیان کرتے ہیں - کہ اوری نوکو[52] کے وحشی باشندے جسمانی راحت و آرام کی طرف سے تو بالکل غافل ہیں - مگر وہ دو ہفتہ تک اس غرض سے محنت و مزدوری کرتے ہیں کہ اپنے بدن کو رنگنے کے واسطے رنگ خرید سکیں - تاکہ اُن کو رنگا ہوا دیکھ کر سب لوگ واہ وا کریں -

---

[51] ہمبولٹ جرمنی کا مشہور و معروف فلسفی اور سیاح تھا - ۱۷۶۹ء میں پیدا ہوا - اور ۱۸۵۹ء میں انتقال کیا - مترجم -

[52] اوری نوکو - جنوبی امریکہ کا ایک دریا ہے - اس کا طول سولہ سو میل ہے - کوہستان گائنا سے نکل کر بحر اوقیانوس میں جا گرتا ہے - مترجم -

اور وہی وحشی عورت جو اپنی جھونپڑی سے بالکل برہنہ باہر نکلنے میں کچھ پس و پیش نہیں کرتی اُس کو اتنی جرأت نہیں ہے کہ اپنے بدن کو رنگ لگائے بغیر باہر چلی جائے اور اس بدسلیقگی کے جرم کی مرتکب ہو۔ بحری سفر کرنے والوں کو یہ بات معلوم ہے کہ وحشی قومیں سوتی کپڑے اور بانات کی نسبت رنگین منکوں اور چھوٹے موٹے زیور انگوٹھی چھلّوں وغیرہ کو زیادہ عزیز رکھتی ہیں۔ اس بات کے قصے موجود ہیں۔ کہ جب کبھی اِن وحشیوں کو قمیص یا کوٹ دیئے جاتے ہیں۔ تو وہ اُنکی مضحکہ آمیز نمائش کرتے ہیں۔ اِس سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ آرائش کا خیال فائدہ کے خیال پر کیا کچھ غالب ہے۔ نہیں نہیں! اس سے کہیں بڑھ کر مثالیں موجود ہیں۔ کپتان سپیک[۱] صاحب اپنے افریقی رفقا کا ذکر کرتے ہیں۔ جو مطلع صاف ہونے کے وقت تو بکری کی کھال کے کوٹ پہنے اِدھر اُدھر اکڑتے پھرا کرتے تھے۔ مگر بارش کے وقت اُن کو تہ کر دیتے تھے اور مینھ میں کانپتے ہوئے ننگے پھرا کرتے تھے اوحشی باشندوں کی طرز معاشرت کے واقعات درحقیقت اِس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ زینت و آرائش ہی نے ترقی کرتے کرتے لباس کی شکل اختیار کی ہے۔ اور جب کہ ہم اِس امر کو مدّنظر رکھیں کہ ہم لوگوں میں بھی اکثر آدمی کپڑے کے گرم ہونے کی نسبت اس کے مہین ہونے کا اور بہ نسبت آرام و آسائش کے لباس کی قطع و بریدکا زیادہ لحاظ رکھتے ہیں۔ جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ آجکل کے زمانہ میں بھی زیادہ تر مفاد اصلی پر ظاہری شکل و صورت کو فوقیت دی جاتی ہے۔ تو ہم کو لباس کی اصلیت کا پتہ لگانے کے لیے ایک اور وجہ ہاتھ آجاتی ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ ایسے ہی تعلقات نفس پر صادق آتے ہیں۔ علوم عقلیہ

علوم عقلیہ کی تحصیل میں بھی عام طور پر

[۱] کپتان سپیک۔ انگلستان کا باشندہ تھا۔ براعظم افریقہ میں وہاں کے حالات دریافت کرنے کی غرض سے گیا تھا۔ ۱۸۲۷ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۸۶۴ء میں انتقال کیا۔ مترجم

نمائش کو فائدہ پر ترجیح دی جاتی ہے - اس کی وجہ

کی تحصیل میں بھی جسمانی امور کے مانند آرائش کو فائدہ پر مقدم سمجھا جاتا ہے - قدیم زمانہ ہی پر کیا منحصر ہے - ہمارے اپنے زمانہ میں بھی قریب قریب یہی حالت ہے - جو علم نوع انسان کی بہبودی میں ممد و معاون ہے - اس کو تو اٹھا کر بالائے طاق رکھہ دیتے ہیں - اور جس علم کے حاصل کرنے میں چاروں طرف سے تحسین و آفرین کی صدائیں بلند ہوتی ہیں اس پر توجہ کرتے ہیں - یونان کے مدرسوں میں **موسیقی** - **شاعری** - **فصاحت و بلاغت** - اور **فلسفہ** اعلیٰ درجہ کے مضامین تعلیم سمجھے جاتے تھے اور جب تک **سقراط**[1] نے تعلیم دینی شروع نہیں کی تہی - اس وقت تک اس فلسفہ کو عمل سے کچھہ ایسا تعلق نہ تھا - اور جس علم سے فنون معاشرت (صنعت و حرفت وغیرہ) میں مدد ملتی ہے اس کو بہت کم درجہ پر رکھا گیا تھا - اور موجودہ زمانہ میں ہماری یونیورسٹیوں اور مدرسوں میں بھی یہی خرابی موجود ہے - جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ذیل طالب علموں میں سے نو طالب علم اپنی آیندہ زندگی میں لاطینی اور یونانی زبانوں کی واقفیت کو عملی مقاصد کے لیے استعمال نہیں کرتے - تو ہم ایک کم وزن اور سبک بات کہنے کے مجرم ہیں - یہ قول کہ ہر کسی طالب علم کو دوکانداری - دفتری کاروبار - اپنے خاندان یا جائداد کے انتظام - بینک یا ریلوے کی خدمت منتظمی کو انجام دینے میں - اس علم سے جس کی تحصیل میں اس کے بہت سے سال صرف ہوئے ہیں - بہت ہی کم مدد ملتی ہے - اس قدر کم کہ اس علم کا بہت سا حصہ اس کے صفحۂ دل سے عموماً محو ہو جاتا ہے " اس درجہ عام اور مبتذل ہو گیا ہے کہ اس میں کوئی جدت باقی نہیں رہی اور اگر کوئی شخص گاہے گاہے لاطینی زبان کا کوئی مقولہ استعمال کرتا ہے - یا کسی یونانی افسانہ کا حوالہ دیتا ہے - تو اس سے

[1] سقراط - ملک یونان کا مشہور حکیم ہے - شہر ایتھنز کا رہنے والا تھا - ۴۶۹ قبل مسیح میں پیدا ہوا اور ۳۹۹ قبل مسیح میں انتقال کیا - مترجم -

مضمون زیر بحث کی توضیح بہت کم مقصود ہوتی ہے۔ زیادہ تر مقصد لوگوں پر اثر ڈالنا ہوتا ہے۔ اگر ہم اس بات کو دریافت کریں۔ کہ لڑکوں کو السنۂ قدیمہ کے علوم ادبیہ کی تعلیم دینے کا اصل مدعا کیا ہے تو ہم کو معلوم ہو جائے گا کہ اصل غرض۔ عوام الناس کی رائے کا اتباع ہے۔ لوگ جس طرح عام پسند دستور کے مطابق لباس پہنتے ہیں۔ اسی طرح اپنے بچوں کے قوائے عقلیہ کو عام پسند زیور سے آراستہ کرتے ہیں۔ جس طرح اوری نوکو کا وحشی باشندہ اپنی جھونپڑی سے نکلنے سے پہلے اپنے بدن کو رنگ سے رنگین کر لیتا ہے۔ نہ اس غرض سے کہ رنگ لگانے سے اُس کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے بلکہ اس غرض سے کہ رنگ لگائے بغیر باہر نکلنے سے اُس کو شرم آتی ہے۔ اسی طرح کسی لڑکے کو لاطینی اور یونانی کی تعلیم دینے پر کچھ ان زبانوں کی اصلی اور ذاتی قدر و قیمت کی وجہ سے زور نہیں دیا جاتا۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن سے جاہل رہ کر وہ اپنے اقران و امثال میں ذلیل و حقیر نہ سمجھا جائے۔ یا یوں کہو کہ لاطینی اور یونانی کی تعلیم دینے کا باعث یہ ہے کہ ایک شریف آدمی کے لیے جو تعلیم ضروری سمجھی جاتی ہے وہ تعلیم اُس کو دیجائے تاکہ اس ”تمغائے شرافت“ کے حاصل ہونے سے ہم چشموں میں عزت و توقیر حاصل ہو۔

عورتوں کی تعلیم میں نمائش زیادہ تر مدّ نظر رکھی جاتی ہے

یہ مماثلت عورتوں کی تعلیم میں اور بھی زیادہ صراحت کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے جسمانی اور عقلی دونوں قسم کی تربیت کے لحاظ سے مردوں کی نسبت عورتوں میں آرائش کا عنصر زیادہ تر غالب رہا ہے۔ ابتدا میں جسمانی آرائش پر مردوں اور عورتوں دونوں کی توجہ یکساں مبذول رہتی تھی۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ تہذیب کے اس آخری دور میں مردوں کے لباس میں ظاہری نمائش کا خیال آرام و آسائش کے خیال سے بہت کچھ مغلوب ہو گیا ہے اور اُن کی تعلیم میں بھی تھوڑے عرصہ سے مفید تعلیم نمائشی تعلیم پر غالب آتی جاتی ہے۔ مگر عورتوں کی حالت میں کیا باعتبار جسمانی

تعلیم اور کیا باعتبارِ عقلی تعلیم کے کچھ ایسا فرق ظہور میں نہیں آیا۔ کانوں میں بالیاں۔ ہاتھوں میں انگوٹھی چھلے اور چوڑیاں۔ سر کے بالوں کو بڑے تکلف سے آراستہ کرنا۔ اب بھی گاہے گاہے رنگ کا استعمال کرنا۔ لباس کو کافی طور پر دل کش اور خوش نما بنانے کے لیے بے حد محنت کرنا۔ اور عام دستور اور فیشن کے مطابق چلنے کی خاطر سخت تکلیف اٹھانا ان تمام باتوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کے لباس میں پسندیدگی کی خواہش نے بدن کو گرم رکھنے اور آرام دینے کی خواہش کو۔ جو لباس کی علتِ غائی ہے۔ کالعدم کر دیا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس عورتوں کی تعلیم میں جو تعلیم "ہنر مندی اور خوش سلیقگی" کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔ اُس کو بے حد فوقیت دی گئی ہے۔ اِس سے بھی یہی ثابت ہے کہ نام و نمود کی خواہش فائدہ کے خیال پر غالب آ گئی ہے۔ رقص[1] و سرود۔ باجا بجانا۔ مصوری۔ آدابِ نشست و برخاست۔ اِن فنون کی تعلیم پر کیا کچھ زور دیا جاتا ہے! اگر تم سوال کرو کہ عورتوں کو اٹلی اور جرمنی کی زبانیں کیوں سکھائی جاتی ہیں؟ تو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ خواہ کتنی ہی جھوٹی دلیلیں اِس کی تائید میں پیش کی جائیں۔ اصل وجہ یہی ہے کہ اِن زبانوں کی تعلیم عورتوں کے مناسبِ حال سمجھی جاتی ہے۔ کچھ اِس وجہ سے نہیں کہ اِن زبانوں میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں۔ عورتیں اُن سے فائدہ اُٹھائیں۔ اور شاذ و نادر ہی کوئی عورت فائدہ اٹھاتی ہو گی۔ بلکہ غرضِ اصلی یہ ہے کہ وہ اٹلی اور جرمنی زبانوں کے گیت گائیں اور اُن کی اس تحصیلِ علمی پر حیرت و استعجاب کے ساتھ لوگوں میں باہم سرگوشیاں ہوں۔ بادشاہوں کی ولادت۔ وفات شادی اور اسی طرح دوسرے چھوٹے موٹے تاریخی واقعات کے سنہ و تاریخ اس وجہ سے نہیں یاد کرائے

---

[1] یہ بیان ممالکِ یورپ اور خصوصاً انگلستان کی تعلیم سے متعلق ہے۔ اُن ملکوں میں جب تک کسی عورت کو ناچنا۔ گانا بجانا وغیرہ نہ آئے ملک کی تہذیب کے موافق اس کو ناتربیت یافتہ اور بدسلیقہ سمجھا جاتا ہے[illegible]

جاتے کہ اُن کے علم سے براہ راست کوئی مفاد حاصل ہو سکتا ہے۔ بلکہ اس وجہ سے کہ لوگ اس واقفیت کو عمدہ تعلیم کا جز خیال کرتے ہیں۔ اور اس وجہ سے کہ اگر عورتوں کو اس قسم کی واقفیت نہ ہو تو ممکن ہے کہ دوسرے لوگ اُن کو نظر حقارت سے دیکھیں۔ پڑھنا۔ لکھنا۔ املا۔ صرف و نحو۔ حساب اور سوزن کاری۔ بس یہی قریب قریب کل مضامین ہیں جو کسی لڑکی کو۔ زندگی میں واقعی طور پر کارآمد ہونے کے خیال سے پڑھائے جاتے ہیں۔ ان میں سے بھی بعض مضامین ذاتی مفاد کے خیال سے نہیں بلکہ زیادہ تر اس غرض سے پڑھائے جاتے ہیں۔ کہ دوسرے لوگ ان مضمون کی نسبت اچھی رائے رکھتے ہیں۔

عقلی تعلیم میں نمائش کو مقدم رکھنے کی وجہ

اس حقیقت کو پوری طرح پر سمجھنے کے لیے کہ مثل جسمانی تربیت کے عقلی تربیت میں بھی آرائش فائدہ پر مقدّم ہے۔ ہم کو اُس کے اصول پر ایک نظر ضرور ڈالنی چاہیے۔ یہ اس امر پر مبنی ہے۔ کہ نہایت ہی قدیم زمانہ سے لے کر حال کے زمانہ تک شخصی ضرورتیں مجلسی ضرورتوں کے تابع رہی ہیں۔ اور بڑی مجلسی ضرورت یہ رہی ہے کہ افراد قوم کو اپنے قابو میں رکھے۔ ہم عموماً یہ خیال کرتے ہیں کہ بادشاہ پارلیمنٹ۔ اور باضابطہ حکّام کی حکومت کے سوا اور کوئی حکومت نہیں ہے مگر ایسا نہیں ہے۔ ان مسلّم حکومتوں کے علاوہ دوسری غیر مسلّم حکومتیں بھی ہیں۔ جو تمام گروہوں میں نشوونما پاتی ہیں۔ جن میں ہر زن و مرد۔ بادشاہ یا ملکہ یا رکن سلطنت بننے کی کوشش کرتا ہے۔ بعضوں سے سبقت لے جانا اور اُن سے اپنا ادب کرانا اور اپنے بالا دستوں کو خوشنود رکھنا۔ اس کشمکش و کوشش میں ہر شخص مبتلا ہے۔ اور زندگی کی بڑی قوتیں اسی میں صرف ہوتی ہیں۔ ہر شخص اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ اجتماع دولت۔ طرز معاشرت۔ خوبصورت لباس۔ اور اظہار

علم ودانش کے ذریعہ سے دوسرے لوگوں کو اپنا تابع فرمان بنائے - اور اس طرح حدود وقیود کے اس پھیلے ہوئے جال کے بننے میں مدد دیتا ہے جس سے نظام تمدن قایم ہے - نہ صرف وحشی سردار جنگ کا ہیبت ناک رنگ اپنے بدن کو لگا کر اور کھوپریوں کی کھالیں[ا] اپنی کمر سے لٹکا کر اپنے ماتحتوں پر اپنا رعب بٹھانا چاہتا ہے - نہ صرف حسین عورت اپنے پرتکلف سنگار - شائستہ اطوار - اور بڑی خوش سلیقگی کے ذریعہ سے لوگوں کو "تسخیر کرنے" کی کوشش کرتی ہے - بلکہ عالم مورخ اور فلسفی بھی اپنے اپنے علوم کو اسی غرض سے استعمال کرتے ہیں ہم میں سے کوئی شخص اس بات پر قانع نہیں ہے کہ اپنی شخصیت کو پوری طرح چپ چاپ چاروں طرف پھیلا دے - بلکہ یہ بے چین کرنے والی خواہش لگی رہتی ہے کہ اپنی شخصیت دوسروں سے منوائی جائے اور ایک طرح سے اُن کو اپنا تابع فرمان بنایا جائے - اور یہی وہ بات ہے جو ہماری تعلیم کی نوعیت کا فیصلہ کرتی ہے - اس بات پر غور نہیں کی جاتی کہ "وہ کون سے علم کی اصلی قدر وقیمت سب سے زیادہ ہے"؟ بلکہ اس امر کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ "وہ سب سے زیادہ تعریف اور عزت وتوقیر کس علم کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے"؟ "کون سا علم اقران وامثال میں امتیاز واعتبار حاصل کرنے کے لیے سب سے زیادہ ممد ومعاون ہو سکتا ہے"؟ "وہ کون سا علم لوگوں پر سب سے زیادہ اثر ڈال سکتا ہے"؟ جس طرح عام زندگی میں یہ سوال پیش کیا جاتا ہے کہ "وہ دوسرے لوگوں کی ہماری نسبت کیا رائے ہے"؟ نہ یہ کہ "ہم درحقیقت کیا ہیں"؟ اسی طرح تعلیم میں بھی یہ سوال نہیں ہوتا - کہ "وہ علم کی اصلی اور ذاتی قدر وقیمت کیا ہے"؟ بلکہ زیادہ تر یہی سوال ہوتا ہے کہ "دوسرے لوگوں پر اُس علم کا ظاہری اثر کیا ہوتا ہے"؟ چونکہ یہ

[ا] امریکہ کا وحشی باشندہ جب اپنے حریف پر فتح یاب ہو جاتا ہے تو اُس کی کھوپری کی کھال اُتار کر اپنی کمر سے باندھ لیتا ہے - یہ اِس بات کا نشان ہے کہ اُس نے اپنے دشمن کو مغلوب کر کے قتل کر ڈالا ہے - مترجم -

خیال ہماری طبیعت پر مستولی ہے۔ اس لیے ہم کو علم سے براہ راست فائدہ اٹھانے کا خیال اس وحشی آدمی کی نسبت کچھ زیادہ نہیں ہوتا جو محض آرائش کے خیال سے اپنے دانتوں کو سوہن سے صاف کرتا اور اپنے ناخونوں کو رنگ سے رنگین کرتا ہے

مختلف علوم کی اضافی قیمت کا عام طور پر کوئی معیار مقرر نہیں کیا گیا ہے بلکہ رواج یا تعصب پر اُس کی بنیاد ہے۔

اگر ہماری تعلیم کی ناشائستہ اور غیر ترقی یافتہ روش کی بابت شہادت مزید کی ضرورت ہو تو وہ اس امر پر غور کرنے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ کہ علم کی مختلف قسموں کی اضافی قدر و قیمت پر اب تک شاذونادر ہی بحث کی گئی ہے۔ اور باقاعدہ طور پر تو جس سے یقینی نتائج مستنبط ہوں۔ اور بھی کم بحث کی گئی ہے۔ یہی نہیں کہ علوم کی اضافی قدر و قیمت کے معیار پر ابھی تک عقلا نے اتفاق نہیں کیا۔ بلکہ صاف طور پر کسی ایسے معیار کے وجود کا تصور بھی نہیں کیا گیا۔ اور یہی نہیں کہ ایسے معیار کے وجود کا خیال تک نہیں کیا گیا۔ بلکہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ شاید ہی کبھی اُس کی ضرورت کو محسوس کیا گیا ہو۔ لوگ ایک خاص مضمون کی کتابیں پڑھتے ہیں۔ کسی دوسرے مضمون کے لکچر سنتے ہیں۔ اس بات کا پختہ ارادہ کر لیتے ہیں۔ کہ اپنے بچوں کو علم کی فلاں فلاں شاخوں کی تعلیم دلائیں گے اور فلاں فلاں شاخوں کی تعلیم نہیں دلائیں گے۔ اور ان تمام امور کا تصفیہ محض دستور۔ رغبت۔ یا تعصب کی بنا پر کرتے ہیں۔ اور اس ضروری اور مہتم بالشان امر پر غور نہیں کرتے کہ جو چیزیں درحقیقت سب سے زیادہ سیکھنے کے لائق ہیں ایک معقول طریقہ سے اُن کا تصفیہ کر لیں۔ یہ سچ ہے کہ تمام گروہوں میں ہم کسی نہ کسی علم کی عظمت کی بابت کبھی کبھی ذکر و اذکار سنتے ہیں۔ لیکن جو وقت اُس کی تحصیل میں صرف کیا جاتا ہے۔ آیا اُس کی ضرورت کے درجہ کے لحاظ سے اس قدر وقت صرف کرنا ٹھیک بھی ہے یا نہیں؟ آیا اُس علم سے زیادہ اہم اور ضروری دوسرے علوم جن پر وقت کا صرف کرنا زیادہ تر مفید ہے۔ موجود ہیں یا نہیں؟ یہ ایسے سوال ہیں کہ اگر کبھی ان پر بحث ہوتی بھی ہے تو شخصی پاس داری کے لحاظ سے سرسری طور پر اُن کا تصفیہ کر دیا

جاتا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ ہم کبھی کبھی علوم ادبیہ اور علوم ریاضیہ کی اضافی قدر و قیمت
کی بابت بحث و مباحثہ ہوتے سنتے ہیں۔ مگر یہ مباحثہ اس طرح پر ہوتا ہے کہ لوگ اپنے اپنے
ذاتی تجربہ کے مطابق رائے دیتے ہیں۔ اور تحقیق کے ساتھ کوئی معیار معین نہیں کیا
جاتا۔ اور یہ تنقیح طلب سوال اس عام سوال کے مقابلہ میں جس کا وہ ایک جز ہے بے
حقیقت ہے۔ مناسب نصاب تعلیم کے تصفیہ کے لیے اس امر کا فیصلہ کر لینا
کہ آیا ریاضی کی تعلیم سب سے بہتر ہے یا علم ادب کی۔ ایسا ہی خیال ہے جیسا یہ
فرض کر لینا کہ تمام علم اغذیہ کا حاصل کر لینا اس امر کے معلوم کرنے پر منحصر ہے کہ روٹی بہ نسبت
آلو کے زیادہ مقوی ہے یا نہیں۔

مختلف علوم کی قیمت اضافی قرار دینے کی ضرورت عظمت

امر زیر بحث جو نہایت مہتم بالشان ہے۔ یہ نہیں ہے کہ فلاں علم قابل قدر
ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ اس علم کی اضافی قیمت کیا ہے؟ جب لوگ کسی مقررہ نصاب
تعلیم کے خاص فوائد کو بیان کرتے ہیں۔ جو اُن کو حاصل ہوئے ہیں تو وہ فرض کر لیتے ہیں
کہ ہم نے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ مگر اس بات کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں کہ آیا وہ
فوائد کافی ہیں یا نہیں؟ حالانکہ فیصلہ طلب امر یہی ہے۔ شاید کوئی بھی مضمون ایسا نہ ہو
کہ لوگ اس پر توجہ کریں اور اس سے کچھ نہ کچھ فائدہ حاصل نہ ہو۔ اگر کوئی شخص علم الانساب
و علم الاسلحہ کے حاصل کرنے میں ایک سال تک محنت کرے تو یہ بات بالکل ممکن
ہے کہ اس کو قدیم زمانہ کے اوضاع و اطوار اور آداب و اخلاق میں ذرا زیادہ بصیرت
حاصل ہو جائے۔ اگر کوئی شخص انگلستان کے تمام شہروں کے درمیانی فاصلے یاد
کرے تو ممکن ہے کہ اُن ہزار باتوں میں سے جو اس نے حاصل کی ہیں۔ ایک دو باتیں
مدت العمر میں اس کو کارآمد ہوں۔ جب کہ وہ کہیں سفر کرنے کا ارادہ کرے۔ کسی حصہ ملک
کے تمام ادنیٰ درجہ کے زبان زد خلائق افسانوں کو جمع کرنا اگرچہ ایک بے فائدہ شغل ہے۔
تاہم ممکن ہے کہ یہی شغل کبھی کسی مفید بات کے قائم کرنے میں مدد دے۔ مثلاً قدیم

روایتوں کو نسلاً بعد نسلٍ پہنچانے کی یہ ایک عمدہ مثال ہے - لیکن اِن صورتوں میں ہر شخص تسلیم کرے گا کہ جو محنت ایسے علموں کو حاصل کرنے کے لیے درکار ہے - اُس کو کوئی مناسبت اُس فائدہ سے نہیں ہے جس کے حاصل ہونے کا احتمال ہے - کوئی شخص گوارا نہیں کرے گا کہ بہت زیادہ قیمتی علم کو چھوڑ کر ایک لڑکے کی عمر کے چند سال ایسے علم کے حاصل کرنے میں صرف کیے جائیں جس کو وہ اس قدر مدّت صرف کیے بغیر یوں بھی حاصل کرسکتا تھا - پس اگر اس قسم کے علموں میں اضافی قیمت کے معیار کو مسلم سمجھا جاتا ہے تو پھر تمام علموں کو اسی کسوٹی پر کسنا اور اسی کسوٹی کو قطعی و یقینی قرار دینا چاہیے - اگر ہم کو عمرِ نوحؑ عطا کی جاتی اور جملہ علوم وفنون پر عبور حاصل کرنے کے لیے کافی وقت مل سکتا تو اس بات کا چنداں خیال نہ ہوتا - جیسا کہ ایک قدیم راگ کا مضمون ہے ؎

کسی کو اگلے وقتوں کی طرح گر یہ یقیں ہوتا	کہ ہے دنیا میں جینے کی مجھے صدیوں تلک مہلت
تو وہ کیا کیا کرشمے اپنی دانائی کے دکھلاتا!	اُسے یاں ملتی کیسی کیسی تحقیقات کی فرصت!
نہ کوئی فکر اطمینان میں اُس کے مخل ہوتا	نہ کرنی پڑتی گھبرا کر اُسے ہر کام میں عجلت

مگر ہماری مدّتِ حیات نہایت قلیل ہے اس لیے تحصیل علم کے محدود زمانہ کو ہر دم ذہن نشین رکھنا چاہیے - اور اس بات کو یاد کرکے کہ یہ زمانہ نہ صرف مدّتِ عمر کی کوتاہی - بلکہ زیادہ تر مشاغل دنیاوی کی وجہ سے کس قدر محدود ہے - ہم کو خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے - کہ جو کچھ تھوڑا بہت وقت ہمارے پاس ہے اُس کو اِس طرح کام میں لائیں کہ اُس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھائیں - دانشمندی فی الحقیقت اسی امر کی مقتضی ہے کہ جو علم عام رواج یا مذاق کے موافق ہو - اُس پر چند سال صرف کرنے سے پہلے بڑی احتیاط کے ساتھ اِس بات

سے اصل کتاب میں بھی ایک نظم ہے - اسلئے نظم ہی میں اُس کا ترجمہ کرنا مناسب خیال کیا گیا - یہ ترجمہ علاوہ مطلب خیز ہونے کے ترتیب ترکیب لفظی بھی ہے مترجم -

کا اندازہ کیا جائے اگر وہی زمانہ دیگر علوم کی تحصیل میں صرف کیا جائے تو اس خاص علم کے نتائج بمقابلہ اُن نتائج کے جو دوسرے علوم کی تحصیل سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ کس قدر وقعت رکھتے ہیں؟

پس تعلیم کے تمام سوالوں میں سب سے مہتم بالشان یہی سوال ہے۔ جس پر ذرا باقاعدہ بحث کرنے کا اب موقع ہے۔ بلحاظ اپنی عظمت کے سب سے مقدم مسئلہ اگرچہ غور کرتے وقت اُس کو سب سے پیچھے ڈال دیا جاتا ہے۔ یہ ہے کہ مختلف مضامین جو ہماری توجہ کو اپنی طرف مائل کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کے مختلف دعووں کا فیصلہ کیا جائے یعنی کس کس علم پر کس قدر توجہ کرنی چاہیئے۔ کسی معقول نصاب تعلیم کے مقرر کرنے سے پہلے یہ بات ضرور طے کر لینی چاہیئے۔ کہ کن چیزوں کا جاننا سب سے زیادہ ضروری ہے۔ یا اگر بیکن[1] کا قول استعمال کریں۔ جو بدقسمتی سے اب متروک ہو گیا ہے۔ تو ہم کو "علوم کی اضافی قدر و قیمت" کا تصفیہ کرنا چاہیئے۔

علوم مختلف کی اضافی قیمت کا معیار۔

اس غرض کے حاصل کرنے کے لیے قیمت کا ایک معیار مقرر کرنا نہایت ضروری ہے اور خوش قسمتی سے قیمت کے صحیح معیار کی بابت اگر اُس کو عام عبارت میں ظاہر کیا جائے کسی کو جائے کلام نہیں ہے۔ ہر شخص جب کسی خاص علم کی قدر و قیمت کی بابت بحث کرتا ہی تو زندگی کے کسی حصہ کے ساتھ اُس کا تعلق ظاہر کرتا ہے۔ اِس سوال کے جواب میں کہ "اُس علم سے کیا فائدہ ہے"؟ ریاضی داں۔ زبان داں۔ علم الحیوانات کا عالم اور فلسفی اپنے اپنے علم کا فائدہ بیان کرتے ہیں۔ کہ کس طریقہ سے اُن کا علم عمل پر موثر ہے؟ کس طرح بدی سے بچاتا اور نیکی کی طرف رہنمائی کرتا ہے؟ اور کیوں کر خوشی کا موجب ہوتا ہے؟ جب خوش نویسی کا معلم یہ بات بتاتا ہے کہ خوش نویسی کاروبار میں کامیابی حاصل کرنے میں یعنی روزی کمانے میں۔ یا یوں کہو کہ خاطر خواہ زندگی بسر کرنے میں بڑی مدد دیتی ہے تو وہ اپنے

[1] بیکن۔ انگلستان کا مشہور فلسفی اور مدبر سلطنت تھا۔ ۱۵۶۱ء میں پیدا ہوا اور ۱۶۲۶ء میں انتقال کیا۔ مترجم۔

دعویٰ کو ثابت کر دکھاتا ہے۔ اور جب مردہ واقعات کا جمع کرنے والا (مثلاً قدیم سکوں اور تمغوں سے واقفیت رکھنے والا) اُن معتدبہ نتائج کو جو اُن واقعات سے انسانی بہبودی پر مترتب ہو سکتے ہوں۔ صاف طور پر بیان کرنے سے قاصر رہتا ہے تو بالآخر اُس کو مجبوراً تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اُن چیزوں کا علم نسبتہً بے قدر اور ناکارہ ہے۔ غرض کہ صراحتاً یا کنایتاً سب اسی قطعی و یقینی معیار کی طرف رجوع کرتے ہیں"۔

تعلیم کی علت غائی

ہمارے واسطے بڑا ضروری سوال یہ ہے کہ "زندگی کیوں کر بسر کرنی چاہیئے؟" یہاں "زندگی بسر کرنے" سے صرف جسمانی ضروریات کا پورا کرنا مقصود نہیں ہے۔ بلکہ یہ لفظ اپنے وسیع ترین معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ عام سوال جو ہر ایک تمدنی سوال پر حاوی ہوتا ہے۔ یہ ہے کہ ہر ایک حالت اور ہر ایک معاملہ میں اپنی روش و طرزِ عمل کو درست رکھا جائے۔ مثلاً جسم کے ساتھ کس طرح سلوک کرنا چاہیئے؟ نفس کے ساتھ کس طرح سلوک کرنا چاہیئے؟ اپنے معاملات کا کس طرح انتظام کرنا چاہیئے؟ بال بچوں کی پرورش کس طرح کرنی چاہیئے؟ تمدنی حیثیت سے کس طرح برتاؤ کرنا چاہیئے؟ خوشی کے ذرایع جو قدرت نے مہیا کیے ہیں اُن سے کس طرح فائدہ اٹھانا چاہیئے؟ یعنی اپنی تمام قوتوں کو خود اپنے تئیں اور دوسروں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کے لیے کیوں کر استعمال کرنا چاہیئے؟ قصہ کوتاہ کامل طور پر کیوں کر زندگی بسر کرنی چاہیئے؟ چوں کہ ہم کو کامل معاشرت کے سیکھنے کی بڑی ضرورت ہے۔ اس لیے بڑی بات جو تعلیم سے حاصل ہونی چاہیئے یہی ہے۔ تعلیم کو جو فرض ادا کرنا پڑتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم کو پوری طرح زندگی بسر کرنے کے لیے تیار کردے اور کسی نصاب تعلیم کی نسبت رائے قائم کرنے کا یہی ایک معقول طریقہ ہے کہ اس امر کی تحقیق کی جائے کہ وہ کس درجہ تک اس فرض کو پورا کرتا ہے۔

مختلف علوم کے اضافی قیمت کا معیار مقرر کرنے میں بہت احتیاط رکھنی چاہیئے۔

اس معیار کو پورے طور پر کبھی استعمال نہیں کیا گیا بلکہ جزوی طور پر بھی شاذ و نادر ہی استعمال کیا گیا ہے اور وہ بھی بے جا پاسداری اور مبہم و بے خبرانہ طریقہ سے۔ اس لیے

ضرورت ہے کہ اس معیار کو شعور اور باقاعدگی کے ساتھ ۔ اور تمام حالتوں میں کام میں لایا جائے ۔ ہم کو لازم ہے کہ اس بات کو صاف طور پر ہمیشہ مدنظر رکھیں کہ معاشرت کامل کا اختیار کرنا ہی تعلیم کی علت غائی ہے تاکہ ہم بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت میں اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر غور و تامل سے مضامین و طرق تعلیم کا انتخاب کر سکیں ۔ تعلیم کے معاملہ میں صرف یہی احتیاط ضروری نہیں ہے کہ عام دستور کو بے سوچے سمجھے اختیار کر لینے سے باز رہنا چاہیئے ۔ جو کسی دوسرے دستور سے بہتر قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ بلکہ ہم کو لازم ہے کہ کسی علم کی قدر و قیمت کو جانچتے وقت اس ناشائستہ اور عملی طرز کو بھی ترک کر دیں ۔ جس کو وہ لوگ اختیار کرتے ہیں جو ذرا زیادہ سمجھدار ہیں ۔ اور اپنے بچوں کی عقلی ترقی کی نگرانی کا کچھ نہ کچھ خیال رکھتے ہیں ۔ صرف یہ خیال کر لینا کافی نہیں ہونا چاہیئے کہ فلاں علم آئندہ زندگی میں مفید ہوگا ۔ یا فلاں علم بہ نسبت فلاں علم کے زیادہ قدر و قیمت رکھتا ہے ۔ بلکہ اُن کی اضافی قیمتوں کو معیّن کرنے کے لیے کوئی ایسی ترکیب ڈھونڈھ کر نکالنی چاہیئے ۔ جس سے حتی الامکان قطعی طور پر ہم کو معلوم ہو جائے کہ کون سے علم سب سے زیادہ توجّہ کے مستحق ہیں ۔

مختلف علوم کی قدر و قیمت کا معیار مقرر کرنا سخت مشکل ہے

اس میں شک نہیں کہ یہ کام مشکل ہے بلکہ شاید اس میں پوری پوری کامیابی حاصل ہی نہیں ہو سکتی ۔ مگر جب کہ اُن فوائد کی وسعت پر غور کی جائے ۔ جن کے زائل ہونے کا خطرہ ہے ۔ تو یہ مشکل اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ کم ہمتی سے اُس کو نظر انداز کر دیا جائے بلکہ زیادہ تر اس بات کی دلیل ہے کہ اپنی تمام ہمت کو اُس میں مصروف کیا جائے ۔ اور اگر ہم صرف باقاعدہ کارروائی کریں تو بہت جلد ہماری رسائی اُن نتائج تک ہو سکتی ہے ۔ جن کی وقعت کچھ کم نہیں ہے ۔

زندگی کے مشاغل کی تقسیم و ترتیب پانچ حصوں میں ۔

ہمارا پہلا کام صریحًا یہ ہونا چاہیئے ۔ کہ انسانی زندگی کے بڑے بڑے کاموں کی ضرورت و عظمت کے اعتبار سے اُن کے درجے مقرر کریں ۔ قدرتی طور پر ان کاموں کی ترتیب

اس طرح ہو سکتی ہے -

(۱) وہ کام جو حفاظت نفس میں بلا واسطہ مدد دیتے ہیں -

(۲) وہ کام جو ضروریات زندگی کو بہم پہنچا کر بالواسطہ حفاظت نفس کے لیے مدد دیتے ہیں -

(۳) وہ کام جن کی غرض پرورش و تربیت اولاد ہے -

(۴) وہ کام جو مناسب تمدنی اور ملکی تعلقات کے قایم رکھنے پر مشتمل ہیں -

(۵) وہ مختلف کام جو زندگی کے زمانہ فرصت کو مصروف رکھتے ہیں - اور مذاق اور جذبات کی تفریح کے واسطے مخصوص ہیں -

حفاظت نفس سب کاموں پر مقدم ہے اور اسکی وجہ

اس بات کے ثابت کرنے کے لیے کہ ان کاموں کو تقریباً ان کے اصلی درجہ کے موافق ترتیب وار بیان کیا گیا ہے - کچھ زیادہ غور و خوض کی ضرورت نہیں ہے - صاف ظاہر ہے کہ وہ کام اور وہ پیش بینی جس کے ذریعے سے وقتاً فوقتاً ذاتی حفاظت حاصل ہوتی ہے اس کو باقی تمام کاموں پر مقدم کرنا چاہیے - اگر کوئی آدمی مثل شیرخوار بچے کے اردگرد کی اشیا اور حرکات سے - یا اس بات سے کہ ان کے درمیان کس طرح اپنی رہ نمائی کرے - ناواقف ہوتا تو وہ اول ہی مرتبہ باہر بازار میں نکلتے کے ساتھ ہی یقیناً اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا - خواہ دوسرے معاملوں میں اس نے کتنا ہی علم کیوں نہ حاصل کیا ہوتا - اگر کوئی شخص باقی تمام باتوں سے ناواقف محض بھی ہو تو یہ امر اس قدر جلد اس کی ہلاکت کا باعث نہیں ہو سکتا - جس قدر کہ اس خاص معاملہ (حفاظت نفس) سے بالکل ناواقف ہونا منتج بہ ہلاکت ہے - پس یہ بات تسلیم کرنی چاہیے کہ جو علم حفاظت نفس میں براہ راست ممد و معاون ہو وہی سب سے زیادہ ضروری ہے -

دو بالواسطہ حفاظت نفس کا درجہ دوسرا ہے اور اس کی وجہ

اس میں بھی کسی شخص کو کلام نہ ہوگا کہ بلا واسطہ حفاظت نفس کے بعد بالواسطہ

حفاظت نفس'' کا درجہ ہے ۔ جس سے مراد ہے وسائل معاش کا حاصل کرنا۔ کسب معیشت کے فرائض کو والدین کے فرائض پر مقدم سمجھنا اِس دلیل سے ثابت ہے کہ عام طور پر فرائض والدین کی بجا آوری صرف اُس صورت میں ممکن ہے جب کہ پہلے سے کسب معیشت کے فرائض کو پورا کر لیا جائے ۔ چونکہ اپنے نفس کو پرورش کرنے کی طاقت ۔ اولاد کو پرورش کرنے کی طاقت سے لامحالہ مقدم ہے ۔ اِس لیے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو علم اپنے نفس کی پرورش کے لیے درکار ہے ۔ اُس کا حق زیادہ قوی ہے بہ نسبت اُس علم کے جو بال بچوں کے آرام و آسائش کے لیے ضروری ہے اور یہ علم باعتبار قدر و قیمت کے صرف اُس علم سے دوسرے درجہ پر ہے جو براہ راست حفظ نفس کے واسطے ضروری ہے ۔

فرائض والدین ملکی و تمدنی فرائض پر مقدم ہیں۔ اسکے دلائل ۔

چوں کہ قدامتِ زمانہ کے اعتبار سے خاندان ۔ سلطنت سے پہلے ہے چونکہ بچوں کی پرورش ۔ سلطنت کے قایم ہونے سے پہلے یا اوس کے معدوم ہوجانے کے وقت بھی ممکن ہے اور چوں کہ سلطنت کا وجود صرف بچوں کی پرورش کے ذریعہ سے ممکن ہے ۔ اس لیے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ والدین کے فرائض ۔ ملکی و تمدنی فرائض کی نسبت زیادہ غور و توجہ کے محتاج ہیں ۔ اس خصوص میں ایک اور دلیل پیش کی جا سکتی ہے ۔ چوں کہ عامہ ناس کی فلاح و بہبودی ۔ بالآخر باشندگانِ شہر کی طبیعت پر منحصر ہے ۔ اور چوں کہ باشندگانِ شہر کی طبیعت بہ نسبت کسی دوسری شئے کے ۔ ابتدائی تربیت کے ذریعہ سے زیادہ تر تبدیل ہوسکتی ہے ۔ پس ہم کو یہ نتیجہ ضرور نکالنا چاہیئے کہ خاندان کی بہبودی عامۂ ناس کی بہبودی کی بنیاد ہے ۔ اور اس وجہ سے جو علم خاندان کی بہبودی میں براہِ راست ممد و معاون ہو اُس کو اُس علم پر ضرور فوقیت دینی چاہیئے جو براہ راست عامۂ ناس کی بہبودی کا معاون ہو ۔

شخصی تفریح اور حفظ نفس کا درجہ سب سے موخر ہے اور اسکا سبب

سنجیدہ مشاغل کے بعد جو وقتِ فرصت باقی رہتا ہے اُس کو پر کرنے کے لیے

آرام و راحت کے مختلف مشغلے مثلاً موسیقی - شاعری - مصوری وغیرہ
تمدن کے پہلے سے موجود ہونے پر بہ صراحت دلالت کرتے ہیں - ان فنون کا معقول
ترقی کرنا بغیر اس کے کہ لوگوں میں تمدنی اتحاد عرصہ دراز سے قایم ہو - نہ صرف محال
ہے بلکہ ان فنون کا نفس مضمون ہی زیادہ تر تمدنی جوش اور ہمدردی پر مشتمل ہے -
صرف اتنی ہی بات نہیں کہ ان علموں کی ترقی کے واسطے - تمدن ضروری شرط ہے
بلکہ وہ خیالات اور جذبات بھی - جن کو یہ علوم ظاہر کرتے ہیں - تمدن ہی کی بدولت پیدا
ہوتے ہیں - اور یہی وجہ ہے کہ انسان کے چال چلن کا وہ حصہ - جو تمدنی حقوق کو عمدہ
طور پر ادا کرنے کے متعلق ہے - اس حصہ سے زیادہ وقعت رکھتا ہے جو زینت و آرائش
یا مذاق کی تربیت میں صرف ہوتا ہے - اور جو تعلیم انسان کو پہلے کام کے لیے تیار کرتی
ہے اس کا درجہ اس تعلیم سے مقدم ہونا لازم ہے - جو دوسرے کام کے لیے تیار
کرتی ہے -

بیان مذکورہ بالا کا اعادہ اور تعلیم کے مختلف حصوں کا باہمی تعلق -

اب ہم اسی مضمون کو دہراتے ہیں کہ تعلیم کی مختلف شاخوں کی عقلی ترتیب
ان کی ضرورت کے لحاظ سے قریب قریب حسب ذیل ہے -

اوّل - وہ تعلیم جو بلاواسطہ حفاظت نفس کے لیے تیار کرتی ہے -

دوم - وہ تعلیم جو بالواسطہ حفاظت نفس کے لیے تیار کرتی ہے -

سوم - وہ تعلیم جو فرائض والدین کے لیے تیار کرتی ہے -

چہارم - وہ تعلیم جو حقوق تمدن کے پورا کرنے کے لیے تیار کرتی ہے -

پنجم - وہ تعلیم جو زندگی کے مختلف مشاغل تفریح کے لیے تیار کرتی ہے - جو
تمدن کے ساتھ وابستہ ہیں -

اس بیان سے ہماری یہ مراد نہیں ہے کہ یہ شاخیں قطعی طور پر ایک دوسرے سے
جدا ہو سکتی ہیں - ہم اس بات سے انکار نہیں کرتے کہ وہ پیچیدہ طور پر ایک دوسرے کے

سا تعلق وابستہ ہیں اور ایسا ہو نہیں سکتا - کہ اُن میں سے کسی ایک قسم کی تعلیم دیجائے اور اُس سے باقی ماندہ شاخوں کی کچھ نہ کچھ تعلیم حاصل نہ ہو جائے ہم کو اس میں بھی کلام نہیں ہے - کہ تعلیم کی ہر ایک شاخ میں ایسے حصّے موجود ہیں - جو مسبوق الذکر شاخوں کے بعض حصوں کی نسبت زیادہ ضروری ہوتے ہیں - مثلاً ایسا شخص جس کو کاروبار میں بہت مہارت ہو - مگر دوسری قوتیں کم رکھتا ہو - ممکن ہے کہ وہ کامل معاشرت کے درجہ سے بہت دُور جا پڑے - بہ نسبت اُس شخص کے جس کو روپیہ کمانے میں تو متوسط درجہ کی لیاقت ہو - مگر فرائض والدین کی انجام دہی میں اُس کی سمجھ بوجھ بہت عمدہ ہو - یا مثلاً جو شخص اصلی حقوق تمدن سے کامل واقفیت رکھتا ہو - مگر علم ادب اور فنون لطیفہ[۱] کی عام تعلیم سے بالکل بے بہرہ ہو - ایسے شخص کی دنیا میں کم ضرورت ہے - بہ نسبت اُس شخص کے جس کو حقوق تمدن سے معمولی درجہ کی واقفیت ہو - اور علم ادب اور فنون لطیفہ سے بھی کچھ کچھ واقفیت ہو - لیکن اِن واجبی اوصاف کو بیان کرنے کے بعد بھی اِن شاخوں میں بہت کچھ نمایاں فرق باقی رہتا ہے اور یہ بات پھر بھی بجا ہے خود صحیح و درست ہے کہ اِن شاخوں کا درجہ ترتیب مذکورۂ بالا کے مطابق ایک دوسرے کے بعد ہے - چوں کہ تعلیم کی اِن پانچ شاخوں کے مقابلہ میں زندگی کے پانچ درجے موجود ہیں - لہٰذا یہ بات ممکن ہے کہ یہ شاخیں بھی اُسی ترتیب سے ایک دوسرے کے بعد واقع ہوں -

تعلیم کے مختلف حصّوں میں اُن کی قدر و قیمت کے لحاظ سے معقول تناسب قایم رکھنا ضروری ہے

تعلیم کا منتہا ئے کمال تو یہی ہے کہ اِن تمام علموں میں پورا کمال حاصل ہو جائے - لیکن اگر ایسا کمال حاصل کرنے میں کامیابی نہ ہو - جیسا کہ تہذیب و تمدن کی موجودہ حالت میں ہر شخص کو تھوڑی بہت ناکامیابی ضرور ہوتی ہے - تو تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ہر ایک حصّے کی تیاری کے درجوں میں ایک معقول تناسب قایم رکھا جائے - یہ نہ ہو کہ کسی ایک حصّے میں بدرجۂ غایت لیاقت حاصل کی جائے اگرچہ وہ حصہ نہایت ہی ضروری ہو یہ بھی نہ ہو کہ صرف دو تین یا چار حصّوں پر جو سب سے زیادہ ضروری ہوں - عام تر توجہ مبذول

[۱] فنون لطیفہ سے مراد وہ فنون ہیں جو قوتِ متخیلہ پر منحصر ہیں - مثلاً شاعری - مصوری - معماری - موسیقی - بعض اوقات صرف شاعری اور مصوری پر بھی اسکا اطلاق ہوتا ہے - مترجم

کی جائے - بلکہ سب حصّوں پر توجہ کرنی چاہیئے - جو حصّہ قدر و قیمت میں سب سے زیادہ ہو اُس پر سب سے زیادہ - جو کم ہو اُس پر کم - اور جو سب سے کم ہو اُس پر سب سے کم توجہ کرنی چاہیئے - کیوں کہ اوسط درجہ کے آدمی کے واسطے (اِس بات کو بھولنا نہیں چاہیئے کہ خاص آدمیوں کو علم کی کسی ایک شاخ میں خاص قابلیت ہوتی ہے اور وہ قابلیت اُسی علم کی تحصیل کو روٹی کمانے کا مشغلہ بنا دیتی ہے) ضرورت اِس بات کی ہے کہ اُس کو ایسی چیزوں کی تقریبًا کامل تعلیم دی جائے جو کامل معاشرت میں سب سے زیادہ ممد و معاون ہوں اور جن چیزوں کو کامل معاشرت سے کم تعلق ہو اُن کی تکمیل کی طرف اسی قدر کم توجہ کی جائے -

باعتبار قدر و قیمت کے علم کی تین قسمیں اور ان کی تشریح مثالوں کے ذریعہ سے -

اِس معیار کے ذریعہ سے تعلیم کا انتظام کرنے میں بعض عام باتیں غور طلب ہیں - جن کو ہمیشہ مد نظر رکھنا چاہیئے - کسی قسم کی تربیت کی قدر و قیمت - اِس حیثیت سے کہ اُس سے کامل معاشرت میں مدد ملتی ہے - یا تو لازمی ہوتی ہے - یا کم و بیش عارضی ہوتی ہے - پس علم کی تین قسمیں ہو سکتی ہیں - ایک وہ علم جس کی قیمت اصلی و ذاتی ہے - دوسرے وہ علم جو فی الجملہ اصلی و ذاتی قیمت رکھتا ہے تیسرے وہ علم جس کی قیمت رسمی و اعتباری ہے - یعنی صرف لوگوں کی نظر میں اُس کی وقعت ہے مثلاً اس قسم کے واقعات کہ "اعضا میں ایک بے حسی اور سنسناہٹ کا پیدا ہو جانا فالج سے پہلے عمومًا محسوس ہوتا ہے" "جو جسم پانی میں حرکت کرتا ہے - پانی کی مزاحمت اُس کی شرح رفتار کے مربع کے لحاظ کم یا زیادہ ہوتی رہتی ہے" "کلارن[۵۱] دافع امراض متعدیہ ہے" یہ واقعات اور عمومًا سائنس کے حقائق مسلمہ حقیقی اور اصلی قدر و قیمت رکھتے ہیں - یہ واقعات اب سے دس ہزار برس بعد بھی انسان کے چال چلن

---

[۵۱] کلارن - سبزی مائل رنگ کی ایک بھاری گیس ہے جو عام نمک کا ایک جز ہے - مترجم -

بڑھ ہی اثر کریں گے جو اب کرتے ہیں - اپنی مادری زبان (انگریزی) کا ضرورت سے زیادہ علم حاصل کرنا جو لاطینی اور یونانی زبانوں کی واقفیت سے حاصل ہوتا ہے - اِس علم کی نسبت ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کی قدر و قیمت فی الجملہ اصلی و ذاتی ہے - اِن زبانوں کا علم ہمارے واسطے - اور اُن دوسری نسلوں کیواسطے جن کی زبانیں اِن سرچشموں کی بہت کچھ احسان مند ہیں - ضرور باقی رہنا چاہیئے - لیکن یہ علم صرف اُس وقت تک قایم رہے گا جب تک ہماری زبانیں قایم ہیں - ہاں البتہ اُس قسم کا علم جس کی تعلیم تاریخ کے نام سے ہمارے مدرسوں میں دی جاتی ہے - یعنی محض ناموں - تاریخوں اور مردہ و بے معنی واقعات کا سلسلہ - صرف رسمی قدر و قیمت رکھتا ہے - اس علم کو ہمارے کسی فعل سے بعید سے بعید علاقہ بھی نہیں ہے - اور یہ علم محض عوام الناس کی اُس ناگوار خردہ گیری سے بچنے کے لیے کار آمد ہے - جو اِس قسم کی تاریخی معلومات نہ ہونے کی وجہ سے کی جاتی ہے - اس میں شک نہیں کہ اُن واقعات کو جو ہر زمانہ میں تمام نوع انسان سے تعلق رکھتے ہیں - بہ نسبت اُن واقعات کے - جن کا تعلق ایک محدود زمانہ تک نوع انسان کے صرف ایک حصّہ سے ہے - زیادہ وقعت دینی چاہیئے - مگر بہ نسبت اُن واقعات کے جن کا تعلق نوع انسان کے صرف ایک حصے کے ساتھ اُتنی ہی مدّت تک ہے - جب تک کہ ایک خاص فیشن کا رواج قایم ہے - اِن عام واقعات کو اور بھی زیادہ وقعت کی نگاہ سے دیکھنا لازم ہے - پس اِس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اصلی اور ذاتی قیمت والے علم کو اُس علم پر مقدم سمجھنا لازم ہے - جو فی الجملہ ذاتی قیمت یا محض رسمی قیمت رکھتا ہے - بشرطیکہ باقی امور مساوی ہوں -

تحصیل علم کی قدر و قیمت دو وجہ سے ہے - اوّل باعتبار تعلیم کے دوم باعتبار تربیت کے -

اسی مضمون کے متعلق ہم ایک اور تمہید بیان کرتے ہیں - ہر قسم کی تحصیل علم دو وجہ سے قابل قدر ہے اوّل بوجہ نفس علم کے جو اُس سے حاصل ہوتا ہے - دوسرے باعتبار تربیت کے - ہر علم کے واقعات کی واقفیت - قطع نظر اس کے کہ ہمارے کردار

اور روحانی کی ہدایت کے لیے مفید ہے۔ اس وجہ سے بھی سودمند ہے کہ اُس سے عقل بڑھتی ہے۔ اور تحصیل علم کے نتائج پر۔ اس حیثیت سے کہ وہ ہم کو کامل معاشرت کے واسطے تیار کرتے ہیں۔ ان دونوں فائدوں کو مدنظر رکھ کر غور کرنی چاہیئے

پس نصاب تعلیم پر بحث کرتے وقت ان عام خیالات کو پیش نظر رکھنا لازم ہے:۔ اوّل زندگی کی تقسیم مختلف قسم کے کاروبار میں۔ جو بہ لحاظ عظمت و ضرورت کے بہ تدریج ایک دوسرے سے کم تر درجہ پر واقع ہیں۔ دوم ہر قسم کے واقعات کی حقیقی۔ فی الجملہ حقیقی اور رسمی قدر و قیمت جس کے ذریعہ سے یہ مختلف کام باقاعدہ منضبط رہتے ہیں۔ سوم۔ ان واقعات کا باضابطہ اثر جس کا اندازہ تعلیم اور تربیت دونوں حیثیتوں سے کرنا چاہیئے۔

"بلا واسطہ حفاظت نفس" کی تعلیم کا انتظام قدرت نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھا ہے۔

تعلیم کا جو حصہ سب سے زیادہ ضروری ہے یعنی "بلا واسطہ حفاظت نفس" خوش قسمتی سے اُس کے لیے تو پہلے ہی سامان مہیا کر دیا گیا ہے۔ چوں کہ یہ تعلیم اس قدر اہم اور مہتم بالشان ہے کہ اس کو ہمارے بھروسے پر نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ کہ آئے دن پڑے ٹھوکریں کھایا کریں۔ اس لیے قدرت نے اُس کو اپنے ہی ہاتھ میں رکھا ہے۔ شیر خوار بچہ ابھی انا کی گود ہی میں ہوتا ہے اور چلنے پھرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ کہ اجنبی شخص کی صورت دیکھ کر اپنا منہ چھپا لیتا اور رونے لگتا ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ کہ بچہ کی فطرت میں بھی اُس عقل حیوانی کا ظہور ابتدائی طور پر پایا جاتا ہے جس کے ذریعہ سے ہم نئی اور نامعلوم شے سے بھاگ کر بچتے ہیں جس کے خطرناک ہونے کا احتمال ہے۔ اور جب بچہ پاؤں چل سکتا ہے۔ اور کسی اجنبی کتے کے پاس آنے سے خوف کھاتا ہے۔ یا کسی چونکا دینے والی آواز یا نظارہ کے بعد چیخ مار کر اپنی ماں کے پاس دوڑ جاتا ہے۔ تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عقل حیوانی نے اور زیادہ ترقی کی ہے۔ اس کے علاوہ جو علم "بلا واسطہ حفاظت نفس" میں مدد و معاون

ہے۔ اس کے حاصل کرنے میں بچہ ہر گھڑی مصروف رہتا ہے "اپنے جسم کو کس طرح سنبھالنا چاہیئے ؟" "اپنی حرکات کو کس طرح قابو میں رکھنا چاہیئے - تاکہ صدمہ اور ٹکر سے محفوظ رہے" ؟ "کون سی چیزیں سخت ہیں جن کی ٹکر یا دھکے سے چوٹ لگ جاتی ہے" ؟ "کون سی چیزیں بھاری ہیں - اور ہاتھ پاؤں پر گرنے سے تکلیف دیتی ہیں" ؟ "کون سی چیزیں جسم کا بوجھ سہار سکتی ہیں - اور کون سی نہیں سہار سکتیں" ؟ "آگ - آلات حرب اور نوک دار اوزار سے کیسی تکلیف پہنچتی ہے" ؟ یہ سب باتیں اور اسی قسم کی مختلف معلومات جو موت یا حادثہ سے بچنے کے لیے ضروری ہے - بچہ ہمیشہ حاصل کرتا رہتا ہے - چند سال کے بعد جب اس کی قوتیں گھر سے باہر نکل کر دوڑنے - اچھلنے - کودنے کسی چیز پر چڑھنے اور زور آزمائی یا ہنرمندی کے کرتبوں میں صرف ہوتی ہیں - تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ سب کام حرکات کے ذریعہ سے رگ پٹھے نشوونما پاتے ہیں - قوت مدرکہ تیز ہوتی ہے اور قوت فیصلہ سرعت کے ساتھ اپنا عمل کرنے لگتی ہے - ہم کو اس بات کے لیے تیار کرتے ہیں - کہ آس پاس کی اشیا اور حرکات کے درمیان جسم کو کیوں کر محفوظ رکھنا چاہیئے اور ان بڑے بڑے خطروں کا کس طرح مقابلہ کرنا چاہیئے - جو کبھی کبھی ہر شخص کی زندگی میں پیش آتے رہتے ہیں - چوں کہ اس ضروری اور بنیادی تعلیم کا اہتمام قدرت نے نہایت عمدہ طور پر کر دیا ہے - اس لیے اس پر توجہ کرنے کی ضرورت نسبتاً کم ہے - خاص طور پر جس بات کا خیال رکھنا ہم کو لازم ہے وہ یہ ہے کہ اس تجربہ اور اس تربیت کے حاصل کرنے کے لیے بچوں کو بے روک ٹوک موقع ملتا رہے - اور مقتضائے فطرت کی تکمیل میں کوئی امر مانع نہ ہو - جیسا کہ بے وقوف معلمات - لڑکیوں کو جو ان کی زیر نگرانی ہیں - قدرتی چستی و چالاکی اور کود پھاند میں مصروف ہونے سے روک دیتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نسبتاً اس قابل نہیں رہتیں کہ خطرہ کے موقعوں پر اپنی حفاظت آپ کر سکیں -

بلا واسطہ حفاظت نفس کی دوسری قسم

جو تعلیم مع بلا واسطہ حفاظت نفس کے واسطے تیار کرتی ہے - یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہیئے کہ اس تعلیم میں صرف وہی باتیں داخل ہیں - جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے - کسی ہتھیار یا اوزار کے صدمہ یا ضرر سے جسم کو بچانے کے علاوہ دوسرے سببوں سے جو نقصان پہنچ سکتا ہے اُس سے بھی جسم کو محفوظ رکھنا لازم ہے - مثلاً بیماری اور موت جو قانون فزیالوجی[1] کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہے - کامل معاشرت کے لیے صرف یہی امر ضروری نہیں ہے کہ اُن اسباب کو دفع کیا جائے جن سے یکایک زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے بلکہ اُن بے عقلی کی حرکتوں اور نادانی کی عادتوں سے بھی جو آہستہ آہستہ کام تمام کرتی ہیں بچنا چاہیئے - چوں کہ صحت و طاقت کے بغیر تمام کاموں کا پورا کرنا کم و بیش محال ہے خواہ وہ کام دستکاری کے متعلق ہوں - خواہ فرائض والدین اور تمدن وغیرہ کے متعلق - اِس لیے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ "بلا واسطہ حفاظت نفس" کی یہ دوسری قسم بہ لحاظ عظمت و ضرورت کے صرف پہلی قسم سے کم تر درجہ پر ہے - اور جو علم اوس کے حاصل کرنے میں مدد و معاون ہو اُس کا درجہ بہت بلند ہونا چاہیئے -

مختلف کیفیتیں جو ہم کو محسوس ہوتی ہیں - ہمارے قدرتی رہبر ہیں -

یہ سچ ہے کہ اِس خصوص میں بھی قدرت نے ہدایت کا سامان کسی قدر پہلے ہی مہیا کر دیا ہے - طرح طرح کے جسمانی احساس اور خواہشوں کے ذریعہ سے قدرت نے بڑی بڑی ضرورتوں کو پورا کرنے کی خاص ذمہ داری اپنے اوپر لے لی ہے - یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ خوراک کی احتیاج - سخت گرمی یا حد درجہ کی سردی کا محسوس ہونا ایسی اٹل تحریک ہمارے دل میں پیدا کرتا ہے - کہ اُس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا - اور اگر لوگ اس قسم کی تحریکوں کا حکم عادۃً اُسی وقت بجا لائیں - جب کہ اُن کا عمل زیادہ قوی نہ ہو - تو نسبتہً بہت کم خرابیاں پیدا ہونگی - جس وقت جسم یا دماغ کام کرتے کرتے تھک جائے اگر ہمیشہ اسی وقت کام چھوڑ دیا جائے - اگر بند ہوا سے حبس پیدا ہونے کے ساتھ

[1] فزیالوجی - وہ علم ہے جس میں حیوانات و نباتات کے اعضا اور اُن کے عمل اور طرز عمل سے بحث ہوتی ہے مترجم

ہی مکاں میں ہوا پہنچانے کا ہمیشہ بندوبست کر دیا جائے - اگر بغیر بھوک کے کھانا نہ کھائیں اور بغیر پیاس کے پانی نہ پیئیں - تو ایسی صورت شاذ و نادر ہی وقوع میں آئیگی کہ ہمارا انتظام بدن کام دینے سے عاری ہو جائے - مگر زندگی کے قوانین سے لوگ اس قدر سخت جاہل ہیں کہ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ یہ احساسات اُن کے قدرتی رہنما ہیں - اور اگر ایک مدت دراز تک اُن کے حکموں کی نافرمانی کر کے اُن کو درماندہ اور بیکار نہ بنا دیا جائے تو قابل اعتبار رہنما ہیں - پس اگرچہ قدرت الٰہی نے آفرینشِ عالم کی غرض وغایت کو پیش نظر رکھ کر صحت کی حفاظت کے لیے عمدہ رہبر بہم پہنچا دئے ہیں - تاہم لاعلمی اُن کو بہت کچھ بیکار اور نکما بنا دیتی ہے -

علم فزیالوجی کی ناواقفیت بیماری کا باعث ہے اور بیماری کے نقصانات

اگر کسی شخص کو اس بات میں شک ہو کہ کامل معاشرت کی غرض سے علم فزیالوجی کے اصول سے باخبر ہونا کیا کچھ ضروری ہے - تو اُس کو چاہیئے کہ اپنی چاروں طرف نظر ڈالے اور دیکھے کہ کتنے ادھیڑ یا جوانی سے ڈھلے ہوئے عورت و مرد ایسے مل سکتے ہیں جو پورے تندرست ہوں - ایسی مثال تو کبھی کبھار دیکھنے میں آتی ہے کہ کوئی شخص بڑھاپے تک صحیح و سالم اور چاق و چوبند رہے - مگر سخت بیماری - مزمن امراض - عام کمزوری - اور قبل از وقت ضعیفی کی مثالیں ساعت بساعت اور دم بدم ہمارے مشاہدے میں آتی ہیں - مشکل ہی سے کوئی ایسا آدمی ملے گا جس سے تم یہ سوال کرو اور اس کو مدت العمر میں کوئی ایسا مرض لاحق نہ ہوا ہو کہ اگر اُس مرض کی بابت تھوڑی سی واقفیت ہوتی تو وہ اُس سے بچ سکتا تھا - کہیں گٹھیا کے بخار کی وجہ سے - جو بدن کو غفلت سے کھلا رکھنے کا نتیجہ ہے قلبی مرض پیدا ہو جاتا ہے - کہیں کثرت مطالعہ سے عمر بھر کے لیے آنکھیں خراب ہو جاتی ہیں - کل ایک شخص کا ذکر کیا گیا تھا جس کا پاؤں مدت تک اس وجہ سے لنگ کرتا رہا کہ اُس کے گھٹنے میں خفیف سی چوٹ لگ گئی تھی - اور باوجود درد اور

تکلیف کے اُس نے پہلا پہر تا ترک نہیں کیا تھا۔ اور آج ایک اور شخص کا حال ہم نے بیان کیا ہے جس کو برسوں بستر بیماری پر اس وجہ سے پڑے رہنا پڑا کہ اُس کو یہ معلوم نہ تھا کہ اختلاج قلب کا مرض جس میں وہ مبتلا ہے۔ دماغ سے بہت زیادہ کام لینے کا نتیجہ ہے۔ اِس وقت ہم ایک ناقابل علاج صدمہ کا ذکر سنتے ہیں۔ جو زور آزمائی کے کسی احمقانہ کرتب کا نتیجہ ہے۔ اور پھر ایسے شخص کا حال سننے میں آتا ہے۔ جس کا جسم کثرت کار کے اثر سے جو خواہ مخواہ یا بلا ضرورت اختیار کیا گیا تھا۔ پھر کبھی صحت یاب نہوا۔ اور دائمی خفیف امراض تو جن کے ساتھ کمزوری بھی لگی رہتی ہے ہر طرف دیکھنے میں آتے ہیں۔ تکلیف۔ نقصان۔ افسردہ دلی۔ وقت اور روپیہ کی بربادی۔ بیماری کے نتیجے ہیں۔ اُن پر تفصیل کے ساتھ بحث کرنی تو درکنار صرف اس بات پر غور کرو۔ کہ بیماری جمیع فرائض کے ادا کرنے میں کیا کچھ رکاوٹ اور مزاحمت پیدا کرتی ہے۔ ایسا اوقات کام کرنا بالکل محال ہو جاتا ہے اور زیادہ دشوار تو ہمیشہ ہو جاتا ہے۔ مزاج میں چڑچڑا پن پیدا ہو جاتا ہے جو اولاد کی باقاعدہ تربیت کے لیے سم قاتل ہے۔ فرائض تمدن کا ادا کرنا تو ایک طرف رہا۔ تفریح و دلبستگی کے سامان، وبال جان ہو جاتے ہیں۔ کیا یہ بات صاف ظاہر نہیں ہے۔ کہ جسمانی گناہ کسی قدر ہمارے آباو اجداد کے اور کسی قدر ہمارے اپنے جن سے یہ بیماری پیدا ہوتی ہے۔ کامل معاشرت میں بہ نسبت کسی دوسری شے کے زیادہ تر خلل انداز ہوتے ہیں؟ اور زندگانی بجائے اس کے کہ برکت و راحت کا موجب ہو۔ زیادہ تر وبال و نکال کا باعث ہو جاتی ہے؟

بیماری سے بڑا سخت نقصان یہ بھی پہنچتا ہے کہ اُس کی وجہ سے زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

بیماری سے یہی نقصان نہیں ہیں جو اوپر بیان کیے گئے ہیں۔ علاوہ اس کے کہ زندگی اس طرح سے نہایت خراب اور تباہ ہو جاتی ہے۔ زندگی کا خاتمہ بھی جلد ہو جاتا ہے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ کسی بیماری

یا بے آرامی سے شفایاب ہونے کے بعد ہم بدستور سابق تن درست و توانا ہو جاتے
ہیں - ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ اعضائے جسمانی کے باقاعدہ عمل میں فتور واقع ہو اور اُس کے
رفع ہونے کے بعد نظام بدن بالکل اُسی طرح قایم رہے - جیسا کہ پہلے تھا - بلکہ مستقل
اور دیرپا نقصان پہنچتا ہے - ممکن ہے کہ وہ نقصان فوراً محسوس نہ ہو - مگر ہوتا ضرور
ہے - اور ایسی ہی ذرا ذرا سی رقموں کے ساتھ جن کو قدرت اپنے سخت حساب
کتاب میں کبھی نہیں چھوڑتی - یہ صدمے بھی لامحالہ ہماری مدت عمر کو گھٹانے میں ہمارے
برخلاف موثر ہوتا ہے - خفیف صدموں کے جمع ہونے سے یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے
کہ جسم عموماً وقت سے بہت پہلے کمزور ہو جاتا اور اندر ہی اندر گھل جاتا ہے - اور اگر
ہم اس بات کو یاد رکھیں کہ ہماری مدت عمر کا اوسط - عمر طبیعی سے کس قدر کم ہے تو ہم
سمجھ سکتے ہیں کہ کیا کچھ نقصان عظیم ہو رہا ہے اخراب صحت کی وجہ سے مدت حیات
میں جو بہت کچھ کمی ہوتی رہتی ہے - اگر اس بڑے آخری نقصان کو بھی اُس میں شامل
کر لیا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے - کہ بالعموم نصف عمر ضائع و برباد جاتی ہے -

قوانین صحت کی واقفیت کیوں ضروری ہے

پس وہ علم جو اس طرح نقصانِ صحت کو روکنے کی وجہ سے "بلاواسطہ حفاظت
نفس" میں ممد و معاون ہو - اُس کی عظمت اوّل درجہ کی ہے - ہم یہ نہیں کہتے کہ
ایسے علم کے حاصل کر لینے سے اس خرابی کا پورا پورا دفعیہ ہو سکتا ہے - ظاہر ہے کہ
تمدّن کی موجودہ صورت میں لوگوں کی ضرورتیں اُن کو اکثر اوقات خلاف ورزی
پر مجبور کرتی ہیں - اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس قسم کی مجبوری نہ ہو تو بھی لوگوں کا میلانِ طبیعت
برخلاف اُن اعتقاد کے اُن کو اکثر اوقات اس بات کی طرف لے جاتا ہے - کہ آئندہ
سود و بہبود کو - موجودہ راحت و آرام پر قربان کر دیتے ہیں - مگر ہم اس بات پر زور
دیتے ہیں - کہ صحیح علم - اگر صحیح طور پر دل نشین کیا جائے تو اس کا بڑا اثر ہوتا ہے - اور
چوں کہ قوانین صحت کی پوری طرح تعمیل کرنے سے پہلے - اُن کو اچھی طرح سمجھ لینا ضرور

ہے - اِس لیے ہم اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ معقول معاشرت اختیار کرنے
سے پہلے - خواہ وہ کبھی حاصل ہو - اِس علم کو حاصل کرنا ضروری ہے - چوں کہ قوی صحت
اور اعلے درجہ کی چستی و چالاکی - جو اُسکو لازم ہے - ان ہی دونوں پر - بہ نسبت کسی دوسری
شے کے زیادہ تر خوشی کا دار مدار ہے - اس لیے اِس امر کی تعلیم کہ اُن کو کسی طرح قایم
رکھنا چاہیئے - ایسی تعلیم ہے - جس کا درجہ بہ لحاظ عظمت و ضرورت کے اور کسی تعلیم
سے کم نہیں ہے - اسی وجہ سے ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ علم فزیالوجی کا اس قدر نصاب
جو اُس کے عام اصول - اور روزانہ برتاؤ سے اُن اصول کے تعلقات کو سمجھنے کے
لیے درکار ہے - معقول تعلیم کا نہایت ہی ضروری جز ہے -

دنیا کی عقل کیسی اوندھی ہے کہ غیر ضروری چیزوں کو ضروری چیزوں پر ترجیح دیجاتی ہے

تعجب ہے کہ ایسی موٹی سی بات کے بیان کرنے کی ضرورت ہوا اور اُس کی
تائید و حمایت کی ضرورت ہو تو اور بھی زیادہ تعجب ہے - تاہم ایسے آدمیوں کی تعداد
کچھ کم نہیں ہے - جو اِس بات کو سُن کر ایک طرح کا تمسخر کریں گے - جن لوگوں کی زبان
سے بجائے اِفِجینیا[1] کے اِفجینیا نکل جائے اور دوسرے لوگ اُس پر گرفت کریں
تو وہ اپنی اِس غلطی پر منفعل ہوتے ہیں - یا کسی افسانہ کے نیم دیوتا[2] کے جھوٹے کارناموں
سے ناواقف ہونے کا اُن پر الزام لگایا جاسکے تو وہ اس بات کو اپنی توہین سمجھ کر بُرا
مانتے ہیں - وہی لوگ اس قسم کی باتوں سے کہ یوسٹاکین ٹیوب[3] کہاں ہیں " ؟

---

[1] یونان کے مشہور مصنف یوری پڈیز نے ایک ناٹک لکھا ہے جس کا موضوع ایک لڑکی مسماۃ اِفجینیا کو قرار دیا گیا ہے اس کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ اُس کے باپ نے اپنی منت پوری کرنے کے لیے اپنی لڑکی کو آرٹمس دیوی کی بھینٹ چڑھا دیا تھا - مگر دیوی اُس کو قربان گاہ سے اُٹھا کر شہر ٹارس میں لے گئی - اور وہاں یہ لڑکی اُس کے پجاریوں میں شامل ہو گئی مترجم

[2] نیم دیوتا سے وہ فرضی سُور ما مراد ہے جس کا باپ دیوتا اور ماں انسان ہو - مترجم

[3] سولھویں صدی عیسوی میں یوسٹاکی اس نامی ایک مشہور طبیب اور علم تشریح الاجسام کا عالم اٹلی میں گزرا ہے - اُسنے اپنی تحقیقات میں دریافت کیا ہے کہ کان کے خلا سے لیکر منہ کے پچھلے حصے تک ہوا کی آمد و رفت کیلیے ایک پتلی سی نلی لگی ہوئی ہے - چوں کہ اس نلی کو سب سے پہلے یوسٹاکی اِس نے دریافت کیا تھا - اس لیے دریافت کنندہ کے نام پر اُس کا نام یوسٹاکین ٹیوب رکھ دیا گیا ہے یعنی یوسٹاکی اِس کی دریافت کی ہوئی نلی - ٹیوب کے معنی نلی کے ہیں - مترجم

اور دار بڑھ کی ہڈی کے مہروں کا عمل کیا ہے " ؟ " نبض کی باقاعدہ شرح رفتار کیا ہے " ؟ " پھیپھڑوں میں ہوا کیوں کر بھر جاتی ہے " ؟ اپنی ناواقفیت کو تسلیم کرتے وقت ذرا بھی شرمندہ نہیں ہوتے۔ جس حالت میں کہ لوگ اس بات کے خواہش مند رہتے ہیں کہ اُن کے لڑکے اب سے دو ہزار برس پہلے کے توہمات باطلہ میں حاذق ہو جائیں۔۔ اُن کو اس بات کی پرواہ نہیں ہے کہ اُن کی اولاد کو خود اپنے اجسام کی بناوٹ اور اُن کے افعال کی بھی کسیقدر تعلیم دی جائے۔ نہیں بلکہ اُن کی خواہش یہی ہے کہ اُن کو ایسی تعلیم نہ دی جائے۔ مقررہ دستور العمل کا اثر کیا کچھ ہماری طبیعت پر غالب آگیا ہے۔ نمائشی تعلیم نے کس زور و شور کے ساتھ مفید تعلیم کو پیچھے ڈال دیا ہے

علم معاش کی عظمت مسلم ہے

ہم کو اُس علم کی قدر و قیمت پر اصرار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو حصول معاش کو آسان کر دینے کی وجہ سے " بالواسطہ حفاظت نفس " میں مدد دیتا ہے۔ اس کو سب تسلیم کرتے ہیں۔۔ اور حقیقت یہ ہے کہ عوام الناس شائد اسی علم کو حد سے زیادہ تعلیم کی غایت سمجھتے ہیں۔ مگر جب کہ ہر شخص اس مسئلہ کو کہ " جو تعلیم نوجوانوں کو زندگی کے کاروبار کے لائق بناتی ہے۔ وہ بہت ضروری۔ بلکہ سب سے زیادہ ضروری ہے " مجملاً تسلیم کرنے کے لیے تیار ہے۔ شائد ہی کوئی شخص دریافت کرتا ہو کہ کون سی تعلیم اُن کو اس قابل بنا سکتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ لکھنے۔ پڑھنے اور حساب کے فوائد کو اچھی طرح سوچ سمجھ کر بچوں کو ان مضمونوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مگر تقریباً ان ہی تینوں مضمونوں پر جن کا ہم نے نام لیا ہے اُس تعلیم کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ان کے سوا علم کا بڑا ذخیرہ جو حاصل کیا جاتا ہے اُس کو صنعت و حرفت کے کاموں سے کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ اور بہت سا علم جو صنعت و حرفت کے کاموں سے براہ راست تعلق رکھتا ہے۔ اُس سے قطع نظر کی جاتی ہے۔

زندگی کے تقریباً تمام کاموں میں سائنس کی ضرورت ہے

بعض ادنیٰ ترین جماعتوں کو چھوڑ کر۔ غور تو کرو کہ تمام آدمی کس کام میں مصروف ہیں ؟

وہ تجارتی مال کے پیدا کرنے۔ تیار کرنے اور تقسیم کرنے میں مصروف ہیں اور بھلا تجارتی مال کے پیدا کرنے۔ تیار کرنے اور تقسیم کرنے کی لیاقت کس بات پر منحصر ہے؟ یہ بات اُن طریقوں کے استعمال پر منحصر ہے۔ جو مختلف قسم کے تجارتی مال کے لیے مناسب ہیں۔ یہ بات اُس کے طبعی۔ کیمیائی۔ اور حیاتی خواص پر جیسی کی صورت ہو منحصر ہے۔ یا یوں کہو کہ یہ بات سائنس پر منحصر ہے۔ یہ علم جس کو ہمارے مدرسوں کے نصاب میں نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ یہی علم اُن کاموں کو درستی کے ساتھ انجام دینے کی بنیاد ہے۔ جن کے ذریعے سے تمدنی زندگی ممکن ہے۔ اگرچہ اس محقق امر میں کسی کو مجال انکار نہیں ہے۔ تاہم لوگ عملاً اُس سے ناآشنا ہیں۔ اِس قدر سوالات ہی اُس سے بے گانگی کا باعث ہے۔ پس اپنی دلیل کو واجبی تقویت دینے کی غرض سے ہم کو لازم ہے۔ کہ واقعات پر جلدی سے ایک نظر ڈال کر اس حقیقت کو ناظرین پر منکشف کر دیں۔

صنعت و حرفت کے تمام کاموں میں حساب کا ضرورت ہے

سب سے زیادہ دقیق اور عقلی علم منطق ہے۔ جو سوداگر تجارتی مال کثرت سے پیدا کرتے یا تقسیم کرتے ہیں اُن کے کارخانوں کی کامیابی منطق کی باضابطہ پابندی پر منحصر ہے۔ خواہ اُن کو اِس بات کا علم ہو خواہ نہ ہو۔ مگر اِس دقیق علم سے قطع نظر کر کے اہم سب سے پہلے علم ریاضی کو لیتے ہیں۔ اِس علم کا سب سے زیادہ عام حصہ جس میں اعداد سے بحث ہوتی ہے۔ یعنی حساب۔ صنعت و حرفت کے تمام کاروبار میں رہنمائی کرتا ہے۔ خواہ اُس سے کارروائیوں کی درستی مقصود ہو۔ خواہ تخمینہ بنانا۔ خواہ تجارتی مال کا خرید و فروخت کرنا۔ خواہ حساب کتاب رکھنا۔ عقلی علم کے اِس حصہ کی قدر و قیمت پر زور دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

فن تعمیر و نجاری و مساحت

اعلیٰ درجہ کے فنون تعمیر کے واسطے علم ریاضی کی خاص خاص شاخوں سے

اور ریلوے کے تمام کاموں میں علم ہندسہ کی ضرورت ہے۔

واقفیت بہم پہنچانی نہایت ہی ضروری ہے۔ دیہاتی بنجارہ جو عملی قاعدوں سے اپنا کام چلاتا ہے۔ بڑھئیا برج کے معمار کی طرح۔ اس کو بھی تعلقات مکانی کے قوانین سے ہر گھڑی کام پڑتا ہے۔ پیمائش کرنے والا جو خریدی ہوئی زمین کی پیمائش کرتا ہے میر عمارت جو ایک عالی شان محل کا نقشہ تجویز کرتا ہے معمار جو مکان کی بنیاد رکھتا ہے راج جو پتھروں کو گھڑتا ہے۔ اور مختلف کاریگر جو کیل کانٹے یا پرزوں کو درستی کے ساتھ اپنی جگہ پر بٹھا دیتے ہیں ان سب لوگوں کو اپنے اپنے کاموں میں حقایق علم ہندسہ سے ہدایت حاصل ہوتی ہے ریلوے بنانے کا انتظام شروع سے لے کر آخر تک علم ہندسہ کے ذریعے عمل میں آتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس پلین[۵۱] اور سیکشن[۵۲] کے تیار کرنے میں۔ لین لگانے میں۔ پشتوں اور نالیوں وغیرہ کی پیمائش میں۔ پلوں۔ نالیوں۔ دریا یا وادی کے محراب نما پلوں۔ زمیں دوز رستوں۔ اسٹیشنوں وغیرہ کے نقشے بنانے اور تعمیر کرنے میں علم ہندسہ سے کام لیا جاتا ہے۔ بندرگاہیں۔ لنگرگاہیں۔ سمندری بند۔ فن تعمیر و انجنیری کے مختلف کام کی جو سواحل بحر پر مثل جہاز کے واقع ہیں۔ اور ملک کے اندر جا بجا پھیلے ہوئے ہیں۔ نیز سرنگیں جو زمین کے اندر ہی اندر چلی جاتی ہیں۔ ان سب کی وہی کیفیت ہے۔ اور آج کل کسان کو بھی صحیح طور پر کھیت کی نالیاں بنانے کے واسطے۔ ہمواری سطح کا خیال رکھنا پڑتا ہے یا یوں کہو کہ اس کو اصول علم ہندسہ کی طرف رجوع کرنی پڑتی ہے۔

---

۵۱ کسی عمارت وغیرہ کے متوازی الافق یا نیچے کی سطح کے نقشے کو انگریزی میں پلین Plan کہتے ہیں۔ مترجم۔

۵۲۔ کسی عمارت وغیرہ کے ایسے نقشے کو جس سے اس کی اندرونی حالت معلوم ہو جائے۔ انگریزی میں سکشن Section کہتے ہیں۔ مترجم۔

زمانۂ حال کی دستکاریوں کا دارومدار علم جرثقیل پر ہے اور اس بات کی تشریح مختلف مثالوں کے ذریعہ سے

اب اُن علموں کی طرف توجہ کرو جو عقلی و مادّی دونوں حیثیتیں رکھتے ہیں - اِن میں سے سب سے آسان علم یعنی جرثقیل کے استعمال پر زمانۂ حال کی صنعت کا دارومدار ہے - ہر ایک کل میں ڈنڈی[۵۱] - پیہّ دُھری چرخہ کے خواص کو تسلیم کیا جاتا ہے اور اس زمانہ میں تمام پیداوار کلوں ہی کی بدولت ہے - ذرا ایک گردۂ نان کی سرگذشت کا کھوج لگاؤ - جس زمین سے یہ روٹی پیدا ہوئی ہے اُس کو کل سے بنے ہوئے گھیروں کے ذریعہ سے خشک کیا گیا تھا - کلوں ہی کے ذریعہ سے اُس کی مٹی اُلٹ پلٹ کی گئی تھی - کلوں ہی کے ذریعہ سے گیہوں کاٹے - گاہے اور برسائے گئے تھے - کلوں ہی کے ذریعہ سے اُن کو پیسا اور چھانا گیا تھا - اور اگر آٹا نگاسپورٹ[۵۲] بھیجا گیا ہو تو ممکن ہے کہ کل ہی کے ذریعہ سے بسکٹ بنائے گئے ہوں اب جس کمرہ میں تم بیٹھے ہو - اُس کے چاروں طرف نظر ڈالو - اگر یہ کمرہ حال کا بنا ہوا ہے تو اُس کی دیواروں کی اینٹیں غالباً کل کی بنی ہوئی ہونگی کلوں ہی کے ذریعہ سے فرش کے تختوں کو چیر کر صاف کیا گیا تھا - کلوں ہی کے ذریعہ سے آتش دان کی الماری کے تختوں کو چیر کر جلا دی گئی تھی - کلوں ہی کے ذریعہ سے کاغذ کی جھالریں بنائی اور چھاپی گئی تھیں - عمدہ لکڑی کی پتلی دھجو میز کے اوپر چڑھائی گئی ہے - کرسیوں کے مُڑے ہوئے پائے قالین - پردے یہ سب کلوں کا نتیجہ ہیں - تمہارے پہننے کے کپڑے سادے منقش یا چھپے ہوئے - کیا بالکل کل ہی کے بنے ہوئے بلکہ سِلے ہوئے نہیں ہیں ؟ اور جو کتاب تم پڑھ رہے ہو کیا اُس کے اوراق ایک کل ہی

---

[۵۱] - مشہور آلات جن کو علم جرثقیل کی اصطلاح میں قواسے آلیہ کہتے ہیں چھ ہیں :- (۱) ڈنڈی (یعنی لوہے وغیرہ کی لمبی چھڑ) (۲) سطح مائل (۳) پیہّ دُھری (۴) پیچ (۵) چرخی (۶) خانہ پیچیدہ سے پیچیدہ کل کے پرزے اِن چھٹوں چیزوں سے باہر نہیں ہوتے - مترجم -

[۵۲] نگاسپورٹ انگلستان کا ایک شہر ہے - لندن سے (۲۲) میل جنوب مشرق کی طرف واقع ہے صنعت و دستکاری کی وجہ سے مشہور ہے - مترجم -

کے ذریعے سے نہیں بنتے ہیں اور اُس کے الفاظ دوسری کل کے ذریعہ سے نہیں چھپتے ہیں؟ اس پر اتنا اور اضافہ کر دو کہ ان چیزوں کو خشکی اور تری کی راہ ملک بہ ملک پہنچا دینے کی وجہ سے بھی اس طرح ہم کلوں کے ممنون احسان ہیں۔ اب غور کرو کہ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے جس قدر اچھی یا بُری طرح علم جرثقیل کو کام میں لاتے ہیں اسی قدر کامیابی یا ناکامی حاصل ہوتی ہے۔ جو انجینیر کانٹ کرامی اور مصالح کی قوت و پایداری کا اندازہ صحیح طور پر نہیں کرتا۔ اُس کا بنایا ہوا پُل ٹوٹ جاتا ہے۔ جو صنّاع خراب کل سے کام لیتا ہے۔ وہ دوسرے صنّاع سے جس کی کل رگڑ اور حرکت و سکون کی حالت میں کم گھستی ہے۔ کبھی سبقت نہیں لے جا سکتا۔ جو جہاز بنانے والا پرانے نمونہ پر جہاز بناتا ہے۔ اُس کا جہاز اُس شخص کے جہاز سے پیچھے رہ جاتا ہے۔ جو سمندری موجوں کا لحاظ رکھ کر۔ اُس اصول کے موافق جہاز بناتا ہے۔ جس کو علم جرثقیل نے صحیح قرار دیا ہے۔ چوں کہ ایک قوم کی قابلیت دوسری قوموں کے مقابلہ میں اپنی حالت کو قایم و برقرار رکھنے کے لیے افراد قوم کی ہنرمندی اور عملی قوت پر منحصر ہے۔ اس لیے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ قومی قسمت کی کل جرثقیل کی بدولت چلتی ہے۔"

عقلی و مادّی دونوں حیثیتیں رکھنے والے علم کے اُن حصّوں سے لے کر جو پینے والی قوتوں سے بحث کرتے ہیں اُن حصّوں تک پہنچ کر جن میں سالمات[۱] کی قوتوں سے بحث کی جاتی ہے۔ مفید کاموں کے ایک وسیع سلسلہ تک ہماری رسائی ہوتی ہے۔ اس قسم کے علموں کی بدولت جب کہ علوم مذکورہ بالا کو بھی ان کے ساتھ شامل کر دیا جائے۔ وہ خانی انجن بنایا گیا ہے جو لاکھوں کروڑوں مزدوروں کا

علم الحرارت۔ علم المناظر و مرایا۔ قوت برقی و مقناطیسی کر...

---

[۱] کسی شے کے ایسے چھوٹے سے چھوٹے ذروں کو جن کی مزید تقسیم ممکن نہ ہو انگریزی میں ایٹم A toms اور عربی میں سالمات اور اجزاے لایتجزّیٰ بھی کہتے ہیں۔ مترجم

کام کرتا ہے ۔ علم طبیعیات کے اُس حصہ نے جس میں قوانین حرارت سے بحث ہوتی ہے ۔ ہم کو سکھا دیا ہے کہ مختلف کارخانوں میں ایندھن کو کفایت شعاری کے ساتھ کیونکر صرف کرنا چاہیئے ؟ دھاتوں کی گلانے والی بھٹیوں میں ہوا کے سرد جھونکے کو گرم جھونکے میں تبدیل کر کے ان کی پیداوار کو کیونکر بڑھانا چاہیئے ؟ کانوں میں کیونکر ہوا پہنچانی چاہیئے ؟ قندیل امن کے استعمال سے کانوں کے اُڑ جانے کے صدمہ کو کیونکر روکنا چاہیئے ؟ اور مقیاس الحرارت کے ذریعے سے بہت سے بے شمار کاموں کا باضابطہ انتظام کیونکر کرنا چاہیئے ؟ اس علم کا وہ حصہ جس کا موضوع روشنی ہے ۔ اور جس کو علم مناظر و مرایا کے نام سے موسوم کرتے ہیں ۔ بڈھوں اور ضعیف البصر آدمیوں کو آنکھیں دیتا ہے خوردبین کے ذریعہ سے امراض اور خراب چیزوں کی آمیزش کا کھوج لگانے میں مدد دیتا ہے اور ترقی یافتہ روشنی کے مناروں[۵۱] کے ذریعے سے جہازوں کو تباہی سے محفوظ رکھتا ہے قوت برقی اور قوت مقناطیسی کی تحقیقاتوں نے قطب نما کی بدولت بے شمار جانوں اور بے قیاس دولت کو بچایا ہے ۔ بہت سے فنون کو عکسی چھاپے کے ذریعہ سے مدد دی ہے ۔ اور اب تار برقی کا ایک ایسا وسیلہ بہم پہنچا دیا ہے ۔ جس سے آئندہ چل کر تجارتی معاملات کا باضابطہ انتظام ہوگا ۔ اور ملکوں میں راہ رسم اور تعلقات پیدا ہونگے ۔ باورچی خانہ کے ترقی یافتہ کاروبار سے لے کر آلہ مشخص التصور[۵۲] تک ۔ جو ملاقات کے کمرہ کی میز پر دھرا رہتا ہے ۔ خانگی

---

[۵۱] بندرگاہ کے دروازہ یا ساحل سمندر کے کسی مقام پر ایک بلند مینار بنایا جاتا ہے ۔ اس مینار کے اوپر کے حصہ پر نہایت تیز روشنی کی جاتی ہے ۔ تاکہ رات کے وقت ملاحوں کو جہاز رانی میں رہنمائی ہو ۔ انگریزی میں اس مینار کو لائٹ ہوس (کہتے ہیں ۔ ہم نے اسکا ترجمہ روشنی کا مینار کیا ہے ۔ مترجم)

[۵۲] آلہ مشخص التصور ترجمہ ہے سٹیریو سکوپ (Stereoscope) کا اس آلہ کے ذریعہ سے تصویریں کی شکلیں مجسم نظر آتی ہیں ۔ مترجم

زندگی کی ذرا ذرا سی باتوں میں بھی علوم طبعی کی اعلیٰ شاخیں ہمارے آرام و آسائش اور حفظ نفس کی بنیاد ہیں۔

بیشمار دستکاریوں میں علم کیمیا کے عجیب و غریب کرشمے۔

علم کیمیا کے کرشمے اس سے بھی زیادہ بے شمار ہیں۔ کپڑا دھونے والا۔ رنگنے والا اور چھاپنے والا۔ ان لوگوں کا کام جہاں تک کیمیائی قوانین کے موافق یا ناموافق ہو۔ اُسی قدر اچھا یا بُرا ہوتا ہے۔ تانبے۔ قلعی۔ جست۔ سیسے۔ چاندی۔ لوہے وغیرہ کے گلانے میں علم کیمیا ہی کی ہدایت درکار ہے شکر صاف کرنا۔ گیس بنانا۔ صابون کو جوش دینا۔ بارود بنانا یہ سب کام اور علیٰ ہذا القیاس شیشے اور چینی کے کام۔ ایک حد تک علم کیمیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ بات کہ وہ غیر جوشیدہ بوزہ کو الکحل کے درجہ تک حرارت پہنچائی جائے تو وہ اپنی اصلی حالت پر قایم رہتا ہے یا تیزاب اور سرکہ بن جاتا ہے" ایک کیمیائی سوال ہے جس کے ساتھ کلال کا نفع یا نقصان وابستہ ہے۔ اور اگر بوزہ کش کا کاروبار وسیع ہو تو وہ اپنے کارخانہ میں ایک کیمیاگر کو نوکر رکھ سکتا ہے۔ حقیقت میں آج کل شاید ہی کوئی کام ایسا ہو جس کے کسی نہ کسی حصّہ پر علم کیمیا کا تسلط نہ ہو۔ نہیں۔ بلکہ اس زمانہ میں زراعت کو بھی کامیابی سے چلانے کے لیے علم کیمیا ہی کی رہنمائی درکار ہے۔ مختلف قسم کی کھاد اور مٹی کی تحلیل۔ اس امر کی تشریح کہ وہ کس قسم کی پیداوار کے واسطے مناسب ہیں نوسادر تیار کرنے کے واسطے سنگ جراحت یا دیگر اشیا کا استعمال کرنا۔ حیوانات کا فضلہ جو ہیچ صورت میں زمین سے برآمد ہوتا ہے۔ اُس کو کام میں لانا۔ مصنوعی کھادوں کا تیار کرنا۔ یہ سب کچھ علم کیمیا کی برکت ہے۔ جس سے واقفیت حاصل کرنی کسان کا فرض ہے۔ دیا سلائی بنانے میں۔ غلیظ اور گندہ پانی کی بدبو دور کرنے میں عکسی تصویر اُتارنے میں۔ بغیر خمیر کے ڈبل روٹی بنانے میں فضلہ سے عطر نکالنے میں۔ غرض ہم دیکھتے ہیں کہ تمام دستکاریوں میں۔ علم کیمیا کا اثر ہے۔ اور اسی وجہ سے یہ علم ہر ایک شخص کے لیے جس کو بالواسطہ

یا بلا واسطہ دست کاریوں سے تعلق ہو ضروری ہے۔

علم ہیئت کے فوائد

مادی علوم میں سب سے پہلے ہم علم ہیئت کو لیتے ہیں۔ اس علم سے فن جہازرانی نکلا ہے۔ جس کی بدولت عظیم الشان بیرونی تجارت ہوتی ہے جس سے ہماری آبادی کا ایک بڑا حصہ پرورش پاتا ہے۔ اور ہماری بہت سی ضروریات اور آرام و آسائش کی اکثر چیزیں مہیا ہوتی ہیں۔

علم طبقات الارض دست کاری میں کیونکر مدد دیتا ہے

علم طبقات الارض بھی ایسا علم ہے۔ جس کی واقفیت دست کاری کی کامیابی میں بہت کچھ مدد دیتی ہے۔ اب کہ لوہے کی خام دھات دولت کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اب کہ یہ سوال بڑا دلچسپ ہو گیا ہے۔ کہ پتھر کے کوئلے کا ذخیرہ کب تک قایم رہے گا؟ اب کہ ہمارے ہاں معدنیات کا کالج اور طبقات الارض کی تحقیقات کا سر رشتہ قایم ہو گیا ہے۔ اِس بات پر مفصل بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کہ زمین کی بالائی سطح کا مطالعہ ہماری اصل بہبودی کے لیے ضروری ہے۔

علم بیالوجی کی فضیلت اور دست کاری سے اس کا تعلق۔

اب علم الحیات (بیالوجی)[1] کو لو۔ کیا یہ علم بھی ویسا ہی بلا واسطہ حفاظت نفس والا کے ان کاموں سے بالذات تعلق نہیں رکھتا؟ فی الحقیقت ان کاموں سے جن کو عموماً دست کاری کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس علم کو بہت کم تعلق ہے۔ مگر جو دست کاری سب سے زیادہ اہم ہے۔ یعنی خوراک حاصل کرنا۔ اس سے تو ایسا تعلق ہے کہ دونوں کا جدا ہونا محال ہے۔ چونکہ یہ بات ضرور ہے کہ زراعت کے طریقے نباتاتی اور حیوانی زندگی کے مظاہر قدرت کے مطابق ہوں۔ اس لیے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ ان مظاہر قدرت کا علم۔ زراعت کی معقول بنیاد ہے۔ علم بیالوجی کے مختلف حقایق اپنے ذاتی تجربہ سے کسانوں نے قایم کر لیے ہیں اور ان پر عمل

[1] علم بیالوجی میں زندگی اور زندہ چیزوں یعنی حیوانات و نباتات کے حالات سے بحث ہوتی ہے اس کا اردو ترجمہ علم الحیات کیا گیا ہے۔ مترجم۔

کرتے ہیں - حالانکہ اب تک سائنس کی حیثیت سے اُن پر غور نہیں کی گئی - مثلاً یہ
کہ "خاص کھادیں خاص پودوں کے واسطے مناسب ہیں" "بعض قسم کی
کھادیں زمین کو دوسری فصلوں کے ناقابل بنا دیتی ہیں" "گھوڑے ادنیٰ خوراک پر عمدہ
کام نہیں کر سکتے" "مویشیوں اور بھیڑوں کی خاص خاص بیماریاں خاص خاص
حالتوں سے پیدا ہوتی ہیں" یہ سب باتیں اور وہ علم جو پودوں اور حیوانوں کی پرورش
کے متعلق کاشت کار کو روزمرہ حاصل ہوتا رہتا ہے - علم بیالوجی کے واقعات کا ذخیرہ
ہیں - اور اِس ذخیرہٴ معلومات کی کثرت پر اُسکی کامیابی کا زیادہ تر دارومدار ہے - جب کہ
اِن واقعات سے - گو وہ قلیل غیر معین - اور ابتدائی حالت میں ہوں - کاشت کار
کو اِس قدر ضروری مدد ملتی ہے - تو اب انصاف کرو کہ جب یہ واقعات قطعی معین -
اور مکمل ہو جائیں - اُس وقت اُن کی قدر و قیمت کیا کچھ ہوگی - درحقیقت ہم اب بھی اُن
منافع کو دیکھ سکتے ہیں - جو علم بیالوجی کی عقلی تعلیم سے روز بروز اُس کو حاصل ہوتے رہتے
ہیں - یہ حقیقت کہ "حرارت غریزی کا پیدا ہونا خوراک کے خرچ ہو جانے پر دلالت کرتا
ہے - اور اِسی وجہ سے حرارت کے نقصان کا روکنا زائد خوراک کی ضرورت کو روکتا ہے"
محض قیاسی نتیجہ ہے - مگر یہی نتیجہ مویشی کو موٹا تازہ بنانے میں آج کل رہنمائی کرتا ہے
اور یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ مویشی کو گرم رکھنے سے چارہ کی کفایت ہوتی ہے - اسی
طرح مویشی کو مختلف قسم کی خوراک دینی مفید ہے - عالمانِ فزیالوجی کے تجربوں سے
ثابت ہو گیا ہے کہ نہ صرف خوراک کی تبدیلی مفید ہے بلکہ ہر ایک کھانے میں مختلف
اجزا کی آمیزش سے ہاضمہ میں سہولت ہوتی ہے - وہ مرض جو "سٹیگرز"[۵] کے نام سے
مشہور ہے جس سے ہزاروں بھیڑیں ہر سال مرتی ہیں - ایک قسم کے کیڑے سے

---

[۵] سٹیگرز - گھوڑوں اور دوسرے مویشیوں کی ایک بیماری ہے جس کی وجہ سے وہ لڑکھڑا کر یکایک گر پڑتے
ہیں اور مر جاتے ہیں مترجم -

پیدا ہوتا ہے - جو دماغ پر دباؤ ڈالتا ہے اور اگر اِس جانور کو کھوپری کی اُس ملایم جگہہ سے جو اُس کا نشیمن ہے باہر نکال دیا جائے - تو پھر عموماً بچ جاتی ہے - یہ تحقیقات زراعت پر علمِ بیالوجی کا ایک اور احسان ہے -

علم المعاشرت کو صنعت و حرفت سے براہ راست تعلق ہے

ابھی ہم کو ایک اور علم کا ذکر کرنا باقی ہے جس کو دست کاری کی کامیابی سے براہ راست تعلق ہے - یعنی علم المعاشرت - جو لوگ روزمرہ اِس بات پر نظر رکھتے ہیں کہ بازار میں روپیہ کی مانگ کس قدر ہے - مروجہ قیمتوں پر غور کرتے ہیں - غلّہ - روئی - شکر - اُون - ریشم کی تخمینی پیداوار پر بحث کرتے ہیں - جنگ پیش آنے کے احتمالات کا موازنہ کرتے ہیں - اور اِن واقعات مسلّمہ کی رو سے اپنے تجارتی کاروبار کا تصفیہ کرتے ہیں - وہ سب علم المعاشرت کے طالب علم ہیں گو ممکن ہے کہ وہ محض ذاتی تجربہ سے - نہ کہ علمی اصول سے - اُس کا مطالعہ کریں اور ٹھوکریں کھائیں - پھر بھی طالب علم ہیں - اگر صحیح نتیجے پر پہنچ گئے تو انعام حاصل کر لیا - ورنہ ناکام رہ کر منافع سے محروم رہتے - نہ صرف بڑے بڑے دست کاروں اور سوداگروں کو - بلکہ خردہ فروشوں کو بھی - ایسا کرنا چاہیے کہ اپنے مال کی رسد اور مانگ کا اندازہ قایم کر کے - جو بہت سی باتوں پر منحصر ہے - اور اثر معاشرت کے چند عام اصول کو چپ چاپ تسلیم کرنے کے بعد - اپنے کاروبار کو چلائیں - اُن کی خوشحالی بہت کچھ اِس امر پر منحصر ہے کہ وہ ایسے معاملات میں صحیح رائے قایم کریں کہ آیندہ چل کر مال کی قیمت یک مُشت فروخت کرنے کی صورت میں کیا ہوگی - اور مال کی نکاسی کی شرح کیا ہوگی - ظاہر ہے کہ جو شخص کسی جماعت کے پیچیدہ تجارتی کاروبار میں شریک ہو - اُس کو اُن قوانین کے سمجھنے سے گہرا تعلق ہے - جن کے موافق اُن کاموں میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے -

سائنس کی بعض شاخیں

پس جو لوگ تجارتی مال کے پیدا کرنے - خرید و فروخت کرنے - یا تقسیم کرنے

کی واقفیت ہر شخص کے لیے ضروری ہے اور اس کی عدم واقفیت سے بہت نقصان پیدا ہوتا ہے۔ 2/3

ہیں مشغول ہیں - اُن سب کے لیے سائنس کی بعض شاخوں کی واقفیت پر ضرور ہے
ہر شخص جس کو کسی قسم کی دست کاری سے بلاواسطہ یا بالواسطہ تعلق ہے - (اور ایسے
اشخاص بہت ہی کم ہیں - جن کو اس قسم کا تعلق نہ ہو) اُس کو کسی نہ کسی طرح ریاضی طبعی
اور کیمیائی خواص اشیار سے کام پڑتا ہے - بلکہ شاید علم بیالوجی سے بھی براہ راست تعلق
ہو - اور علم المعاشرت سے تو یقیناً تعلق ہوتا ہے اُس پر بالواسطہ حفاظت نفس ک
ہیں جس کو وہ مستقل روزی حاصل کرنا" کہتے ہیں - کسی شخص کا کام یاب یا ناکام یاب ہونا
بہت کچھ اس بات پر منحصر ہے - کہ ان علموں میں سے ایک یا کئی علموں میں اُس کو
کس قدر واقفیت حاصل ہے - گو عقلی واقفیت نہ ہو - عملی واقفیت ہی سہی - کیوں کہ
جسے ہم کام سیکھنا کہتے ہیں۔ وہ حقیقت میں اُس سائنس کا سیکھنا ہے جو اُس کام میں
کام آتا ہے - اگرچہ شاید سائنس کے نام سے اُس کی تعلیم نہ دی جاتی ہو - پس سائنس
کے ابتدائی اصول کی تعلیم دو وجہ سے بڑی ضروری ہے اوّل اس وجہ سے کہ وہ اِن
سب کاموں کے لیے تیار کرتی ہے - اور دوسرے اِس وجہ سے کہ عقلی علم - عملی
علم پر بے حد فوقیت رکھتا ہے - اس کے سوا سائنس کی تعلیم ہر شخص کے لیے نہ
صرف اس وجہ سے ضروری ہے - کہ وہ اُن کاموں اور اُن چیزوں کی ماہیت اور
چوں و چرا کو سمجھ سکے جن سے اُس کا تعلق اس وجہ سے ہے کہ وہ اُن کا بنانے والا
یا تقسیم کرنے والا ہے بلکہ یہ تعلیم بسا اوقات اِس وجہ سے بھی نہایت مہتم بالشان ہے
کہ وہ دوسری مختلف چیزوں اور کاموں کی ماہیت اور چون و چرا کو سمجھ سکے - اِس زمانہ
میں جب کہ لوگ اہم کاروبار کو مشترکہ سرمایہ سے انجام دیتے ہیں - تقریباً ہر ایک آدمی جو
مزدور سے اوپر کے درجہ کا ہے - اپنے پیشہ کے سوا کسی نہ کسی دوسرے پیشہ میں
بطور حصہ دار کے تعلق رکھتا ہے - اور اس تعلق کے لحاظ سے اُس کا نفع یا
نقصان اُن علوم کی واقفیت پر منحصر ہے - جو اس دوسرے پیشے سے متعلق ہیں

ہوا ایک کوئلہ کی کان کے کھودنے میں بہت سے حصہ دار اِس وجہ سے تباہ
برباد ہو گئے کہ اُن کو معلوم نہ تھا۔ کہ ایک خاص قسم کا مادہ پڑا نے سرخ بالو پتھر کی تہ میں
موجود تھا۔ جس کے نیچے کوئلہ نہیں نکلتا۔ ایسے انجن بنانے کے لیے جو مقناطیسی
اور برقی قوت کے ذریعے سے چل سکیں۔ بے شمار کوششیں کی گئی ہیں۔ اِس
اُمید پر کہ بھاپ کی ضرورت باقی نہ رہے۔ مگر جن لوگوں نے اِس کام میں روپیہ لگایا تھا۔
اگر وہ قوتوں کی باہمی مناسبت اور مساوات کے عام قانون کو سمجھ لیتے تو شاید وہ اپنے
ساہوکاروں ہی کے بہی کھاتے ہیں اپنے روپے کو محفوظ رکھتے۔ لوگوں کو روزمرہ
ایسی ایجادوں کے پورا کرنے میں مدد دینے کی ترغیب دیجاتی ہے۔ جن کا پوچ اور
ناکارہ ہونا۔ سائنس کا ایک مبتدی بھی ثابت کرسکتا ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا مقام ہو جہاں
کسی خیال محال کے پیچھے دولت کو برباد کرنے کی سرگذشت پیش نہ آئی ہو۔

عدم واقفیت سائنس سے جب کہ پہلے ہی ایسے بڑے بڑے نقصان اکثر
ہوتے رہتے ہیں۔ تو اُن لوگوں کو جو اب بھی سائنس سے جاہل رہینگے۔ اور
بھی زیادہ بڑے بڑے نقصان متواتر پیش آئینگے۔ جوں جوں اشیاے تجارت کی
پیداوار کے کاموں میں سائنس کا دخل زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ اور اہل حرفہ کی باہمی رقابت
کا یقیناً یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ اور جوں جوں مشترکہ سرمایہ کے کارخانے ملک میں پھیلتے جاتے
ہیں جو یقیناً پھیلیں گے۔ اسی قدر سائنس کا علم ہر شخص کے لیے ناگزیر ہوتا جاتا
ہے۔

آیندہ زمانہ میں سائنس کی ناواقفیت سے اور بھی زیادہ نقصان پہنچیں گے۔

پس ہم دیکھتے ہیں کہ جس علم کو ہمارے مدرسوں کے نصاب میں تقریباً بالکل
ہی نظر انداز کردیا جاتا ہے اُسی علم کا تعلق زندگی کے کاروبار میں تقریباً سب سے زیادہ
ہے۔ اگر ایسا ہوتا کہ لوگ اپنی معمولی تعلیم ختم کرنے کے بعد حتی المقدور کسی پیشہ کا
علم حاصل کرنا شروع نہ کردیتے تو ہماری صنعت و حرفت اور دستکاریاں بند ہوجاتیں

سائنس کی تعلیم سے عام مدرسوں میں غفلت کیجاتی ہے پیشہ و حرفہ کی عظمت اور رسمی علم کی مذمت

اور اگر اُن کا علم غیر سرکاری وسائل سے قرناً بعد قرنٍ اور نسلاً بعد نسلٍ جمع ہو کر شائع نہ ہوتا رہتا - تو یہ دستکاریاں صفحۂ ہستی سے معدوم ہو جاتیں - اگر بجز اُس تعلیم کے جو عام مدرسوں میں دی جاتی ہے - اور کسی قسم کی تعلیم نہ ہوتی تو اب انگلستان کی وہی حالت ہوتی جو فیوڈل سسٹم[سلہ] کے زمانہ میں تھی - مظاہر قدرت کے قوانین کی روز افزوں واقفیت نے ہم کو بہ تدریج اس قابل بنا دیا ہے کہ موجودات قدرت کو اپنی ضرورتوں کے واسطے تسخیر کر سکتے ہیں - اسی وجہ سے اِس زمانہ میں معمولی مزدور کو وہ آرام مل رہا ہے جو چند صدیوں پہلے بادشاہوں کو نصیب نہ ہو سکتا تھا - اور یہ واقفیت کچھ اُن مقررہ وسائل کی بدولت حاصل نہیں ہوئی - جن کی تعلیم ہمارے نوجوانوں کو دیجاتی ہے - جس ضروری علم کے ذریعے سے بحیثیت قوم ہم نے موجودہ حالت تک ترقی کی ہے - جو علم اب ہماری تمام زندگی کی بنیاد ہے - اُس علم کو کتابوں کے ذریعے سے نہیں - بلکہ اِدھر اُدھر سے سیکھا ہے - اور تعلیم کی معمولی درس گاہیں تو بجز اِس کے کہ رسمی چیزوں کی بُری بھلی تعلیم دیں - کوئی مفید بات نہیں سکھاتیں -

اب ہم انسانی کاموں کے تیسرے بڑے حصّہ کی طرف رجوع کرتے ہیں یعنی وہ حصّہ جس کے واسطے مطلق تیاری نہیں کی جاتی - اگر کسی عجیب اتفاق سے تعلیمی کتابوں یا کالج کے امتحانی پرچوں کے سوا - زمانہ آئندہ کی بعید نسلوں تک ہماری کوئی یادگار نہ پہنچے - تو ہم خیال کر سکتے ہیں کہ اُس زمانہ میں جس شخص کو یادگار سلف کے قائم رکھنے کا شوق ہوگا وہ اِس بات کو معلوم کر کے کس قدر ششدر اور حیران رہ جائے گا - کہ اُن کتابوں اور پرچوں میں کوئی نشان اِس بات کا موجود نہیں ہے -

ہمارے موجودہ نقشۂ تعلیم کی نسبت آیندہ نسلیں کیا رائے قائم کر سکتی ہیں -

---

سلہ ولیم اول شاہ انگلستان نے جو زیادہ تر "ولیم فاتح" کے نام سے مشہور ہے ہیسٹنگز کی لڑائی اور اپنے ملک کے شمالی حصّہ کی بغاوت کے بعد انگریز امرا سے زمینیں چھین کر اپنے نارمن رفقا کو اس شرط پر دی تھیں کہ جب کبھی جنگ کا موقع پیش آئے - بادشاہ کو فوج سے مدد دیں - اور اُس کی طرف سے لڑیں - اِس مشروط زمین داری کے انتظام کو فیوڈل سسٹم کہتے ہیں - ولیم اول نے ۱۰۶۶ء سے ۱۰۸۷ء تک حکومت کی تھی - مترجم -

جس سے اس علم کے حاصل کرنے والوں کا صاحب اولاد ہونا خیال کیا جاسکے۔ ہمارا تو خیال یہ ہے کہ وہ یہ نتیجہ نکالے گا کہ وہ یہ نصاب تعلیم اس زمانہ کے مجرد اور غیر متاہل لوگوں کے واسطے بنایا گیا ہوگا - میں دیکھتا ہوں کہ اس نصاب میں بہت سی چیزوں کے لیے کافی تیاری کا ذکر ہے خصوصاً معدوم اقوام اور ہم عصر اقوام کی کتابیں پڑھنے کا (جس سے حقیقت میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے پاس اپنی زبان میں پڑھنے کے لائق کتابیں بہت کم تھیں) مگر تربیت اولاد کا ذکر کہیں نام کو بھی نہیں ملتا - ایسا تو ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ اپنی بیہودگی سے اس اہم ترین ذمہ داری کی تربیت کو نظر انداز کر دیتے - پس صریحاً یہ نصاب کسی فرقہ رہبان کا نصاب تعلیم ہے کا۔

ترببیت اولاد کے علم سے غافل رہنا نہایت ہی حیرت انگیز ہے -

کیا یہ سخت متحیر کرنے والا واقعہ نہیں ہے کہ گو اولاد کی حیات و ممات اور اس کی اخلاقی بہبودی و تباہی - اس کی تربیت ہی پر منحصر ہے - تاہم ان لوگوں کو جو عن قریب ماں یا باپ بننے والے ہیں - تربیت اولاد کی بابت کبھی ایک حرف تک نہیں بتایا جاتا ؟ کیا یہ بات ہول ناک نہیں ہے کہ نئی نسل کی قسمت کو نامعقول رسم و رواج - طبعی میلان - اور اٹکل پچو وہم و گمان پر چھوڑ دیا جائے - جس کے ساتھ جاہل اناؤں کی رائیں اور بڑی بوڑھیوں کے متعصبانہ صلاح مشورے شامل ہوں ؟ اگر کوئی سوداگر جس کو حساب کتاب اور بہی کھاتے سے کچھ واقفیت نہ ہو - اپنا کاروبار شروع کرے - تو ہم اس کی حماقت پر شور و شغب برپا کریں گے - اور بربادی بخش اور تباہ کن نتائج کی توقع رکھیں گے - یا اگر کوئی شخص علم تشریح الابدان کے مطالعہ سے پہلے جراحی عمل شروع کر دے - تو ہم اس کی بے باکی (شوخ چشمی) پر حیران رہ جائینگے - اور اس کے مریضوں پر رحم کریں گے - لیکن اگر والدین تربیت اولاد کے مشکل کام کو شروع کر دیں - بغیر اس کے کہ انہوں نے جسمانی - اخلاقی - یا

عقلی اصول پر ذرا بھی غور کی ہو - جن اصول پر کہ اُن کو کاربند ہونا چاہیئے - تو ہم کو نہ تو ایسا کرنے والوں پر تعجب آتا ہے - اور نہ اُن کی مظلوم اولاد پر رحم آتا ہے - ہزارہا بچے جو والدین کی غفلت سے مرجاتے ہیں - اگر اس تعداد میں اُن لاکھوں بچوں کو بھی شامل کر لیا جائے جو بچ جاتے ہیں مگر ضعیف القویٰ اور نحیف الجثہ رہتے ہیں - اور اُن کروڑوں بچوں کو بھی - جن کے قویٰ ایسے مضبوط نہیں ہوتے جیسے ہونے چاہئیں - تو تم اُس آفت کا کسی قدر تصور کرسکو گے - جو قوانین زندگی سے جاہل والدین کے ہاتھوں اولاد کو بھگتنی پڑتی ہے ذرا غور تو کرو کہ جو غذا بچوں کو دی جاتی ہے - اُس کا اثر ہر گھڑی اُن پر پڑتا رہتا ہے جس کا نقصان یا نفع تمام عمر قایم رہتا ہے - اور اس بات پر بھی دھیان کرو کہ غلطی کی بیس راہوں کے مقابلہ میں سیدھا رستہ ایک ہی ہوتا ہے - اور تم کو اس بات کا کچھ نہ کچھ تصور ضرور پیدا ہو جائے گا - کہ اُن غافلانہ اور ٹکڑلیس تدبیروں سے جو عام طور پر رائج ہیں - قریب قریب ہر ایک جگہ کیسا نقصان عظیم ہو رہا ہے - کیا اس امر کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے - کہ لڑکے کو مہین ناپائیدار اور ناکافی لباس پہنایا جائے گا اور اُس کو ادھر اُدھر کھیلتے پھرنے کی اجازت دی جائے گی وراں حالیکہ سردی سے اُس کے ہاتھ پاؤں ٹھٹھر گئے ہوں ؟ اس بات کا اثر اُس کی تمام آئندہ زندگی پر ہوتا ہے - یا تو وہ بیمار رہتا ہے - یا نشوونما میں خلل واقع ہوتا ہے یا کام کرنے کی قوت میں کمی ہو جاتی ہے - یا سن بلوغ کو پہنچ کر جسمانی قوت جیسی کہ چاہیئے حاصل نہیں ہوتی اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ باتیں کامیابی اور خوشی میں سدراہ ہوتی ہیں - کیا بچوں کو اس بات کی سزا دی جاتی ہے - کہ اُن کو ہمیشہ ایک ہی طرح کی ناکام مقوی خوراک دی جائے ؟ جب وہ جوان ہوں گے تو اُن کی انتہائی جسمانی طاقت اور قابلیت میں اس وجہ سے ضرور کم و بیش فتور واقع ہوگا - کیا اُن کو شور و غل کے کھیل کود سے

اولاد کی جسمانی تربیت سے والدین کی غفلت اور اُسکے مضر نتائج -

منع کیا جاتا ہے ۔ یا (اس وجہ سے کہ اُن کے بدن پر اس قدر کافی لباس نہیں ہوتا
کہ وہ کھلی ہوا میں چلنے پھرنے کی برداشت کر سکیں) سردی کے موسم میں اُن کو گھر میں
مقید رکھا جاتا ہے ۔ وہ یقیناً صحت اور طاقت کے اُس درجہ سے گرے ہوئے
رہیں گے ۔ جس درجہ تک بغیر اس قسم کی روک ٹوک کے پہنچ سکتے تھے ۔ جب لڑکے
اور لڑکیاں بڑے ہوکر بھی بیمار اور کمزور رہتے ہیں تو والدین اس بات کو عموماً بدنصیبی
یا قہر الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں ۔ اور ایک بے ڈھنگی روش کے موافق جس کا عام
رواج ہے فرض کر لیتے ہیں ۔ کہ یہ مصیبتیں بغیر اسباب کے پیش آتی ہیں ۔ یا یہ کہ اُن
کے اسباب فوق العادۃ ہیں ۔ مگر یہ بات ہرگز نہیں ہے ۔ ہاں بے شک بعض
صورتوں میں موروثی اسباب ہوتے ہیں ۔ لیکن اکثر صورتوں میں احمقانہ تدبیریں ہی
ان مصیبتوں کا باعث ہوتی ہیں ۔ اس تمام دکھ درد ۔ اس کمزوری ۔ اس
افسردگی ۔ اور اس مصیبت کے ذمہ دار عموماً خود والدین ہوتے ہیں ۔ انہوں
نے اولاد کی جانوں کو ہر گھڑی اپنے قابو میں رکھنے کا ٹھیکہ لے لیا ہے ۔ انہوں
نے بے دردانہ لاپروائی سے زندگی کے اُن عملوں کا علم حاصل کرنے میں غفلت
کی ہے ۔ جن پر اُن کے حکم و امتناع کا اثر برابر پڑتا رہتا ہے علم فزیالوجی کے سیدھے
سادے قوانین سے محض نابلد ہونے کی وجہ سے سال بسال اپنے بچوں کے
قویٰ کو تحلیل کر رہے ہیں اور اس طرح سے نہ صرف اپنی اولاد بلکہ اُن کی نسلوں پر
بھی بیماری اور قبل از وقت موت کا ستم ڈھا رہے ہیں ۔

بچوں کی اخلاقی تربیت سے ماؤں کی غفلت اور اسکے مضر نتائج ۔

جب ہم جسمانی تربیت سے اخلاقی تربیت کی طرف رجوع کرتے ہیں ۔ تو
یہاں بھی والدین کی جہالت اور اس جہالت کی مضرت اسی قدر موجود ہے ۔ نوجوان
ماں اور اُس کے دایہ خانہ کے قانون پر غور کرو ۔ چند ہی سال پہلے وہ مدرسہ میں
تعلیم پاتی تھی ۔ جہاں اُس کے حافظہ میں لفظوں ۔ ناموں اور تاریخوں کو کوٹ کوٹ کر

بھر اگیا تھا۔ اور اُس کے قوائے متفکرہ سے شائد ذرا بھی کام نہیں لیا گیا تھا۔ جہاں اُس کو اُن قاعدوں کا ذرا بھی تصور نہیں دلایا گیا تھا جن کے موافق بچے کے کھلنے والے دل کی تربیت ہونی چاہیئے۔ اور جہاں اُس کی تعلیم و تربیت نے اُس کو بالکل اس قابل نہیں بنایا۔ کہ وہ بطور خود تربیت اولاد کے قاعدوں پر غور کر سکے۔ درمیانی عمر موسیقی کی مشق میں نقش و نگار اور بیل بوٹے کاڑھنے میں۔ قصے پڑھنے میں۔ جلسوں اور دعوتوں میں شریک ہونے میں گزر گئے۔ مادرانہ فرائض کی اہم ذمہ داریوں کا خیال اب تک اُس کو نہیں دلایا گیا۔ اور اُس سنجیدہ عقلی تعلیم میں سے شائد ہی کچھ تعلیم حاصل ہوئی ہو۔ جو ایسی ذمہ داریوں کے لیے کسی قدر تیار کرتی ہے۔ لو! دیکھو اب ایک انسانی ہستی کی غور و پرداخت کا اہتمام اُس کو سونپا گیا ہے جس کے قوائے جسمانی و عقلی روز بروز نشو و نما پاتے ہیں۔ لو اور سنو! (اس پر طرہ یہ کہ) وہ اِن اُمور سے جاہل مطلق ہے۔ جن سے اُس کو کام پڑتا ہے۔ اُس نے ایسے کام کے کرنے کا قصد کیا ہے جو نہایت ہی پورے علم کی مدد سے بھی صرف ادھورے طور پر انجام پذیر ہو سکتا ہے۔ اُس کو کچھ معلوم نہیں ہے کہ جذبات طبیعت کی کیا کیفیت ہے؟ کس ترتیب سے وہ نشو و نما پاتے ہیں؟ اِن کے فرائض و افعال کیا ہیں؟ اُن کا ٹھیک استعمال کہاں ختم ہوتا ہے۔ اور بُرا استعمال کہاں سے شروع ہو جاتا ہے؟ وہ یہ خیال کرتی ہے کہ بعض جذبات سراسر خراب ہیں۔ حالانکہ یہ بات اُن میں سے کسی ایک کی نسبت بھی صحیح نہیں ہے اور بعض جذبات اچھے ہیں۔ خواہ کتنی ہی دور تک اُن کو پہنچا دیا جائے۔ حالانکہ یہ بات بھی کسی جذبہ کی نسبت درست نہیں ہے۔ پھر جس طرح وہ اُس جسم کی ساخت سے ناواقف ہے۔ جس سے اُس کو کام پڑتا ہے۔ بالکل اسی طرح اُن اثرات سے بھی بے بہرہ ہے۔ جو خاص خاص علاج معالجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اُن آفت ناک نتائج

سے بڑھ کر جن کو ہر گھڑی پیدا ہوتے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ قطعی و یقینی بات اور کیا ہو سکتی ہے ؟ چوں کہ وہ اس علم سے بالکل عاری ہے کہ نفس ناطقہ کے قدرتی مظاہر کیوں کر ظاہر ہوتے ہیں۔ اور ان کے اسباب و نتائج سے بھی بے خبر ہے۔ اس لیے اس کی دست اندازی اکثر اوقات زیادہ مضر ہوتی ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ اس قسم کے دخل در معقولات سے بالکل علیحدہ رہتی۔ بچے کے ہر ایک فعل کو جو بالکل باقاعدہ اور مفید ہے وہ ہمیشہ روکتی ہے اور اس طرح سے بچے کی خوشی اور فائدہ کو گھٹاتی ہے۔ اپنے اور اس کے مزاج کو نقصان پہنچاتی ہے۔ اور باہمی تنفر و بے گانگی پیدا کرتی ہے۔ جن کاموں کو تقویت دینی منا سب سمجھتی ہے۔ ان کو دھمکی یا رشوت سے۔ یا تحسین و آفرین کی خواہش کو بھڑکا کر پورا کرتی ہے۔ اور جب تک بچے کا ظاہری رویہ درست ہے۔ اس وقت تک اس بات کا خیال نہیں کرتی کہ اندرونی محرک کیا ہے۔ پس اس قسم کی تربیت سے بجائے نیک خیالات کے ریاکاری۔ خوف اور خود غرضی بچے کی طبیعت میں پیدا ہو جاتی ہے۔ سچ بولنے کی تاکید کرتے وقت وہ ہمیشہ جھوٹ کا نمونہ بچے کے سامنے اس طرح پیش کرتی ہے۔ کہ طرح طرح کی سزاؤں سے اس کو ڈراتی اور دھمکاتی ہے۔ مگر سزا کبھی نہیں دیتی۔ ضبط نفس کی تاکید کرتے وقت اپنے چھوٹے بچوں کو غصہ سے ہر گھڑی ایسے کاموں پر ڈانٹ ڈپٹ بتاتی ہے جو اس کے مستحق نہیں ہیں۔ یہ بات کبھی اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آتی کہ دنیا کی طرح۔ دایہ خانہ میں بھی۔ وہی تربیت درحقیقت فائدہ مند ہے۔ جس میں تمام نیک و بد کاموں پر قدرتی جزا و سزا دی جائے۔ یعنی ایسی جزا و سزا۔ جس سے وہی راحت یا رنج حاصل ہو۔ جو بہ حیثیت کذائی ایسے کاموں سے حاصل ہونا چاہیئے۔ چوں کہ وہ علمی ہدایت سے بالکل عاری ہے۔ اور ہر گز اس

لائق نہیں کہ اپنے بچوں کے روحانی افعال کا کھوج لگا کر اپنے نفس کی بطور خود ہدایت کر سکے۔ اِس لیے جو بات بے سوچے سمجھے یکایک اُس کے ذہن میں آ گئی وہی اُس کا قانون ہے۔ جو بچوں کی حالت کے نامناسب اور مضرت بخش ہوتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر تو خیز طبیعتوں کا رجحان جو تمام چھوٹے موٹے اثروں پر اکثر غالب آ جاتا ہے۔ قوم کے خلاقی رنگ کو اختیار کر لینے کی طرف۔ بدرجہ غایت مائل نہ ہوتا۔ تو یہ "قانون" عموماً بچوں کی بربادی اور تباہی کا باعث ہوتا۔

عقلی تربیت کے حوالے سے والدین اور معلموں کی ناواقفیت اور اُس کے مضر نتائج

اب عقلی تربیت پر غور کرو۔ کیا اس کا انتظام بھی ایسا ہی خراب نہیں ہے؟ مان لو کہ عقل کا ظہور خاص قوانین کے موافق ہوتا ہے۔ مان لو کہ بچے کی عقل کی ترقی بھی خاص قوانین کے موافق ہوتی ہے۔ اور اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ اِن قوانین کی واقفیت کے بغیر ٹھیک ٹھیک تعلیم و تربیت نہیں ہو سکتی۔ یہ قیاس بیہودہ ہے کہ وہ تصوّرات کو ترتیب دے کر ذہن میں محفوظ رکھنے کا عمل" یعنی حصول علم کا باقاعدہ انتظام اِس علم کی ماہیت سمجھے بغیر ہو سکتا ہے۔ پس جیسی تعلیم ہونی چاہیے۔ اُس میں اور آج کل کی تعلیم میں۔ جب کہ والدین شاذ و نادر۔ اور بہت ہی کم معلم سائی کالوجی[1] سے واقف ہیں۔ کس قدر زمین آسمان کا فرق ہے۔ غرض کہ تعلیم کا مقررہ انتظام۔ جیسا کہ حالت موجودہ میں اُمید کی جا سکتی ہے۔ کیا بہ لحاظ مضمون اور بہ لحاظ طرز کے نہایت ناقص اور قابل افسوس ہے۔ حقیقی واقعات کی تعلیم سے روکا جاتا ہے۔ اور غلط واقعات کو غلط طریقہ۔ اور غلط ترتیب سے زبردستی دماغ میں بھر دیا جاتا ہے۔ تعلیم کے اُس عام محدود خیال کے موافق جو

[1] سائی کالوجی۔ جس کو عربی میں "علم النفس والقویٰ" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ وہ علم ہے جس میں نفس ناطقہ کی قوتوں اور اُس کے افعال سے عالمانہ اور باقاعدہ طور پر بحث کی جاتی ہے۔ مترجم۔

تعلیم کو کتابی علم تک محدود رکھتا ہے۔ والدین کئی سال پہلے ہی ابتدائی
کتابیں ننھے بچوں کے ہاتھوں میں زبردستی دے دیتے ہیں جس
سے اُن کو بڑا نقصان پہنچتا ہے۔ اس حقیقت کو نہ سمجھ کر کہ درکتابوں کا کام تعلیم کی تکمیل
ہے۔ کتابیں تحصیل علم کا بالواسطہ وسیلہ ہیں۔ جب کہ بلاواسطہ وسائل سے کام نہ
چل سکے۔ یعنی کتابیں دوسرے لوگوں کی مدد سے اُن چیزوں کے دیکھنے کا آلہ ہیں۔
جن کو ہم بطور خود نہیں دیکھ سکتے " معلم۔ مقدم اور ضروری باتوں کو چھوڑ کر دوسرے
درجہ کی اور کم ضروری باتیں بتانے کے شائق رہتے ہیں۔ اُس قدرتی تعلیم کی بے
اندازہ قدر و قیمت کو نہ پہچان کر۔ جو ابتدائی عمر میں حاصل ہوتی رہتی ہے۔ اِس بات
کو نہ سمجھ کر کہ وہ بچے کی بے چین قوتِ مشاہدہ کو نظر انداز کرنے یا روکنے کی بجائے۔
مستعدی سے اُس کو مدد دینی چاہیئے۔ اور جہاں تک ممکن ہو اُس قوت کو صحیح اور
کامل بنانا چاہیئے " وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اُس کی آنکھوں اور خیالات کو
ایسی چیزوں میں مصروف رکھا جائے۔ جو اُس زمانہ میں اُس کے لیے ناقابلِ فہم اور
سخت ناگوار ہوتی ہیں۔ چوں کہ اُن کے دل و دماغ پر اُس توہم نے قبضہ کر لیا ہے جس
کی وجہ سے خود علم کو چھوڑ کر علم کی تصویروں کی پرستش کی جاتی ہے۔ اس لیے وہ اِس
بات کو نہیں دیکھتے کہ جس وقت بچے کو گھر۔ بازار۔ اور کھیت کی چیزوں اور کاموں سے
ذرا زیادہ واقفیت حاصل ہو جائے۔ صرف اُس وقت معلومات کے نئے ذریعے جو
کتابوں سے حاصل ہوتے ہیں۔ اُس کے سامنے پیش کرنے چاہئیں۔ اور
یہ بات نہ صرف اِس وجہ سے اختیار کرنی چاہیئے کہ بلاواسطہ علم۔ بالواسطہ علم سے
بہت زیادہ قیمت رکھتا ہے۔ بلکہ اس وجہ سے بھی کہ اول ہی سے چیزوں کا
تجربہ جس قدر زیادہ ہوگا۔ اسی قدر صحت و درستی سے کتابی الفاظ کا مطلب۔ خیالات
میں ادا ہو سکے گا۔ اب غور کرو۔ کہ یہ رسمی تعلیم جو وقت سے بہت پہلے شروع

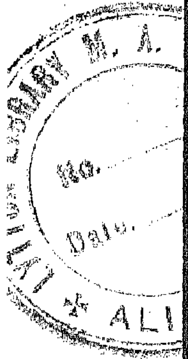
ہوجاتی ہے۔ اُس کو اس طرح جاری رکھا جاتا ہے۔ کہ عقلی نشو و نما کے قوانین کا بہت کم خیال کیا جاتا ہے۔ عقلی ترقی بالضرور مادیات سے مجردات تک یعنی آسان چیزوں سے شروع ہو کر مشکل چیزوں تک پہنچنی چاہیئے۔ مگر اس اصول سے قطع نظر کر کے۔ نہایت دقیق علوم۔ مثلاً صرف و نحو کی تعلیم جو بہت پیچھے ہونی چاہیئے۔ بالکل بچپن ہی میں شروع کرادی جاتی ہے۔ جغرافیہ مدنی جو بچے کے لیے مردہ اور بے لطف مضمون ہے۔ اور جس کو علم المعاشرت کا ایک تتمہ سمجھنا چاہیئے۔ اُس کی تعلیم تو قبل از وقت شروع کرادی جاتی ہے۔ مگر جغرافیہ طبیعی۔ جو بچے کی سمجھ میں آسکتا ہے۔ اور نسبتہً دلچسپ ہے اُس سے بہت کچھ چشم پوشی کی جاتی ہے۔ اور تقریباً ہر ایک مضمون تعلیم کی ترتیب بے اصول اور بے قاعدہ ہے۔ حدود۔ قواعد۔ اور اصول۔ بجائے اس کے کہ مثالوں سے اُن کی توضیح کی جائے جو کہ قدرتی ترتیب ہے۔ پہلے بتائے جاتے ہیں۔ پھر ان سب سے بڑھکر آفت بے سوچے سمجھے حفظ کر لینے کا زشت طریقہ ہے یعنی روح معنی کو حروف پر قربان کردینے کا طریقہ۔ اب اس کے نتائج پر غور کرو کچھ اس وجہ سے کہ ابتدائی روک ٹوک اور کتابوں پر زبردستی توجہ کرانے سے بچوں کی سمجھ بوجھ خلاف مقتضائے فطرت کند ہوجاتی ہے کچھ اس وجہ سے کہ بچوں کی طبیعت میں انتشار پیدا ہوجاتا ہے کیوں کہ جن مضمونوں کو وہ سمجھ نہیں سکتے۔ اُن کی تعلیم پہلے ہی شروع کرادی جاتی ہے اور ہر ایک مضمونوں میں اُصول کلیہ اُن واقعات سے پہلے ہی بتادئے جاتے ہیں۔ جن سے وہ اصول نکلتے ہیں کچھ اس وجہ سے کہ موجودہ طریقہ تعلیم طالب علم کو بالکل کاہل اور مجہول بنادیتا ہے۔ کہ دوسروں کے خیالات کو بیٹھا حاصل کیا کرے اور اُس کو ایسی ہدایت نہیں کرتا کہ خود تحقیقات کے لئے کھڑا ہو جائے اور اپنا معلم آپ ہو۔ اور کچھ اس وجہ سے کہ قوائے عقلیہ سے حد سے زیادہ کام لیا

جاتا ہے۔ ایسے شخص بہت ہی کم نکلتے ہیں جو کما حقہٗ لائق و فائق ہوں۔ ایک دفعہ امتحانات پاس کرنے کے بعد کتابوں کو اُٹھا کر بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ چوں کہ علم بے قاعدہ طور پر حاصل کیا جاتا ہے اُس کا بہت سا حصہ جلد حافظہ سے نکل جاتا ہے۔ جو کچھ باقی رہ جاتا ہے وہ زیادہ تر بے مصرف ہوتا ہے۔ کیوں کہ علم سے عملی کام لینے کے فن کو ترقی نہیں دی جاتی۔ اور صحیح مشاہدہ یا آزادانہ غور و فکر کی قوت بہت ہی کم حاصل ہوتی ہے۔ ان تمام باتوں کے علاوہ۔ علم حاصل کردہ کا بہت سا حصہ نسبتاً کم وقعت ہوتا ہے اور معلومات کے اُس وسیع ذخیرہ کو جس کی قدر و قیمت نہایت ہی اعلیٰ درجہ کی ہے۔ بالکل پسِ پُشت ڈال دیا جاتا ہے۔

جسمانی۔ اخلاقی اور عقلی تعلیم کا نہایت ناقص ہونا اور والدین کو اس کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت۔

پس ہم دیکھتے ہیں کہ یہ نتائج برہانِ لِمّی کے ذریعے سے حاصل ہو سکتے ہیں بچوں کی جسمانی۔ اخلاقی۔ اور عقلی تعلیم اِس درجہ ناقص ہے کہ اُس سے خوف معلوم ہوتا ہے۔ یہ بات زیادہ تر اِس وجہ سے ہے کہ والدین اُس علم سے بالکل کورے ہیں جس کی بدولت یہ تربیت ٹھیک ٹھیک ہو سکتی ہے۔ جب کسی نہایت ہی پیچیدہ مسئلہ کو ایسے لوگ حل کرنے پر آمادہ ہوں۔ جنھوں نے اُن اصول پر شاید ہی کبھی دھیان کیا ہو۔ جن پر اُس مسئلہ کا حل منحصر ہے۔ تو ہم کیا خاک توقع رکھ سکتے ہیں؟ جوتا بنانے یا مکان تعمیر کرنے کے واسطے۔ جہاز یا انجن چلانے کے انتظام کے واسطے مدت تک کام سیکھنے اور شاگردی کرنے کی ضرورت ہے۔ پھر کیا انسان کی جسمانی اور روحانی قوتوں کی ترقی نسبتاً ایسا آسان کام ہے کہ ہر شخص بغیر کسی تیاری کے اُس کا اہتمام و انتظام کر سکتا ہے؟ اگرچہ بات نہیں ہے۔ اگرچہ کام۔ قدرت کے تمام کاموں میں سوائے ایک کے سب سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ اور اُس کو پوری طرح انجام دینا نہایت ہی مشکل ہے۔ تو کیا

ایسے کام کے واسطے کوئی بندوبست نہ کرنا دیوانگی نہیں ہے؟ بہتر ہے کہ آرائشی
اور نمائشی کاموں کو قربان کر دیا جائے - بہ نسبت اس بات کے کہ اس نہایت ہی
اہم تعلیم کو نظرانداز کیا جائے - جب باپ اُن غلط اصول پر عمل کر کے جن کو بغیر جانچ
پڑتال کے اُس نے اختیار کر لیا ہے - بیٹوں کو اپنے سے بیگانہ بنا لیتا ہے - اپنے
سخت برتاؤ سے اُن کو بغاوت پر آمادہ کر دیتا ہے - اُن کو تباہ و برباد اور اپنے تئیں حقیر و
مصیبت زدہ کر دیتا ہے - اُس وقت وہ اس بات پر غور کر سکتا ہے کہ علم اخلاق اور
آداب تمدن کا مطالعہ کرنا ضروری تھا - بلا سے ایسکلس[1] کا حال کچھ معلوم نہ ہوتا
تو نہ سہی - جب ماں اپنے پہلوٹی کے بچہ پر - جو لال بخار کے اثر سے ہلاک ہوا ہے
گریہ وزاری کرتی ہے - جب کہ شائد کسی صاف دل طبیب نے اُس کے ایمان کو پختہ
کر دیا ہے - کہ اگر بچہ کے قویٰ - کثرت مطالعہ سے ضعیف نہ ہو جاتے تو وہ بچ جاتا - جب
کردہ رنج اور پشیمانی دونوں تکلیفوں سے ملول اور اداس ہوتی ہے - اُس وقت اُس کو
اس بات سے کچھ تسلی نہیں ہو سکتی - کہ وہ ڈینٹی[2] کی اصل تصنیفات کو پڑھ
سکتی ہے -



تربیت اولاد کے لیے قوانین زندگی کی واقفیت لازم ہے - اور اس امر کی توضیح -

پس ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی کاروبار کے تیسرے بڑے حصہ (تربیت اولاد)
کا باقاعدہ انتظام کرنے کے لیے قوانین زندگی کا علم ایک ضروری چیز ہے - علم
فزیالوجی کے اصول اولیہ اور علم سائیکالوجی کے ابتدائی حقائق کی کسی قدر واقفیت
بچوں کی باقاعدہ پرورش اور تربیت کے واسطے لازمی ہے - کچھ شک نہیں کہ بہتیرے
آدمی اس بیان کو پڑھ کر ہنسینگے - اُن کے نزدیک یہ بات بیہودہ ہوگی کہ والدین سے عموماً

[1] ایسکلس - ایک قدیم یونانی شاعر کا نام ہے - جو غم انگیز نظمیں لکھنے کی وجہ سے مشہور ہے - سنہ ۵۲۵ قبل مسیح میں پیدا ہوا - اور سنہ ۴۵۶ قبل مسیح میں فوت ہوا - مترجم

[2] ڈینٹی - اٹلی کا ایک شاعر ہے - سنہ ۱۲۶۵ء میں پیدا اور سنہ ۱۳۲۱ء میں فوت ہوا - مترجم

ایسے دقیق مضامین کا علم حاصل کرنے کی توقع رکھی جائے۔ اگر ہم یہ تجویز پیش کرتے کہ سب ماں باپوں کو ان مضمونوں سے کامل واقفیت بہم پہنچانی چاہیئے۔ تو البتہ اس رائے کی بیہودگی صداقت ظاہر تھی۔ مگر ہم ایسا نہیں کرتے۔ صرف عام اصول مع اُن تمثیلوں کے جو اُن کے سمجھنے کے لیے درکار ہوں۔ کافی ہیں۔ اور ان اصول کی تعلیم تھوڑے سے عرصہ میں دی جاسکتی ہے۔ اگر عقلی اور مدلّل طور پر نہیں تو بطور گر کے۔ بلا دلیل ہی سہی۔ بہرحال کچھ ہو۔ واقعات مندرجہ ذیل میں کسی شخص کو اعتراض کی گنجائش نہیں ہے۔

(۱) بچوں کے نفس اور جسم کی ترقی خاص قوانین کی تابع ہے۔

(۲) جب تک والدین اُن قوانین کی کسی حد تک پابندی نہ کریں۔ بچوں کی موت یقینی ہے۔

(۳) جب تک اُن قوانین کی زیادہ تر پابندی نہ کی جائے سخت جسمانی اور عقلی نقائص کا پیدا ہو جانا لازمی نتیجہ ہے۔

(۴) جب اُن کی پوری پابندی کی جاتی ہے۔ تب جا کر پورا کمال حاصل ہوتا ہے۔

اب غور کرو کہ جو لوگ ایک نہ ایک دن ماں باپ بننے والے ہیں کیا اُن سب کو لازم نہیں ہے کہ ذرا شوق کے ساتھ ان قوانین کو سیکھنے کی کوشش کریں۔

فرائض تمدّن کی تعلیم مدرسوں میں صرف برائے نام دی جاتی ہے

فرائض والدین کو چھوڑ کر اب ہم کو فرائض تمدّن کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ یہاں ہم کو اس بات کی تحقیقات کی ضرورت ہے کہ کون سا علم انسان کو ان فرائض کے پورا کرنے کے قابل بناتا ہے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ جو علم ان فرائض کو ادا کرنے کے قابل بناتا ہے۔ اُس کو بالکل ہی نظرانداز کر دیا گیا ہے کیوں کہ ہمارے مدرسوں کے نصاب میں

بعض ایسے مضامین کی تعلیم داخل ہے جن کو ملکی اور مجلسی فرائض سے کم از کم برائے نام تعلق ہے - ان میں صرف تاریخ ایسا مضمون ہے جس کو خاص امتیاز حاصل ہے -

مگر جیسا کہ پہلے اشارۃً بیان کیا گیا ہے تاریخی معلومات جو عموماً حاصل ہوتی ہے ہدایت کے اعتبار سے تقریباً بے کار اور فضول ہوتی ہے - مدرسوں کی تاریخوں میں شاذونادر - اور مبسوط تاریخیں جو بڑے آدمیوں کے واسطے لکھی گئی ہیں - ان میں بہت کم ایسے واقعات درج ہوتے ہیں جن میں ملکی معاملات کے صحیح اصول کو صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہو - بادشاہوں کی سوانح عمریاں (اور ہمارے بچوں کو تاریخ کی تعلیم سے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا) علم تمدن پر بہت ہی کم روشنی ڈالتی ہیں - درباری سازشوں - منصوبوں - دست درازیوں اور جملہ اشخاص متعلقہ کے حالات کی واقفیت قومی ترقی کے اسباب کی توضیح میں بہت کم مدد دیتی ہے - تاریخوں میں ہم عموماً اس قسم کی [illegible] ہیں کہ فلاں خرخشہ - اقتدار و تسلط کی غرض سے پیش آیا - دونوں طرف [illegible]ن جنگ میں خوب جم کر لڑیں - سپہ سالاروں اور اُن کے بڑے بڑے [illegible]یہ نام تھے - ہر ایک کے پاس اتنے ہزار سوار اور پیادے اور اتنی [illegible]ن اس اس ترتیب سے اُنہوں نے اپنی فوجوں کو میدان جنگ میں [illegible]ا کیا تھا - فلاں فلاں طریق سے اُنہوں نے حکمت عملی سے کام لیا - حملہ کیا [illegible]ئے - دن کے فلاں حصے میں فلاں مصیبتیں پیش آئیں - اور فلاں [illegible]یہ یہ فائدے حاصل ہوئے - ایک خاص وقت میں فلاں مشہور سردار [illegible]ا اور موقع پر کسی خاص رجمنٹ کا دسواں حصہ ضائع ہو گیا - لڑائی کی قسمت [illegible]نقلابات کے بعد فلاں فوج فتح یاب ہوئی - اور ہر طرف سے اتنے آدمی مجروح ہوئے - اور اس قدر آدمیوں کو فتح مندوں نے گرفتار کیا - اب بتاؤ کہ

معمولی علم تاریخ جو مدرسوں میں پڑھایا جاتا ہے محض ناکارہ اور ہیچ ہے -

اس واقعہ کی ذرا ذرا سی باتیں جو جمع کی گئی ہیں۔ اِن میں سے کون سی بات تمدّنی حیثیت سے تم کو اپنے چال چلن کا فیصلہ کرنے میں مدد دیتی ہے؟ بالفرض تم نے نہ صرف "دُنیا کی فیصلہ کن پندرہ لڑائیاں" بلکہ اُن تمام لڑائیوں کا حال پڑھ لیا۔ جو تاریخ میں مذکور ہیں۔ بھلا اس علم سے (پارلیمنٹ کے) آیندہ انتخاب کے موقع پر تمہاری رائے میں کیا وقعت پیدا ہو جائیگی؟ مگر تم کہتے ہو کہ "یہ واقعات ہیں۔ دلچسپ واقعات ہیں" بلاشبہ یہ واقعات ہیں (کم سے کم وہ حصہ جو کلاً یا جزواً۔ جھوٹ اور بناوٹ نہیں ہے) مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا۔ کہ وہ واقعات قابل قدر ہیں۔ مصنوعی اور فاسد رائے کی بدولت اکثر اوقات ناکارہ چیزوں کو ظاہری قدر و قیمت حاصل ہو جاتی ہے جس شخص کے دماغ میں گُل لالہ کا خبط سمایا ہوا ہو اگر اُس کو کسی نادر پھول کے برابر سونا تول دیا جائے۔ تو بھی اُس پھول کو اپنے پاس سے جدا نہیں کرے گا۔ ایک اور شخص پُرانی چینی کے ایک بدصورت ٹکڑے کو جس میں بال آگیا ہے۔ اپنے پاس رکھنا نہایت ہی ضروری سمجھتا ہے [illegible] میں ایسے آدمی بھی ہیں جو مشہور قاتلوں کی لاشوں یا اُن کی کسی یادگار کو گراں قیمت پر خرید کر بطور تبرک کے اپنے پاس رکھتے ہیں۔ اِس بات میں کس شخص کو کلام ہو سکتا ہے۔ کہ اِن چیزوں کا مذاق۔ جو خاص خاص شخص کی تفریح طبع کا باعث ہے۔ کچھ نہ کچھ مفید ہے؟ اگر اس میں کسی کو کلام نہیں ہے۔ تو یہ بات ضرور تسلیم کرنی چاہیئے کہ بعض قسم کے تاریخی واقعات کا مذاق اُن کی قدر و قیمت کا ثبوت نہیں ہے۔ اور جس کسوٹی پر دوسرے واقعات کی قیمت کو پرکھتے ہیں۔ اُسی کسوٹی پر اِن تاریخی واقعات کی قیمت کو بھی پرکھنا چاہیئے۔ یعنی یہ سوال کرنا چاہیئے کہ وہ کیا کام آسکتے ہیں؟ اگر کوئی شخص تم سے کہے کہ کل تمہارے پڑوسی کی بلّی نے بچّے دیئے ہیں۔ تو تم کہو گے کہ یہ اطلاع فضول ہے۔ اگرچہ یہ بھی ایک واقعہ ہے

مگر تم اس کو ایک فضول اور بے معنی واقعہ کہو گے - ایسا واقعہ جس کا اثر تمہاری زندگی
کے کاموں پر مطلق نہیں ہو سکتا - ایسا واقعہ جو کامل معاشرت کا علم حاصل کرنے میں
مدد نہیں دے سکتا - اچھا - اسی معیار کو تاریخی واقعات کے کثیر المقدار ذخیرے
پر عاید کرو - اور تم اسی نتیجہ پر پہنچ جاؤ گے - یہ ایسے واقعات ہیں کہ ان سے کوئی
نتایج حاصل نہیں ہو سکتے - یعنی واقعات غیر منضبط اور اسی وجہ سے چال چلن کے
اصول قایم کرنے میں - جو واقعات کا اصلی مقصد ہے کچھ کارآمد نہیں ہوتے - اگر
تم چاہو تو دل بہلانے کی خاطر ان کو پڑھ لو - مگر اپنے دل کو اس بات سے نہ پھسلاؤ
کہ یہ واقعات مفید ہیں -

تاریخی کتابوں میں کس کس قسم کے واقعات درج ہونے چاہئیں -

جس علم کو حقیقت میں تاریخ کہنا چاہیے - تاریخی کتابوں میں اس کو زیادہ تر
چھوڑ دیا جاتا ہے - اب اب کے مورخوں نے ذرا معتدبہ مقدار میں ایسے واقعات
درج کرنے شروع کیے ہیں جو حقیقت میں قیمتی اور مفید ہیں - جس طرح قدیم زمانے میں
بادشاہ ہی سب کچھ ہوتا تھا - اور رعیت ہیچ تھی - اسی طرح قدیم تواریخ کی تصویر بادشاہ
کے کارناموں ہی سے معمور ہوتی ہے - اور قومی زندگی اس تصویر کا محض ایک
وہ تاریک حصہ ہوتا ہے - جو گمنامی کی حالت میں پڑا رہتا ہے - آج کل کے زمانہ
میں جب کہ قومی بہبودی کا خیال بہ نسبت والیان سلطنت کی بہبودی کے زیادہ غالب
ہوتا جاتا ہے - مورخین نے مجلسی ترقی کے واقعات کی طرف توجہ کرنی شروع کی ہے
پس جس بات کا جاننا ضروریات سے ہے وہ قوم کی خصوصیات اور
عادات و اطوار کی تاریخ ہے - ہم کو ان تمام واقعات کی ضرورت ہے - جو اس
کے سمجھنے میں مدد دیتے ہیں - کہ قوم نے کس طرح ترقی کی - اور وہ کس طرح قوم
بن گئی ؟ بے شک ان واقعات کے ضمن میں ہم کو اس کی سلطنت کا حال بھی
معلوم کرنا چاہیے - اور جہاں تک ممکن ہو - اس میں ارکان سلطنت کے متعلق

ادھر اُدھر کی غپ شپ اور بے سر و پا باتیں کم ہونی چاہئیں - اور سلطنت کی بُنیاد اُس کے اصول و طریق - تعصبات - عمال کی بدذاتی و رشوت ستانی وغیرہ امور کا بیان جہاں تک ممکن ہو - زیادہ ہونا چاہیئے - اور اِس بیان میں صرف وسطی سلطنت کی ماہیت اور اوس کے کاموں کا تذکرہ نہ ہونا چاہیئے - بلکہ مقامی سلطنتوں - یہاں تک کہ اُن کی چھوٹی سے چھوٹی شاخوں کا بھی ذکر کرنا چاہیئے - اِس کے ساتھ ساتھ کلیسا کی حکومت کا بیان بھی ہونا چاہیئے - یعنی اُس کا نظم و نسق - اس کا چال چلن - اُس کا اقتدار - اور سلطنت کے ساتھ اُس کے تعلقات - اِس کے سوا - مذہبی رسوم عقاید - اور مذہبی خیالات - نہ صرف ایسے رسوم - اور خیالات جن کو لوگ برائے نام مانتے ہوں - بلکہ وہ بھی جن کو در اصل مانا جاتا ہے - اور جن پر عمل کیا جاتا ہو یہ سب باتیں بتانی چاہئیں - ساتھ ہی ہم کو اِس بات سے آگاہی ہونی چاہیئے کہ ایک جماعت کو دوسری جماعت پر کیا اقتدار حاصل تھا - جیسا کہ مجلسی آداب - القاب - تسلیمات اور طرز خطاب سے ظاہر ہوتا ہے - یہ بھی جاننا چاہیئے کہ اِن کے سوا اور کیا کیا دستور تھے - جو عوام الناس کی خانگی اور بیرونی طرز معاشرت میں رہنمائی کرتے تھے - مع اُن دستورات کے جو زن و مرد اور والدین و اولاد کے باہمی تعلقات سے متعلق ہیں - زیادہ مشہور افسانوں سے لے کر اُن معمولی افسوں اور ٹوٹکوں تک جو عام طور پر رایج ہوں - مذہبی توہمات بھی ظاہر کرنے چاہئیں - اِس کے بعد انتظام صنعت و حرفت کا ایک خاکہ کھینچنا چاہیئے - جس سے یہ بات ظاہر ہو جائے کہ محنت کی تقسیم کس حد تک کی گئی تھی ؟ تجارت کا انتظام کیسا تھا ؟ خاص خاص ذاتوں یا جماعتوں کے ذریعہ سے ہوتا تھا - یا اور کسی طرح ؟ آقا اور ملازم کے درمیان کس قسم کے تعلقات تھے ؟ تجارتی مال کی تقسیم کے ذرایع کیا تھے ؟ آمد و رفت کے وسائل کیا تھے ؟ لین دین میں کس قسم کے روپیہ کا چلن تھا - اِن سب

باتوں کے ساتھ ہی فنون دست کاری کا حال بحیثیت فن - بیان کرنا چاہیئے -
اور مصنوعات کی صفت و نوعیت کا ذکر کرنا چاہیئے - اس کے علاوہ قوم کے مختلف
درجوں کی عقلی حالت کی تصویر اتارنی چاہیئے - اس میں صرف یہی بیان نہ ہونا چاہیئے
کہ کس قسم کی اور کس قدر تعلیم دی جاتی تھی - بلکہ یہ بھی بتانا چاہیئے - کہ اس زمانہ میں سائنس
میں کس قدر ترقی ہوئی تھی - اور لوگوں کا طرز خیال بالعموم کس قسم کا تھا؟ یہ بھی ذکر کرنا چاہیئے
کہ علم حسن کی تربیت جو فن تعمیر - بت تراشی - مصوری - لباس - موسیقی - شاعری
اور افسانہ نگاری سے ظاہر ہوتی ہے - کس درجہ تک ہوئی تھی ؟ لوگوں کی روزانہ
معاشرت - اُن کی خوراک - مکان - اور تفریح طبع کے سامان کا تذکرہ بھی نظر انداز
نہیں کرنا چاہیئے - اور ان سب باتوں کے سلسلہ میں کل جماعتوں کے خیالی اور
عملی آداب و اخلاق دکھانے چاہئیں - جو اُن کے قوانین - عادات ضرب الامثال
اور دیگر افعال سے ظاہر ہوتے ہیں - ان واقعات کو اس قدر اختصار کے ساتھ - جو
صحت و صفائی بیان میں خلل انداز نہ ہو - بیان کرنا چاہیئے - اور اُن کو اس طرح ترتیب
وار جمع کرنا چاہیئے - کہ وہ بحیثیت مجموعی سمجھ میں آ سکیں اور ایسے معلوم ہوں کہ گویا ایک
بڑی کل کے اجزا ہیں اور قدرتی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں - مقصد
یہ ہونا چاہیئے کہ اُن کو اس طرح پیش کیا جائے کہ لوگ اُن کی باہمی مناسبت کا جلدی
سے کھوج لگا سکیں - تاکہ اُن کو معلوم ہو جائے کہ کون کون سے تمدنی واقعات لازم
و ملزوم ہیں - اور پھر قرون مابعد کے واقعات کا نقشہ بھی اسی طرح کھینچ کر ایسا بندوبست کرنا
چاہیئے جس سے صاف ظاہر ہو جائے کہ ہر ایک اعتقاد - آئین - رسم و رواج - اور انتظام
میں کس طرح تبدیلی واقع ہوئی - تمدن کے پہلے ڈھانچ اور افعال کی مناسبت نے
ترقی کر کے پچھلے ڈھانچ اور افعال کی مناسبت کی شکل کیوں کر اختیار کی - زمانہ سلف
کے متعلق یہی معلومات اس قسم کی ہے - جو ایک باشندۂ شہر کو اپنے چال چلن

کی ہدایت کے لیے مفید ہو سکتی ہے۔ عملی قدر و قیمت صرف اُسی تاریخ کی ہے
جس میں علم المعاشرت کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہو۔ اور مورّخ کا سب
سے اعلیٰ فرض یہ ہے کہ قوموں کی سوانح عمری اس طرح بیان کرے کہ
اُن کی تمدّنی معاشرت کے باہمی مقابلہ کا سامان بہم پہنچ سکے۔ تاکہ آئندہ
کے واسطے اُن قطعی قوانین کا تصفیہ ہو جائے۔ جن کے مطابق تمدّنی واقعات
پیش آتے ہیں۔

تاریخ کی کنجی سائنس ہے

اب غور کرو کہ بالفرض اس واقعی مفید تاریخی معلومات کا ایک کافی ذخیرہ
حاصل کر بھی لیا جائے۔ تو جب تک اُس کی کنجی موجود نہ ہو وہ نسبتہً کم فائدہ مند ہوتا ہے
اور اُس کی کنجی صرف سائنس ہے۔ اگر بیالوجی اور سائی کالوجی کے اصول کافیہ
موجود نہ ہوں۔ تو اُمور معاشرت کی معقول تشریح محال ہے۔ فطرت انسانی کے متعلق
اناڑیوں کی طرح جس قدر تھوڑے بہت عملی نتیجے لوگ حاصل کر لیتے ہیں سہل
ترین واقعات تمدن کو بھی اُسی قدر سمجھ سکتے ہیں۔ مثلاً کسی شے کے ذخیرہ اور مانگ
کا باہمی تعلّق۔ پس جب کہ علم المعاشرت کی نہایت ہی ابتدائی باتیں بھی اُس وقت
تک حاصل نہیں ہو سکتیں۔ جب تک اس بات کا کسی قدر علم نہ ہو کہ لوگوں کا خیال
احساس اور فعل خاص خاص صورتوں میں عموماً کس طرح عمل کرتا ہے۔ تو یہ بات صاف
ظاہر ہے کہ علم المعاشرت کا وسیع علم تو اُس وقت تک حاصل ہی نہیں ہو سکتا
جب تک کہ انسان اور اُس کی کل جسمانی اور عقلی قوتوں سے کافی واقفیت نہ ہو۔ اگر
اس امر پر مجرّد عقلی حیثیت سے غور کی جائے تو نتیجہ بالکل بدیہی ہے مثلاً

(۱) قوم۔ افراد کا مجموعہ ہے۔ جو کچھ قوم میں ہوتا ہے۔ افراد کے مشترک افعال سے ہوتا ہے
اسی وجہ سے قومی امور کا عقدہ صرف افراد کے افعال سے حل ہوتا ہے۔ مگر افراد کے
افعال اُن کی فطرت کے قوانین پر منحصر ہیں۔ اور جب تک اِن قوانین کو نہ سمجھ لیں۔

اُن کے افعال سمجھ میں نہیں آسکتے۔ جب اِن قوانین کو سیدھی سادی عبارت میں بیان کیا جائے۔ تو یہ بات ثابت ہوجائیگی کہ وہ عموماً جسم اور نفس ناطقہ کے قوانین کا حاصل ہیں۔ پس اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیالوجی اور سائکالوجی علم المعاشرت کی توضیح و تشریح کے لیے نہایت ضروری ہیں"

یا اگر اِن نتایج کو اور بھی زیادہ سیدھی سادی طرح بیان کیا جائے تو یوں کہیں گے:۔

"تمام مجلسی واقعات زندگی کے واقعات ہیں۔ زندگی کے نہایت پیچیدہ مظاہر ہیں ضرور ہے کہ یہ واقعات قوانین زندگی کے موافق ہوں۔ اور وہ صرف اُس وقت سمجھ میں آسکتے ہیں۔ جب کہ زندگی کے قوانین سمجھ میں آجائیں"

پس انسانی کاروبار کے اِس چوتھے حصّے کا انتظام بھی پہلے حصوں کی طرح سائنس ہی پر منحصر ہے۔ تعلیمی نصاب میں عام طور پر جس علم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اُس کا بہت تھوڑا حصّہ امور معاشرت میں کسی شخص کی رہنمائی کے لیے کارآمد ہوسکتا ہے۔ صرف تاریخ کا تھوڑا سا حصّہ جو وہ پڑھتا ہے عملی قدر و قیمت رکھتا ہے۔ مگر وہ اُس تھوڑے سے حصّہ کو بھی مناسب طور پر استعمال کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ وہ نہ صرف اُس مواد کا محتاج ہے۔ جو تمدنی معاشرت کے لیے ضروری ہے بلکہ اس علم کا تصور بھی اُس کے ذہن میں نہیں ہوتا اور اُن علوم کے نتایج سے بھی بے بہرہ ہوتا ہے۔ جو دیگر علوم کے لیے بمنزلہ آلہ کے ہیں۔ اور جن کے بغیر علم معاشرت سے بھی چنداں مدد نہیں مل سکتی۔

تفریح طبع اور تربیت مذاق کی عظمت و ضرورت۔

اب ہم انسانی زندگی کے باقی ماندہ حصّے کی طرف آتے ہیں جس میں وقت فرصت کی تفریح اور آرام و آسایش شامل ہیں۔ اِس بات پر غور کرنے کے

بعد کہ وہ حفاظتِ نفس۔ حصولِ معاش۔ ادائے فرائض والدین۔ اور مجلسی و ملکی طرزِ عمل کا باقاعدہ انتظام کرنے کے لیے کس قسم کی تربیت سب سے زیادہ لایق بناتی ہے"۔ اب ہم کو اس بات پر غور کرنی چاہیے کہ ان متفرق مقاصد کے لیے جو ان میں داخل نہیں ہیں۔ یعنی موجوداتِ۔ قدرت۔ علم ادب اور ہر قسم کے فنون لطیفہ سے حظ اُٹھانے کی غرض سے کون سی تربیت نہایت عمدہ طور پر لایق بناتی ہے۔ جن کاموں کا تعلق انسانی بہبودی کے ساتھ زیادہ قوی ہے چوں کہ ہمنے اُن کاموں کے بعد۔ حظِ نفس کے کاموں کو رکھا ہے۔ اور ہر ایک چیز کو اُس کی اصلی اور واقعی قیمت کے معیار پر رکھا ہے۔ اس سے شاید کوئی شخص یہ نتیجہ نکالے۔ کہ ہم ان کم ضروری کاموں کو خفیف سمجھنے پر مائل ہیں۔ مگر اس سے زیادہ کوئی غلطی نہیں ہو سکتی۔ علم حسن کی تربیت اور اوس کا لطف اوٹھانا ہمارے نزدیک اس کی قدر و قیمت کچھ کم نہیں ہے۔ مصوّری۔ بت تراشی موسیقی۔ شاعری کے بغیر اور ہر قسم کے قدرتی حسن سے جو جذبات طبیعت میں پیدا ہوتے ہیں۔ اُن کے بغیر زندگی کا آدھا لطف جاتا رہتا۔ مذاق کی تربیت اور اُس سے لطف اُٹھانے کو غیر ضروری سمجھنا تو کجا۔ ہم کو یقین ہے۔ کہ آج کل کی نسبت آیندہ زمانہ میں انسانی زندگی کا زیادہ تر حصّہ اُس میں صرف ہوا کرے گا۔ جب قدرت کی قوتیں انسان کے فائدہ کے لیے پوری طرح مسخّر ہو جائیں گی۔ جب پیداوار کے وسائل کمال کے درجہ پر پہنچ جائینگے۔ جب محنت میں انتہا درجہ کی کفایت ہو جائے گی۔ جب تعلیم کا ایسا انتظام ہو جائے گا۔ کہ زیادہ ضروری کاموں کی تیاری نسبتہً سرعت کے ساتھ ہو سکے گی۔ اور اسی وجہ سے جب لوگوں کو بہت زیادہ فرصت ملنے لگیگی۔ اُس وقت قدرت۔ اور صنعت انسانی کے حسن سے لطف اُٹھانے کا خیال سب کے دلوں میں بہت زیادہ پیدا ہو جائیگا۔

علم حسن کی تربیت اور مشاغل تفریح کا اعلیٰ درجہ کیا ہے؟

مگر اس امر کو قبول کرنا کہ علم حسن کی تربیت انسانی خوشی میں بہت کچھ ممد و معاون ہے - ایک بات ہے - اور اس امر کو تسلیم کرنا کہ وہ انسانی خوشی کی ایک لازمی شرط ہی دوسری بات ہے - یہ تربیت کیسی ہی ضروری کیوں نہ ہو - تاہم تربیت کی اُن قسموں کو جو روزانہ فرائض سے براہ راست تعلق رکھتی ہیں - اس تربیت پر ضرور فوقیت حاصل ہونی چاہیئے - علم ادب اور فنون لطیفہ کا وجود جیسا کہ ہم پہلے اشارۃً بیان کر چکے ہیں اُن کاموں پر منحصر ہے - جن کی وجہ سے شخصی اور مجلسی زندگی وجود پذیر ہوتی ہے اور یہ بات صاف ظاہر ہے کہ جس چیز کا وجود کسی دوسری چیز پر منحصر ہوتا ہے - وہ اُس دوسری چیز سے ضرور متاخر ہوتی ہے - جس پر اُس کا وجود منحصر ہے - باغبان پھول کی خاطر پودا لگاتا ہے - اور جڑ اور پتوں کی قدر خاص کر اس وجہ سے کرتا ہے کہ وہ پھول کے پیدا کرنے کا ذریعہ ہیں - اگرچہ اصل مقصد پھول کی پیداوار سے ہے - اور پھول ایسی چیز ہے - کہ باقی سب چیزیں اُس کی تابع ہیں - مگر باغبان سمجھتا ہے کہ جڑ اور پتے بذات خود پھول سے بھی زیادہ ضروری ہیں - کیوں کہ پھول کا نشوونما اُن ہی پر منحصر ہے - وہ تندرست پودے کی پرورش میں نہایت احتیاط کرتا ہے - اور جانتا ہے کہ اگر پھول حاصل کرنے کے خیال میں پودے سے غفلت کی جائے - تو یہ بات نادانی ہے - معاملہ زیر بحث میں بھی یہی صورت ہے فن تعمیر - بت تراشی - مصوّری - موسیقی - اور شاعری کو درحقیقت تمدّنی معاشرت کے پھول سے تعبیر کرسکتے ہیں - اگر ہم فرض بھی کرلیں کہ یہ فن اعلیٰ درجہ کی قدر و قیمت رکھتے ہیں - یہاں تک کہ جس تمدّنی معاشرت کی بدولت پیدا ہوئے ہیں - خود اُس معاشرت ہی پر غالب آجائیں (اور شاید کوئی شخص ایسی بات کہہ سکے) - تاہم یہ بات ماننی پڑیگی کہ صحت بخش تمدّنی معاشرت کا حاصل کرنا سب سے مقدم خیال ہونا چاہیئے اور جو تربیت اس میں ممد و معاون ہو - اس کا درجہ سب سے اعلیٰ

ہونا چاہیئے۔

موجودہ نظام تعلیم کا ایک بڑا نقص۔

اور یہاں ہم کو اپنے نظام تعلیم کا نقص صاف طور پر نظر آتا ہے وہ پھول کی خاطر پودے سے غفلت کرتا ہے۔ نفاست و لطافت کے خیال میں وہ اصل شے کو بھول جاتا ہے۔ مروجہ نظام تعلیم۔ اُس علم کی بالکل تعلیم نہیں دیتا جو حفاظت نفس میں مدد و معاون ہے۔ جس علم سے حصول معاش میں سہولت پیدا ہوتی ہے۔ اُس کے محض ابتدائی اصول بتا دیتا ہے اور اُس کے بڑے حصّہ کو چھوڑ دیتا ہے۔ تاکہ ہر شخص اپنی آیندہ زندگی میں جس طرح چاہیئے اُس کو حاصل کرے فرائض والدین کے ادا کرنے کے لیے مطلق بندوبست نہیں کرتا۔ اور فرائض تمدّن کے لیے واقعات کا ایک ذخیرہ مہیا کر دیتا ہے جن میں سے اکثر واقعات تو غیر متعلق ہوتے ہیں۔ اور باقی ماندہ واقعات کی کنجی اُس کے پاس نہیں ہوتی (ان ضروری باتوں سے تو یہ غفلت!) مگر جس بات میں زیب و زینت ٹیپ ٹاپ۔ اور نام و نمود ہو اُس کی تعلیم میں سرگرمی ظاہر کرتا ہے۔ اگرچہ ہم اس بات کو پوری طرح تسلیم کرلیں کہ زمانہ حال کی زبانوں کی وسیع واقفیت ایک قابل قدر وصف ہے۔ جو مطالعہ۔ گفت و گو۔ اور سفر کے ذریعہ سے ایک طرح کا کمال پیدا کرنے میں مدد دیتا ہے۔ تاہم یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ نہایت ضروری علم کو کھو کر اِس وصف کا حاصل کرنا مناسب ہے۔ اگر ہم اِس بات کو صحیح فرض کرلیں کہ علم ادب اور السنہ قدیمہ کی تعلیم۔ انشاپردازی کی لطافت و نفاست اور صحت و درستی میں مدد دیتی ہے۔ تب بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ عظمت و ضرورت کے لحاظ سے انشاپردازی کی خوبی کو اصول تربیت اولاد کی واقفیت سے کچھ نسبت نہیں ہے۔ مان لو کہ کسی مردہ زبان میں لکھی ہوئی نظم کے پڑھنے سے مذاق کو ترقی ہوتی ہے تاہم اِس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ مذاق کی ترقی قدر و قیمت

میں قوانین صحت کی واقفیت کے برابر ہے - ہنرمندی و خوش سلیقگی - فنون
لطیفہ - علم فصاحت و بلاغت - شاعری - اور وہ تمام فنون جن کو ہم تمدن کے
پھول سے تعبیر کرسکتے ہیں - بالکل اُس تعلیم و تربیت کے تابع رہنے چاہئیں
جس پر تمدن کی بنیاد ہے جس طرح زندگی کا زمانۂ فرصت اِن کاموں میں
صرف ہوتا ہے - اُسی طرح تعلیم کا زمانۂ فرصت اُن میں صرف ہونا
چاہیئے -

علم حسن اور مشاغل تفریح کے لیے بھی سائنس کی ضرورت ہے -

علم حُسن کے اصلی درجہ کو اس طرح سے تسلیم کرنے اور یہ بات قرار دینے کے
بعد کہ گو اس قسم کی تربیت شروع ہی سے تعلیم کا جزو ہونی چاہیئے - تاہم یہ تربیت
بالاستقلال نہیں - بلکہ اس حیثیت سے ہونی چاہیئے کہ دوسرے علوم میں ممد و
معاون ہو - اب ہم کو یہ دریافت کرنا ہے کہ اِس مقصد کے لیے کون سا علم سب
سے زیادہ کارآمد ہے ؟ زندگی کے اس باقی ماندہ شغل کے واسطے کون سا علم
سب سے زیادہ مناسب ہے ؟ اس سوال کا جواب بھی وہی ہے جو اس سے پہلے
دیا جا چکا ہے - گو یہ بیان خلاف توقع ہو - مگر ہے صحیح - کہ ہر ایک اعلیٰ درجہ کا
فن - سائنس پر مبنی ہے - بغیر سائنس کے نہ تو کامل پیداوار ہو سکتی ہے -
اور نہ اُس کی پوری قدر ہی ہو سکتی ہے - ممکن ہے کہ بہت سے اعلیٰ درجہ کے مشہور
صنّاعوں کو سائنس کی واقفیت باعتبار اُن محدود اصطلاحی معنوں کے نہ ہو
جو عام طور پر لوگوں میں مشہور ہیں - مگر چوں کہ یہ صنّاع دقیق نظر سے مشاہدہ کرنے والے
ہوتے ہیں - اِس لیے اُن عملی نتائج عامّہ کا ذخیرہ ہمیشہ اُن کے قبضہ میں رہتا ہے
جو ادنیٰ درجہ کا سائنس ہے اور وہ عادۃً درجہ کمال سے بہت گرے ہوئے رہتے
ہیں - اس کی وجہ کسی قدر یہ ہے کہ اُن کے تجربوں کے نتیجے قلیل اور نادرست
ہوتے ہیں - یہ بات کہ سائنس بالضرور فنون لطیفہ کی بنیاد ہے برہان لمّی

کے ذریعہ سے ثابت ہے۔ جب کہ ہم اس بات کو یاد رکھیں کہ تمام مصنوعی چیزیں صوری و معنوی مظاہر قدرت کی شبیہ ہوتی ہیں۔ اور یہ چیزیں جس قدر ان مظاہر قدرت کے قوانین کے موافق ہوں۔ اُسی قدر عمدہ ہوتی ہیں۔ ہم کو ابھی معلوم ہو جائیگا کہ یہ نتیجہ جو برہان لمی سے ثابت ہے۔ تجربہ کے مطابق ہے۔

فن بت تراشی کیلیے سائنس اور اصول جر ثقیل کی واقفیت درکار ہے

جو نوجوان بت تراشی کے پیشہ کے لیے تیاری کرتے ہیں۔ اُن کو انسانی پنجر کے رگ پٹھوں۔ اُن کی تقسیم۔ اُن کے باہمی تعلق۔ اور اُن کی حرکات سے ضرور واقفیت پیدا کرنی چاہیئے۔ یہ سائنس کا ایک حصہ ہے۔ اور اُس کا حاصل کرنا اُن بہت سی غلطیوں کے روکنے کے واسطے ضروری ہے۔ جو اس علم کے نہ جاننے والے بت تراش کر سکتے ہیں۔ اصول جر ثقیل کا علم بھی ضروری ہے اور چونکہ بت تراش عموماً اس علم سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اس لیے جر ثقیل کے متعلق اکثر اوقات غلطیاں کرتے ہیں۔ اس بات کو ایک مثال کے ذریعہ سے سمجھ لو۔ تصویر کے استحکام کے لیے ضرور ہے کہ مرکز ثقیل سے جو عمود ڈالا جائے جس کو خط السمت کہتے ہیں۔ عماد کے قاعدہ کے اندر واقع ہو۔ اور اسی وجہ سے ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص اُس حالت میں کھڑا ہوتا ہے جو قیام الراحت[1] کے نام سے مشہور ہے۔ جس میں ایک ٹانگ سیدھی تنی رہتی ہے۔ اور دوسری ذرا ڈھیلی اور خم کھائے ہوئے ہوتی ہے۔ خط السمت سیدھی تنی ہوئی ٹانگ کے پاؤں کے اندر واقع ہوتا ہے۔ مگر جو بت تراش مسئلہ توازن[2] سے ناواقف ہیں۔ وہ حالت قیام کی اس وضع کو عموماً اس طرح ظاہر کرتے ہیں کہ خط السمت

---

[1] یہ ترجمہ ہے۔ سٹینڈنگ ایٹ ایز Standing at ease کا قواعد کے وقت سپاہیوں کے کھڑے ہونے کی ایک خاص وضع کا نام ہے۔ مترجم۔

[2] توازن ترجمہ ہے ایکوی لبریم Equilibrium کا یعنی ہر طرف وزن کا برابر تلا رہنا۔ مترجم۔

دونوں پاؤں کے بیچ میں واقع ہوتا ہے۔ متحرک شئے کی قوت کے قانون کی ناواقفیت سے بھی اِس قسم کی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔ مثلاً ڈسکابولس[۵۱] کی مورت پر غور کرو جس کو لوگ حیرت سے دیکھتے ہیں۔ اِس مورت کو جبکہ وہ اپنی جگہہ پر قایم ہے۔ ہاتھ سے پتھر چھوٹنے کے ساتھہ ہی آگے کی طرف لامحالہ جھک جانا چاہیئے۔

فنِ مصوری میں سائنس کی درحقیقت نہایت ہی ضرورت ہے

مصوری میں سائنس کی واقفیت کی ضرورت۔ اگر عقلی واقفیت نہ ہو تو عملی ہی سہی۔ اور بھی زیادہ نمایاں طور پر ظاہر ہے۔ اہلِ چین کی تصویریں بے ڈول اور بے ہنگم کیوں ہوتی ہیں؟ اس کی وجہ یہی ہے کہ مصوّر۔ صورتوں کے قوانین کا بالکل لحاظ نہیں رکھتے۔ تصویر اُتارتے وقت مختلف چیزوں کے فاصلوں اور اُن کی چھٹائی بڑائی کا خیال واجبی طور پر نہیں رکھتے۔ اور تصویر کے روشن اور تاریک حصّہ کو باقاعدہ رنگ و روغن لگانے کے اصول سے ناواقف ہوتے ہیں۔ بچّے کی بنائی ہوئی تصویروں میں اور کیا عیب ہوتا ہے سوائے اس کے کہ اسی طرح اُن میں بھی اصلیّت نہیں ہوتی۔ تصویر میں اصلیّت کا موجود نہ ہونا زیادہ تر اُس قاعدہ کی ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ جس کے موافق چیزوں کی صورتیں مختلف حالتوں میں مختلف ہوتی ہیں؟ ذرا اُن کتابوں اور لکچروں ہی کو یاد کرو۔ جن کے ذریعہ سے طلبہ کو تعلیم دی جاتی ہے یا رسکن[۵۲] کی تنقید پر غور کرو یا اُن تصویروں کو دیکھو جو اُس زمانے سے

۵۱ ڈسکابولس۔ اُس پہلوان کو کہتے ہیں۔ جو چکی کے پاٹ کی شکل کے گول بھاری پتھروں یا دھات کے ٹکڑوں کو طاقت آزمائی اور کسرت کے لیے پھینکتا ہے۔ قدیم زمانے کا ایک بُت بھی اسی نام سے مشہور ہے۔ جس کی تصویر اس طرح بنائی گئی تھی کہ اُسکے ہاتھ میں ایک بھاری قرص ہے اور وہ اُسکو پھینکنا چاہتا ہے اِس بُت کی کئی نقلیں یا تصویریں انگلستان میں موجود ہیں۔ مترجم

۵۲۔ جان رسکن۔ انگلستان کا باشندہ اور اُنیسویں صدی عیسوی کا ایک مشہور مصنف ہے۔ جس نے مختلف فنون اور خاص کر فنِ مصوری میں کتابیں لکھی ہیں۔ سنہ ۱۸۱۹ع میں پیدا ہوا تھا۔ مترجم

سے پہلے کی بنی ہوئی ہیں۔ جب کہ رافائیل[1] نے اپنے اصول مصوری کا رواج دیا تھا۔ اور تم کو معلوم ہو جائے گا کہ مصوری کی ترقی اُس علم کی ترقی پر دلالت کرتی ہے۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ قدرتی امور کے نتائج کس طرح پیدا ہوتے ہیں۔ کیسی ہی محنت اور مصروفیت سے کسی چیز کا مشاہدہ کیا جائے۔ اگر اُس مشاہدہ میں سائنس سے مدد نہ لی جائے۔ تو وہ غلطی سے نہیں بچا سکتا۔ ہر ایک مصور اِس بات کو تسلیم کرے گا کہ جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ خاص خاص حالتوں میں کون کون سی صورتیں پیدا ہونی چاہئیں۔ اُس وقت تک اُن صورتوں میں اکثر تمیز نہیں ہو سکتی اور اس امر کا معلوم کرنا کہ کون کون سی صورتیں پیدا ہونی چاہئیں بجائے خود صورتوں کے سائنس یا علم التصویر سے واقفیت پیدا کرنا ہے۔ مسٹر جے لوئس اگرچہ ہوشیار مصور ہے۔ مگر سائنس کی ناواقفیت کی وجہ سے تصویر بناتے وقت جالی دار کھڑکی کے سایہ کو سامنے کی دیوار پر صاف طور پر نمایاں لکیروں میں ظاہر کرتا ہے۔ اگر اُس کو سایہ کے قانون سے واقفیت ہوتی کہ سایہ روشنی کے ساتھ نامعلوم طور پر کس طرح مل جاتا ہے تو وہ ایسا نہ کرتا۔ مسٹر روزٹی یہ دیکھ کر کہ بعض بال دار سطحوں پر خاص قسم کی روشنی پڑنے سے روشنی کی شعاعیں خاص طرح کے رنگ پیدا کرتی ہیں۔ (یعنی بالوں میں سے گزرتے وقت روشنی کے انحراف و انتشار سے جو مختلف رنگ پیدا ہوتے ہیں) اس کی تصویر بنانے میں یہ غلطی کرتا ہے۔ کہ ان رنگوں کو ایسی سطحوں پر اور ایسی حالتوں میں ظاہر کرتا ہے جہاں وہ واقع نہیں ہو سکتے۔

فن موسیقی میں سائنس کی امداد درکار ہے

یہ کہنا کہ موسیقی میں بھی سائنس کی مدد درکار ہے۔ اور بھی زیادہ حیرت و استعجاب کا باعث ہوگا۔ تاہم یہ بات ثابت ہو سکتی ہے کہ موسیقی۔ جذبات کی قدرتی زبان کی ہو بہو تصویر ہے۔ اور اسی وجہ سے جہاں تک کہ موسیقی اِس قدرتی زبان کے

[1] رافائیل۔ اٹلی کا ایک مصور تھا۔ ۱۴۸۳ء میں پیدا ہوا تھا۔ اور ۱۵۲۰ء میں انتقال کیا۔ مترجم

موافق ہوگا۔ اسی قدر اچھا یا بُرا ہوگا۔ آواز کے طرح طرح کے اُتار چڑھاؤ جس سے
مختلف جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اور یہ جذبے اپنی کم و بیش سختی کے لحاظ سے
مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ یہی وہ بیج ہے جس سے علم موسیقی نے نشو و نما پایا ہے
یہ ثابت ہوسکتا ہے کہ آواز کا اُتار چڑھاؤ۔ اور سُر کا ہلکا یا مدھم ہونا۔ ایک اتفاقی اور
اندھا دُھند بات نہیں ہے بلکہ بعض عام اور قوی الاثر اصول پر منحصر ہے۔ اور اُس کا
معنی خیز اور با اثر ہونا اسی بات پر منحصر ہے۔ اِس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نغمہ کے اجزا اور
وہ لحن جو اُن سے پیدا ہوتا ہے صرف اُس وقت موثر ہوسکتے ہیں۔ جب کہ وہ اِن
عام اصول کے مطابق ہوں۔ یہاں اِس بات کی مناسب تشریح مشکل ہے۔ مگر شاید
مثال کے طور پر اُن کثیر التعداد ذلیل اور نکمّے گیتوں کا ذکر کر دینا کافی ہوگا۔ جو اپنے موذی
اثر سے محفلوں میں سامعین کے عیش کو منغّص کر دیتے ہیں۔ یہ راگ ایسی تصانیف
ہیں۔ جن کی سائنس ممانعت کرتا ہے۔ اِس قسم کے گیت سائنس کے گناہگار ہیں۔
اس وجہ سے کہ وہ علم موسیقی میں ایسے خیالات بہم پہنچاتے ہیں۔ جو جذبات طبیعت
کے اِس قدر موافق نہیں ہیں کہ اُن سے موسیقی کا مقصد حاصل ہوسکے۔ اور اِس
وجہ سے بھی سائنس کے گناہ گار ہیں کہ وہ ایسے اجزاء سے موسیقی کو استعمال کرتے
ہیں۔ جن کو اُن خیالات سے قدرتی تعلق نہیں ہے۔ جو اُن اجزا سے ظاہر ہوتے
ہیں۔ گو وہ خیالات جذبات طبیعت کے موافق ہوں۔ یہ گیت اس وجہ سے
خراب ہیں کہ اُن میں اصلیت نہیں ہے۔ اور یہ کہنا کہ اُن میں اصلیت نہیں ہے
یہی معنی رکھتا ہے کہ وہ سائنس کے خلاف ہیں۔

موسیقی کی طرح شاعری میں بھی قدرتی جذبات کا لحاظ رکھنا لازم ہے

شاعری پر بھی یہی بات صادق آتی ہے۔ موسیقی کی طرح شاعری کی جڑ بھی
قدرتی طرز بیان ہے۔ جو کہ تاثر سے پیدا ہوتا ہے۔ نظم کی باقاعدہ روانی اُس
کے قوی اور کثیر استعارات۔ اغراقات پر زور طریق سے تقلیب دلائل و براہین

یہ سب چیزیں پرجوش تقریر کے مبالغہ آمیز خط و خال ہیں۔ پس نظم کی عمدگی کے لیے یہ بات ضرور ہے اُن قوی العمل قوانین پر توجہ کی جائے۔ جن کی پابندی پرجوش تقریر میں مدِنظر رہتی ہے۔ پُرجوش تقریر کی خصوصیتوں کو نظم میں شامل کرنے یا اُن کو مبالغہ کے ساتھ برتنے کے لیے تناسب کا لحاظ رکھنا لازم ہے۔ اُس کے ہتھیاروں کو بے روک ٹوک استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ جہاں خیالات میں جوش بہت کم ہو وہاں شاعرانہ طرزِ بیان کو کمی کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے۔ جس قدر جوش زیادہ ہوتا جائے اُسی قدر آزادی سے۔ اس طرزِ بیان کو اختیار کرنا چاہیے۔ اور جہاں کہیں یہ جوش بدرجہ غایت پہنچ جائے۔ وہیں اُس طرز کو بھی حد درجہ تک پہنچانا چاہیے اگر ان اصول کی بالکل مخالفت کی جائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ شاعری میں صرف لفّاظی اور زٹل قافیہ کے سوا اور کچھ باقی نہ رہے گا۔ ان اصول کا کافی لحاظ نہ رکھنا اُس قسم کی شاعری میں دیکھا جاتا ہے جس میں پند و نصیحت کا بیان ہوتا ہے۔ اور چوں کہ ان قوانین کی شاذ و نادر ہی پوری طرح پابندی کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری کا بہت سا حصہ شاعری کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔

ہر ایک صناع کو علم سائی کالوجی کی واقفیت ضروری ہے۔

یہی بات نہیں کہ ہر ایک صاحبِ فن اپنا کام اُس وقت تک صحیح طور پر نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ وہ اُن چیزوں کے قوانین کو نہ سمجھے۔ جن کو وہ بناتا ہے۔ بلکہ اُس کو یہ بھی سمجھ لینا لازم ہے کہ اُس کی صنعت کی مختلف خصوصیتوں کا اثر ناظرین یا سامعین کے دلوں پر کیا پڑے گا؟ اور یہ سوال علم سائی کالوجی سے متعلق ہے۔ کسی صنعت کا اثر جو دل پر ہوتا ہے۔ وہ صریحاً اُن لوگوں کی روحانی فطرت پر منحصر ہے جن کے سامنے اُس صنعت کو پیش کیا جاتا ہے۔ اور چوں کہ تمام روحانی فطرتوں میں بعض خصوصیتیں مشترک ہیں۔ اس لیے ایسے عام اصول ضرور نکلیں گے جن کے موافق ہی مصنوعات کو تیار کرنے سے کامیابی ہو سکتی ہے۔ صناع ان عام اصول کو

پوری طرح اُس وقت تک نہیں سمجھ سکتا - اور نہ اُن کو استعمال کر سکتا ہے - جب تک کہ اس بات کو نہ سمجھ لے - کہ وہ اصول قوانین نفس ناطقہ سے کس طرح مستنبط ہوتے ہیں - یہ سوال کرنا کہ آیا فلاں تصویر کی بناوٹ عمدہ ہے یا نہیں ؟ اصل میں اس بات کا سوال کرنا ہے کہ ناظرین کے ادراکات اور تاثرات پر اُس تصویر کا اثر کیسا پڑتا ہے ؟ یہ سوال کرنا کہ آیا فلاں ناٹک عمدہ طور پر بنایا گیا ہے یا نہیں ؟ اس بات کا سوال کرنا ہے کہ آیا اس کے اجزا کو موقع و محل کے لحاظ سے اس طرح ترتیب دیا گیا ہے یا نہیں کہ حاضرین محفل کی توجہ پوری طرح قایم رہے - اور کسی خاص قسم کے تاثر پر زیادہ بار نہ پڑے نظم یا افسانہ کے بڑے بڑے حصّوں کی ترتیب - اور ایک ہی جملہ کے لفظوں کے ملانے سے جو اثر پیدا ہوتا ہے - اُس اثر کی عمدگی اس بات پر منحصر ہے کہ پڑھنے والے کے جوش اور تاثر سے ہنرمندی اور سلیقہ کے ساتھ کام لیا جائے - ہر ایک صنّاع اپنی تعلیم کے زمانہ میں اور ختم تعلیم کے بعد جب کہ وہ اپنے کاروبار میں مصروف ہوتا ہے - ایسے اصول کا ذخیرہ جمع کرتا رہتا ہے - جن کے ذریعہ سے اس کا کام باقاعدہ چلتا ہے - اگر تم اُن اصول کی جڑ کا کھوج لگاؤ تو وہ یقیناً اصول سائی کالوجی تک تمہاری رہنمائی کریں گے - اور جب کوئی صنّاع سائی کالوجی کے اُن اصول کو اور اُن کے مختلف نتایج کو سمجھ لیتا ہے - اُسی وقت اِن کے موافق کام کر سکتا ہے -

کسی فن کی تکمیل کے لیے قدرتی لیاقت اور سائنس کی واقفیت دونوں چیزیں ضروری ہیں -

ہم ایک لمحہ کے لیے بھی اس بات کا یقین نہیں کرتے کہ سائنس کسی شخص کو صنّاع یا صاحب فن بنا سکتا ہے - جب کہ ہم اس امر پر زور دیتے ہیں کہ ہر ایک صنّاع کو صوری و معنوی مظاہر قدرت کے بڑے بڑے قوانین سمجھ لینے چاہییں ہم اس بات پر مطلق بحث نہیں کرتے کہ اِن قوانین کی واقفیت - قدرتی سمجھ بوجھ کی جگہ کام دے سکتی ہے نہ صرف شاعر - بلکہ ہر قسم کا صاحب فن پیدا ہوتا ہے

بنتا نہیں ۔ اس بیان سے ہمارا مطلب اتنا ہی ہے کہ خلقی قابلیت ۔ باضابطہ
علم کی مدد سے مستغنی نہیں کرسکتی ۔ قدرتی ذکاوت بہت کچھ کرسکتی ہے ۔ مگر سب
کچھ نہیں کرسکتی ۔ جب جوہر عقل کا ازدواج سائنس کے ساتھ ہوتا ہے
تب کہیں اعلیٰ ترین نتائج پیدا ہوسکتے ہیں ۔

سائنس ۔ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے ۔ کسی صنعت میں پورا کمال حاصل
کرنے کے لیے ہی ضروری نہیں ہے ۔ بلکہ فنون لطیفہ کو پوری طرح سمجھنے کے لیے
بھی درکار ہے ۔ کسی تصویر کی خوبیوں کو معلوم کرنے کی لیاقت بچے کی نسبت بڑے
آدمی میں کیوں زیادہ ہوتی ہے ؟ اس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے ۔ کہ قدرت
اور زندگی کے واقعات جو تصویریں ظاہر کیے جاتے ہیں بڑے آدمی کو اُن کا علم بہت
زیادہ ہوتا ہے ۔ کیا وجہ ہے کہ ایک مہذب شریف آدمی ایک دہقان کی نسبت عمدہ
نظم سے زیادہ لطف اٹھاتا ہے ؟ صرف یہ وجہ ہے کہ اُس کو مختلف اشیا اور حرکات
سے بہت زیادہ واقفیت ہوتی ہے ۔ اور اسی واقفیت کی بدولت نظم میں اس کو
بہت سی باتیں نظر آتی ہیں ۔ جو دہقان کو نظر نہیں آسکتیں ۔ اور اگر تصویروں کی
خوبیوں کو سمجھنے سے پہلے ۔ اصل چیزوں سے جن کی وہ تصویریں ہیں ۔ کچھ
کچھ واقفیت حاصل کرنی ضروری ہے ۔ جیسا کہ بیان مذکور سے صاف ظاہر ہے
تو اس سے یہ بات لازم آتی ہے ۔ کہ تصویر کی پوری خوبی اُسی وقت سمجھ میں آسکتی
ہے ۔ جب کہ اصل چیزوں کو پوری طرح سمجھ لیا جائے ۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی صنعت
کے کام میں جس قدر زیادہ اصلیت ظاہر کی جاتی ہے ۔ صاحب ادراک و شعور
کو اُسی قدر زیادہ خوشی حاصل ہوتی ہے ۔ اور جو لوگ اس اصلیت سے بے بہرہ
ہیں ۔ وہ اُس خوشی سے محروم رہتے ہیں ۔ کوئی صناع کسی خاص کام میں حقائق
اصلیہ کو جس قدر زیادہ ظاہر کرتا ہے ۔ اُسی قدر زیادہ لیاقتوں کو اُس میں صرف کرتا

ہے۔ اُسی قدر زیادہ خیالات اُس کام کو دیکھ کر دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور اُسی قدر زیادہ لطف حاصل ہوتا ہے۔ مگر اس لطف کو حاصل کرنے کے واسطے یہ بات ضرور ہے کہ صنّاع نے اپنی صنعت میں جن حقیقتوں کا اظہار کیا ہے۔ دیکھنے والا۔ سننے والا۔ اور پڑھنے والا۔ اُن کو جانتا ہو۔ اور ان حقیقتوں کا جاننا گویا اُس قدر سائنس سے واقفیت ہونا ہے۔

سائنس بجائے خود شاعری ہے۔

اب ایک بڑے معاملہ کو جو اور بھی زیادہ ضروری ہے ہم کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئیے یعنی یہ بات کہ سائنس نہ صرف بُت تراشی۔ مصوّری۔ موسیقی۔ اور شاعری کی بنیاد ہے بلکہ سائنس بجائے خود شاعری ہے۔ یہ خیال جو عام طور پر مشہور ہے۔ کہ سائنس اور شاعری ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ ایک دھوکا ہے۔ یہ بات حقیقت میں سچ ہے کہ ادراک اور جذبہ جو شعور کی مختلف حالتیں ہیں۔ ایک دوسرے کو خارج کرنا چاہتی ہیں۔ اور بے شک یہ بھی سچ ہے کہ حد اعتدال سے بڑھ کر قوائے متفکّرہ کا عمل تاثرات کو مردہ کر دیتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس تاثرات کا عمل۔ اعتدال سے زیادہ ہو تو۔ قوائے متفکّرہ کو مردہ کر دیتا ہے۔ درحقیقت اس معنی میں تو سب قسم کی قوتیں ایک دوسرے سے متناقض ہیں۔ مگر یہ بات کہ سائنس کے واقعات شاعری کے منافی ہیں۔ یا بعبارت دیگر۔ "سائنس کی تحصیل۔ قوت متخیلہ کے عمل اور حُسن کی محبت کے خواہ مخواہ برخلاف واقع ہوتی ہے" ہرگز صحیح نہیں ہے۔ برعکس اس کے سائنس۔ شاعری کی اُس اقلیم کو ہمارے سامنے بے پردہ آشکارا کر دیتا ہے جو سائنس سے ناواقف لوگوں کی نگاہ میں بالکل چٹیل میدان ہے۔ جو لوگ سائنس کی تحقیقات میں مصروف ہیں۔ وہ ہمیشہ اس بات کو ثابت کر دیتے ہیں کہ وہ بہ نسبت دوسرے لوگوں کے اپنے مضامین کی شاعری کا لطف کم نہیں۔ بلکہ زیادہ خوبی وصفائی کے ساتھ اُٹھاتے ہیں۔ جو

شخص ہیوملر[51] کی تصانیف متعلقہ علم طبقات الارض میں غور و خوض کرے۔ یا مسٹر لوئس کی کتاب مسمی سائنڈ سٹڈیز (تحقیقات بحری) کا مطالعہ کرے اُس کو ضرور معلوم ہو جائے گا کہ سائنس شاعری کے جوش کو سرد نہیں کرتا۔ بلکہ اور زیادہ بھڑکاتا ہے۔ اور جو شخص گوائٹھے[52] کی سوانح عمری پر غور کرے۔ اُس کو یہ بات ضرور معلوم ہو جائے گی۔ کہ شاعر۔ اور سائنس کا عالم ایک ہی وقت میں یکساں مستعدی سے کام کر سکتا ہے۔

کیا یہ بات درحقیقت بیہودہ اور قریب قریب ناپاک اعتقاد نہیں ہے کہ جس قدر زیادہ کوئی شخص قدرت کا مطالعہ کرے گا۔ اُسی قدر کم اُس کی توقیر کرے گا؟ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ پانی کا قطرہ۔ جو عام لوگوں کی نظر میں صرف پانی کا قطرہ ہے۔ علم طبیعیات کے عالم کی نظر میں اس کی وقعت کچھ کم ہو جائے گی۔ جو اس بات کو جانتا ہے کہ اُس قطرہ کے عنصر ایک قوت کے ذریعہ سے وابستہ ہیں۔ اور اگر وہ قوت یکایک زائل ہو جائے تو اُس سے بجلی کی چمک پیدا ہو گی؟ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جس شے کو ایک ناتربیت یافتہ آدمی بے پروائی سے برف کا گالا سمجھتا ہے اگر اُس کے عجیب و غریب گوناگوں۔ پاکیزہ برفانی۔ شفاف و بلور نما اوراق کو کوئی شخص خردبین کے ذریعے سے دیکھے۔ تو اُس کے دل میں اعلیٰ درجہ کے خیالات کا تسلسل پیدا نہ ہو گا؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ ایک گول چٹان کا پتھر جس پر متوازی خطوط کے نشانات کھدے ہوئے ہیں جاہل آدمی کے دل میں اُسی قدر شاعرانہ خیالات پیدا کرتا ہے۔ جس قدر کہ عالم طبقات الارض کے دل میں۔ جو اس بات کو جانتا ہے کہ دس لاکھ برس پہلے ایک برف کا ٹیلا اس چٹان پر بہتا ہوا گزرا تھا؟ اصل بات یہ ہے کہ جو لوگ کبھی سائنس کے مشاغل میں مصروف

---

[51] ہیوملر۔ سکاٹ لینڈ کا باشندہ تھا۔ اُس نے جی آلوجی (علم طبقات الارض) میں کتابیں تصنیف کی ہیں سنہ ۱۸۰۲ء میں پیدا ہوا تھا۔ اور سنہ ۱۸۵۶ء میں فوت ہوا۔ مترجم۔

[52] گوائٹھے ملک جرمنی کا ایک مصنف تھا سنہ ۱۷۴۹ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۸۳۲ء میں انتقال کیا۔ مترجم۔

نہیں رہے - وہ شاعری کے بہت بڑے حصّے سے جو اُن کے گرد وپیش موجود ہے بالکل محروم اور اندھے ہیں - جس شخص نے جوانی کے زمانہ میں پودوں اور کیڑوں کو جمع نہ کیا ہو وہ اُس دل چسپی کی آدھی قدر بھی نہیں جانتا - جو گلی کوچوں اور خاردار جھاڑی کی قطاروں سے حاصل ہو سکتی ہے - جس شخص نے معدنی اشیائے متحجرہ کی کبھی تلاش نہ کی ہو - اُس کو اُن شاعرانہ خیالات کا تصوّر بہت کم ہو سکتا ہے - جو اُن مقامات میں پیدا ہوتے ہیں - جہاں یہ خزانے زمین کے اندر پائے جاتے ہیں - جس شخص نے سمندر کے کنارے پر خردبین کے ذریعہ سے آبی جانوروں کے حوض کا معائنہ نہ کیا ہو - ابھی اُس کو یہ بات سیکھنی ہے کہ سمندر کے کنارے پر سب سے اعلیٰ درجہ کی پُر لطف چیزیں کون سی ہیں - حقیقت میں اس امر کا دیکھنا افسوس ناک ہے کہ لوگ خفیف باتوں میں اپنے تئیں مصروف رکھتے ہیں - اور نہایت عظیم الشان مظاہر قدرت کی طرف سے غافل اور لاپروا ہیں - گنبد افلاک کی عمارت کو سمجھنے کی پروا نہیں کرتے - مگر میری[۱] ملکہ سکاٹ لینڈ کی سازشوں کی بابت ذلیل بحث و مباحثہ میں گہری دل چسپی لیتے ہیں! یونانی غزل پر عالمانہ نکتہ چینی کرتے ہیں - اور اُس عظیم الشان رزمیہ مثنوی کو جو خدائے تعالےٰ نے اپنے دست قدرت سے طبقات الارض پر لکھی ہے - نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے - اور اُس کے پاس سے کترا کر نکل جاتے ہیں -

پس ہم دیکھتے ہیں کہ سائنس کی تعلیم انسانی کاروبار کے اُس آخری حصّہ کے لئے بھی مناسب سامان مہیا کرتی ہے - ہم دیکھتے ہیں کہ علم حسن عموماً لازمی طور پر سائنس

[۱] - میری سٹوارٹ سکاٹ لینڈ کی ملکہ تھی - ۱۵۴۲ء میں پیدا ہوئی تھی - اس پر الزبتھ ملکہ انگلستان کے قتل کی سازش کا الزام لگایا گیا تھا - چنانچہ بعد تحقیقات جرم ثابت ہو گیا - اور ۱۵۸۷ء میں اُس کا سر قلم کیا گیا - مترجم -

سے کے اصول پر مبنی ہے - اور ان ہی اصول کی واقفیت کی بدولت اُس کو پوری
کامیابی کیساتھ حاصل کیا جاسکتا ہے - ہم دیکھتے ہیں کہ ہر ایک فن کی تنقید اور
اوسکی خوبیوں کی واجبی قدر کرنے کے لیے چیزوں کی ماہیت کا علم یا دوسرے لفظوں
میں یوں کہو کہ سائینس کا علم ضروری ہے - اور ہم صرف اتنی بات نہیں دیکھتے کہ سائینس
تمام قسم کے فنون اور شاعری کی سہیلی ہے - بلکہ یہ بات بھی دیکھتے ہیں کہ اگر صحیح طور پر
خیال کیا جائے تو سائینس بجائے خود شاعری ہے ۔

تربیت کے اعتبار سے مختلف علموں کی اضافی قدر و قیمت ۔

یہاں تک ہم نے اس سوال پر بحث کی ہے - کہ ہدایت کی غرض سے خاص
خاص علموں کی قدر و قیمت کیا ہے ؟ اب ہم کو تربیت کی غرض سے مختلف علموں
کی اضافی قدر و قیمت کی بابت رائے قایم کرنی ہے - ہم مجبور رہیں کہ مضمون کے
اس حصہ پر نسبتہً اختصار کے ساتھ بحث کریں اور خوش قسمتی سے اُس پر طویل بحث
کی ضرورت بھی نہیں ہے - جب ہم کو یہ بات معلوم ہو گئی - کہ ایک خاص مقصد کے
واسطے کونسی چیز سب سے عمدہ ہے ؟ تو ہم ضمناً یہ بھی معلوم ہو گیا کہ دوسرے
مقصد کے لیے سب سے عمدہ چیز کیا ہے ؟ ہم کو بالکل یقین رکھنا چاہیے کہ جو
امور چال چلن کی اصلاح کے لیے نہایت مفید ہیں - اُن کے علم سے عقلی مشق
ضرور حاصل ہوتی ہے - جو خواہ عقلی کو مضبوط بنانے کے لیے نہایت مناسب
ہے - اگر معلومات حاصل کرنے کے واسطے ایک قسم کی تربیت درکار ہوتی اور
عقلی مشق کے لیے دوسری قسم کی تربیت درکار ہوتی تو یہ بات قدرت کے حسن انتظام
کے بالکل خلاف ہوتی - تمام موجودات قدرت میں ہم ہر جگہ اس بات کا مشاہدہ
کرتے ہیں کہ قوتیں اُن ہی فرائض کو پورا کرنے کی بدولت نشو و نما پاتی ہیں - جن کا پورا کرنا
اُن کا کام ہے - نہ کہ اُن مصنوعی ورزشوں کو پورا کرنے کی بدولت جو اُن کو ادائے فرائض
کے قابل بنانے کی غرض سے تجویز کی گئی ہیں - امریکہ کے سرخ فام وحشی باشندے

ہیں - حیوانات کا سچ مچ تعاقب کرنے کی بدولت ایسی پھرتی اور چالاکی پیدا ہو جاتی ہے
جس کی وجہ سے اُس کو شکار پکڑنے میں کامیابی ہوتی ہے - اور اپنی زندگی کے
مختلف کاروبار کی بدولت اُس کی جسمانی قوتوں میں ایسا عمدہ موازنہ اور تناسب پیدا ہو جاتا
ہے - کہ ورزش اور کسرت سے وہ بات کبھی حاصل نہیں ہو سکتی - دشمن اور شکار کا
کھوج لگانے میں عرصہ دراز کی مشق و مہارت کے بعد جو کمال اُس وحشی آدمی نے
حاصل کیا ہے - اُس کی تیزی ادراک پر دلالت کرتا ہے - اور مصنوعی تربیت سے جو
نتیجہ حاصل ہو سکتا ہے - اِس سے کہیں بڑھ کر ہے - یہی بات تمام حالتوں میں صادق
آتی ہے - جنوبی افریقہ کا خانہ بدوش وحشی آدمی دُور کی اُن چیزوں کی شناخت کرنے
میں جن کا اُس کو تعاقب کرنا یا جن سے اُس کو بچنا پڑتا ہے - عادۃً مصروف رہتا
ہے - اِس لیے اُس کی نظر اِس قدر تیز ہو جاتی ہے - کہ دوسرا شخص بغیر دُوربین کے
اتنی دور کی چیزوں کو نہیں دیکھ سکتا - اِس وحشی آدمی سے لے کر اُس محاسب تک
جو روزانہ مشق کی بدولت اعداد سوں کی کئی کئی سطروں کو ایک ساتھ جوڑ سکتا ہے -
ہم دیکھتے ہیں کہ کسی قدرتی لیاقت میں اعلٰے درجہ کی قوت اُن فرائض کو پورا کرنے سے پیدا
ہوتی ہے - جو زندگی کی مختلف حالتوں میں پورے کرنے پڑتے ہیں - اور برہان
الٰہی کے ذریعے ہم اِس بات کا یقین کر سکتے ہیں کہ یہی قانون ہر قسم کی تعلیم پر
صادق آتا ہے - جو تعلیم ہدایت کی غرض سے نہایت قیمتی ہے - وہی تعلیم
فِی وَقتٍ وَاحِدٍ تربیت کی غرض سے بھی نہایت قیمتی ہے - آؤ اِس امر
کی شہادت پر غور کریں -

معمولی نصاب تعلیم میں زبانوں کی تعلیم پر جو اِس قدر زور دیا گیا ہے -
اُس کا ایک فائدہ یہ بیان کیا جاتا ہے - کہ اُس سے حافظہ قوی ہوتا ہے - یہ فائدہ
الفاظ کے مطالعہ کے ساتھ مخصوص سمجھا جاتا ہے - مگر سچ یہ ہے کہ حافظہ کی مشق کیلئے

زبان اور سائنس کی تعلیم کا مقابلہ - زبان کی تعلیم کی طرح سائنس کی تعلیم سے بھی قوت حافظہ کو ترقی ہوتی ہے -

سائنس اس سے بہت زیادہ وسیع میدان مہیّا کرتا ہے نظام شمسی کا پورا حال یاد کر لینا کوئی ہلکا کام نہیں ہے کہکشاں کی بناوٹ کے متعلق جو باتیں اب تک معلوم ہوئی ہیں۔ اُن کا یاد کرنا اور بھی زیادہ مشکل ہے مرکّب مادّی چیزوں کی تعداد جس میں علم کیمیا روز مرّہ اضافہ کرتا رہتا ہے۔ اس قدر زیادہ ہے کہ پروفیسروں کے سوا کوئی شخص اُن کو شمار نہیں کر سکتا۔ اور سالمات کی ترکیب اور ان تمام مرکبات کے تعلقات کا یاد رکھنا۔ تاوقتیکہ تمام عمر علم کیمیا ہی کے مطالعہ میں صرف نہ کی جائے۔ قریب قریب ناممکن سے ہے۔ زمین کی بالائی سطح پر مظاہر قدرت کا ایک وافر ذخیرہ نظر آتا ہے اور زمین کے اندر کے متحجّر مادوں میں مظاہر قدرت کا اور بھی زیادہ ذخیرہ موجود ہے ان میں وہ مضمون بھرا ہوا ہے جس پر عبور حاصل کرنے کے لیے علم طبقات الارض کے طالب علم کو برسوں محنت کرنی پڑتی ہے علم طبیعیات کے ضروری حصّوں آواز۔ حرارت۔ روشنی اور قوت برقی میں بے شمار واقعات ایسے موجود ہیں۔ جن سے ہر شخص جو ان کو سیکھنے کا قصد رکھتا ہے چونک اُٹھتا ہے۔ اور جب ہم اُس سائنس کی طرف رجوع کرتے ہیں جس میں جسمانی اعضا اور اُن کے افعال سے بحث ہوتی ہے۔ اس وقت قوت حافظہ کی کشش و کوشش جو اس سائنس کے واسطے درکار ہے بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ صرف علم تشریح الاعضا انسانی میں رگ پٹھوں۔ ہڈیوں وغیرہ کی تفصیل اس قدر زیادہ ہے کہ نوجوان سرجن (جرّاح) کو مستقل طور پر یہ سب چیزیں ذہن میں محفوظ رکھنے کے لیے سوگاہے مرتبہ اُن کو ازبر یاد کرنا پڑتا ہے۔ پودوں کی نوعیں۔ جن میں عالمان علم نباتات تمیز کرتے ہیں۔ تقریباً تین لاکھ بیس ہزار تک پہنچتی ہیں۔ اور جانداروں کی طرح طرح کی صورتیں۔ جن سے علم الحیوانات کے عالم کو کام پڑتا ہے۔ اُن کا اندازہ تخمیناً بیس لاکھ تک کیا گیا ہے۔ عالمان سائنس کے سامنے واقعات کا ایسا

وسیع ذخیرہ موجود ہے کہ وہ اپنی محنت کی تقسیم اور تقسیم در تقسیم ہی کے ذریعہ سے
اُن پر بحث کر سکتے ہیں۔ ہر شخص اپنی خاص شاخ کے مفصل علم کے علاوہ متعلقہ شاخوں
کی صرف عام واقفیت رکھتا ہے۔ بلکہ شاید بعض اور شاخوں کے ابتدائی اصول
سے بھی واقف ہوتا ہے۔ پس اگر نہایت معمولی حد تک بھی سائنس کی تحصیل
کی جائے۔ تب بھی یقیناً حافظہ کے لیے کافی مشق بہم پہنچ سکتی ہے۔ کم از کم
اتنا تو ضرور کہہ سکتے ہیں۔ کہ سائنس سے قوت حافظہ کی تربیت ایسی ہی
عمدہ ہو سکتی ہے۔ جیسی زبان سے۔

قوت حافظہ کی نوعیت کے لحاظ سے سائنس کو زبان پر بے حد فوقیت ہے سائنس سے حافظہ اور عقل دونوں کو ترقی ہوتی ہے۔

اب اس بات پر غور کرو کہ محض حافظہ کی تربیت کی غرض سے سائنس
اگر زبان سے بہتر نہیں ہے تو اُس کے برابر تو ضرور ہے۔ تاہم سائنس جس قسم کے
حافظہ کی تربیت کرتا ہے۔ اُس کے اعتبار سے سائنس کو زبان پر بے حد فوقیت
حاصل ہے۔ زبان کی تحصیل میں یہ بات ہے کہ جو تصورات ذہن میں قائم کیے
جاتے ہیں اُن کا تعلق ایسے واقعات سے مناسبت رکھتا ہے۔ جو زیادہ
تر عارضی و اتفاقی ہوتے ہیں۔ حالانکہ سائنس کی تحصیل میں یہ بات ہے
کہ جو تصورات ذہن میں قائم کیے جاتے ہیں۔ اُن کا تعلق ایسے واقعات سے
مناسبت رکھتا ہے۔ جو اکثر لازمی و ضروری ہوتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ الفاظ کے
تعلقات اپنے معنوں کے ساتھ۔ ایک اعتبار سے قدرتی ہیں۔ اور ایک خاص
فاصلہ تک ان تعلقات کی اصلیت کا کھوج لگایا جا سکتا ہے۔ اگرچہ جڑ بنیاد
تک اُس کا کھوج شاذونادر ہی ملتا ہے۔ اور اس اصلیت کا کھوج لگانے کے
تو ذہنی سائنس (علم النفس) کی ایک شاخ ہیں۔ جس کو علم اللسان
کہتے ہیں۔ مگر چونکہ اس بات میں کسی شخص کو کلام نہ ہوگا۔ کہ زبانوں کی تحصیل
میں۔ جیسا کہ معمولاً رواج ہے۔ لفظوں اور ان کے معنوں میں قدرتی تعلقات

کا عموماً کھوج نہیں لگایا جاتا - اور اُن کے قوانین کی تشریح نہیں کی جاتی - پس اس بات کو ضرور تسلیم کرنا چاہیئے کہ الفاظ و معانی کو عموماً اس طرح یاد کر لیا جاتا ہے کہ گویا اُن میں اتفاقی و عارضی تعلقات ہیں - برعکس اس کے جو تعلقات سائنس سے معلوم ہوتے ہیں وہ سببی تعلقات ہوتے ہیں - اور اگر مناسب طور پر اُن کی تعلیم دی جائے تو طالب علم اُن تعلقات کو ایسا ہی سمجھتا ہے - پس زبان غیر معقول تعلقات سے آگاہ کرتی ہے - تو سائنس معقول تعلقات سے آگاہ کرتا ہے - زبان محض حافظہ کی تربیت کرتی ہے - تو سائنس حافظہ اور سمجھ دونوں کی تربیت کرتا ہے -

سائنس کی تعلیم سے قوتِ فیصلہ کو ترقی ہوتی ہے اور اس اعتبار سے اُس کو زبان کی تعلیم پر بڑی فوقیت ہے -

پھر اس امر کو بھی مدنظر رکھو کہ سائنس کو زبان پر اس حیثیت سے - کہ وہ تربیت کا وسیلہ ہے - ایک بڑی فوقیت یہ بھی ہے - کہ وہ قوتِ فیصلہ کو ترقی دیتا ہے - عقلی تعلیم کی سب سے زیادہ عام خرابی - قوتِ فیصلہ کا نقص ہے - جیسا کہ پروفیسر فراڈے[۱] نے اپنے لکچر میں جو رائل انسٹیٹیوشن (مدرسہ شاہی) میں عقلی تعلیم پر دیا گیا تھا - عمدہ طور پر بیان کیا ہے - صاحب موصوف بیان کرتے ہیں کہ "لوگ عام طور پر نہ صرف قوتِ فیصلہ کی تعلیم کے لحاظ سے جاہل ہیں بلکہ اس جہالت کی طرف سے بھی جاہل ہیں - اور جہل مرکب میں پڑے ہوئے ہیں" پروفیسر موصوف اس حالت کو جس سبب سے منسوب کرتے ہیں - وہ سائنس کی تعلیم کا نہ ہونا ہے - اُن کے نتیجہ کی راستی ظاہر ہے - گرد و پیش کی اشیاء - واقعات - اور نتائج کی بابت صحیح رائے قایم کرنی اُسی صورت میں ممکن ہے - جب کہ ہم کو یہ معلوم ہو کہ گرد و پیش کے قدرتی مظاہر کس طرح ایک دوسرے پر منحصر ہیں ؟ الفاظ کے معنوں سے خواہ کتنی ہی واقفیت کیوں نہ ہو

[۱] پروفیسر فراڈے - انگلستان کا باشندہ تھا - علم کیمیا اور علم حیوانات کا عالم تھا - ۱۷۹۱ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۶۷ء میں انتقال کیا - مترجم -

یہ واقفیت علل و معلولات کی بابت صحیح نتائج نکالنے کی ذمہ داری نہیں کرتی۔
صحیح رائے قائم کرنے کی قوت صرف اس طرح حاصل ہو سکتی ہے۔ کہ واقعات موجودہ
سے نتائج نکالنے اور پھر مشاہدہ اور تجربہ سے اُن نتائج کی تصدیق کرنے کی عادت ڈالی
جائے۔ اور سائنس کے بے شمار فوائد میں سے ایک فائدہ یہ ہے کہ اُس سے اُس
قسم کی عادت لامحالہ پیدا ہوتی ہے۔

عقلی تربیت کے علاوہ اخلاقی تربیت کیلئے بھی سائنس نہایت مفید ہے۔

مگر سائنس نہ صرف عقلی تربیت بلکہ اخلاقی تربیت کے لیے بھی نہایت
عمدہ ہے۔ زبانوں کی تحصیل کا میلان اگر کچھ ہے تو یہ ہے کہ تحکّم کی ناواجب عزت
جو پہلے ہی دلوں میں موجود ہوتی ہے۔ اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے معلّم یا لغت کہتا ہے
کہ ان لفظوں کے یہ معنی ہیں" گریمر (صرف و نحو) کہتی ہے کہ "اس محاورت میں فلاں
فلاں قاعدہ ہے" ان تحکمانہ اقوال کو بے چون وچرا تسلیم کیا جاتا ہے۔ طالب علم
کی طبیعت کا ہمیشہ یہ ڈھنگ رہتا ہے۔ کہ وہ تحکمانہ تعلیم کے آگے سر تسلیم خم کرتا ہے
اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو اصول قائم کیے جائیں۔ اُن کو بلا تحقیق قبول کرنے کا
میلان پیدا ہوتا ہے۔ مگر سائنس کی تعلیم سے نفس کی جو حالت پیدا ہوتی ہے۔ وہ
اس سے بالکل مختلف ہے۔ سائنس ہمیشہ شخصی عقل کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اُس
کی حقیقتوں کو محض تحکماً نہیں مانا جاتا۔ بلکہ سب لوگ آزاد ہیں۔ کہ ان حقیقتوں کی
آزمائش کریں یا نہیں۔ بلکہ بہت سی صورتوں میں طالب علم پر تقاضہ کیا جاتا ہے۔ کہ وہ
اپنے نتائج پر غور و خوض کرے۔ سائنس کی تحقیقات میں ہر ایک بات کو فیصلہ کے
لئے اُس کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ اُس سے یہ نہیں کہا جاتا کہ اُس تحقیقات
کو خواہ مخواہ تسلیم کرے۔ جب تک کہ اُس کا صحیح ہونا بچشم خود نہ دیکھ لے۔ اور جب وہ
صحیح طور پر نتائج نکالتا ہے اور قدرت اپنی یک رنگی اور باقاعدگی سے اُن کی تصدیق
کرتی ہے۔ تو اُس کو اپنی قوتوں پر۔ جو اس طرح تجربہ کرنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ زیادہ وثوق

ہو جاتا ہے - یہ سب باتیں اُس آزادی کا سرچشمہ ہیں جو خصلت کا نہایت عمدہ جوہر ہے سائنس کی تعلیم سے صرف اتنا ہی اخلاقی فائدہ حاصل نہیں ہوتا - اگر سائنس کا مطالعہ تا بمقدور اصلی تحقیقات کی شکل میں جاری رکھا جائے - اور ہمیشہ ایسا ہی ہونا چاہیے - تو وہ استقلال اور راستبازی کو بھی ترقی دیتا ہے - جیسا کہ پروفیسر ٹنڈل[1] تحقیقات استقرائی کی بابت لکھتے ہیں :-

پروفیسر ٹنڈل کی رائے تحقیقات استقرائی کے متعلق -

"اس تحقیقات کے لیے صابرانہ محنت درکار ہے - اور اس بات کی ضرورت ہے کہ موجودات قدرت میں جو حقیقتیں ظاہر ہوں اُن کو عاجزی اور راستبازی سے قبول کیا جائے - کامیابی کی پہلی شرط یہی ہے کہ اُن کو ایمانداری سے تسلیم کیا جائے - اور جو خیالات پہلے سے دماغ میں سمائے ہوئے ہوں - اگر وہ امر واقعی کے خلاف ثابت ہوں - اُن کو یک قلم ترک کرنے کے لیے رضامند اور مستعد رہیں - خواہ وہ خیالات کیسے ہی عزیز کیوں نہ ہوں - یقین جانو کہ سائنس کا سچا خادم اپنے ذاتی تجربہ میں خود بینی کو ترک کر دیتا ہے - یہ خصلت بجائے خود عمدہ ہے - مگر دنیا کبھی اس کا ذکر سننا نہیں چاہتی"

سائنس کی تعلیم سے مذہبی تعلیم بھی حاصل ہوتی ہے -

آخر میں ہم کو یہ بیان کرنا ہے - اور کچھ شک نہیں کہ یہ بیان حیرت و استعجاب کا موجب ہوگا - کہ ہماری معمولی تعلیم پر سائنس کی تعلیم اس وجہ سے بھی فائق ہے کہ اُس سے مذہبی تعلیم حاصل ہوتی ہے - درحقیقت الفاظ سائنس اور مذہب کو یہاں اُن کے معمولی محدود معنوں میں نہیں - بلکہ اُن کے نہایت ہی اعلیٰ اور وسیع معنوں میں ہم نے استعمال کیا ہے - بیشک سائنس اُن توہمات کا دشمن ہے جو مذہب کے نام سے مشہور ہیں - نہ کہ اصلی و حقیقی مذہب کا - جس کو یہ توہمات محض پوشیدہ کر دیتے ہیں - اس میں بھی شک نہیں کہ [illegible]

[1] پروفیسر ٹنڈل - برطانیہ کلاں کا رہنے والا تھا - زمانہ حال میں علم طبیعی کا مشہور و معروف عالم گزرا ہے سنہ ۱۸۲۰ء میں پیدا ہوا - اور سنہ ۱۸۹۳ء میں انتقال کیا - مترجم -

سائنس جو رائج ہے۔ اُس میں لامذہبی کی رُوح غالب ہے۔ مگر اُس سے سچے سائنس میں جو سطح سے گزر کر تہ تک پہنچ گیا ہے۔

پروفیسر ہکسلی[۱۵] نے حال ہی میں اپنے لکچروں کے سلسلے کے اختتام پر یہ بیان کیا تھا۔

پروفیسر ہکسلی کی رائے سچے سائنس اور سچے مذہب کی نسبت

"وہ سچا سائنس اور سچا مذہب توام بھائی ہیں۔ اُن کی باہمی جُدائی یقیناً دونوں کی موت ہے۔ سائنس میں جس قدر مذہبی روح ہوگی ٹھیک اُسی مناسبت سے وہ ترقی کریگا۔ اور جہاں تک سائنس کی گہرائی اور مضبوطی پر مذہب کی بنیاد قایم ہوگی۔ ٹھیک اُسی مناسبت سے مذہب سرسبز ہوگا۔ حکما نے جو بڑے بڑے کام کیے ہیں۔ محض اُن کی عقل و ذکاوت کا ثمرہ نہیں ہے۔ بلکہ زیادہ تر اس بات کا ثمرہ ہیں کہ مذہبی جوش نے جو اُن کی طبیعت میں نمایاں طور پر پایا جاتا تھا۔ اُن کی عقل کو سیدھے رستے پر ڈال دیا تھا۔ اعلیٰ حقایق زیادہ تر اُن کے صبر۔ اُن کی محنت۔ اُن کی راست بازی اور اُن کی نفس کشی کی بدولت منکشف ہوئے ہیں۔ نہ کہ اُن کی منطقی ذکاوت کی بدولت۔"

سائنس بے دینی کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ سائنس سے غفلت کرنی بے دینی ہے۔

بہت لوگوں کا یہ خیال۔ کہ سائنس لامذہبی اور بے دینی کی تعلیم دیتا ہے محض غلط ہے۔ سائنس کا لامذہبی کی تعلیم دینا تو ایک طرف رہا خود سائنس سے غفلت کرنی۔ بے دینی ہے۔ مخلوقاتِ الٰہی۔ جو ہمارے گردوپیش موجود ہے اُس کا مطالعہ نہ کرنا بے دینی ہے۔ ایک ادنیٰ مثال سے اس بات کو سمجھو۔ فرض کرو کہ بعض لوگ روزمرہ کسی مصنف کی تعریفوں کے پُل باندھا کریں۔ فرض کرو کہ مصنف کی جس قدر تعریفیں کی جائیں۔ اُن کا مضمون ہمیشہ یہی ہو کہ اُس کی تصانیف کی دانائی۔ حکمت و جلالت۔ اور خوبی و لطافت کا اعتراف کیا جائے۔ فرض کرو کہ جو لوگ

۱۵؎ پروفیسر ہکسلی۔ انگلستان کا باشندہ۔ اور علم الحیوانات کا عالم تھا۔ سنہ ۱۸۲۵ء میں پیدا ہوا۔ اور سنہ ۱۸۹۵ء میں فوت ہوا۔ مترجم۔

اس طرح اُس کی کتابوں کی صفت وثنا متواتر بیان کرتے رہتے ہیں - وہ اُن کتابوں کی صرف بیرونی صورت دیکھنے پر قناعت کریں - اور اُن کا مضمون سمجھنے کی کوشش تو الگ رہی - کبھی اُن کو کھول کر بھی نہ دیکھیں - بھلا ایسے آدمیوں کی تعریفوں کی (جو مہ تحسین ناشناس'' کا مصداق ہیں) ہم کو کیا قدر کرنی چاہیے؟ اُن کی صداقت و راست بازی کی نسبت ہم کو کیا خیال کرنا چاہیے؟ تاہم اگر چھوٹی چیزوں کا بڑی چیزوں کے ساتھ مقابلہ کیا جائے تو ہم کو معلوم ہو جائے گا کہ موجوداتِ عالم اور اُس کی علّت (خدا تعالیٰ) کی نسبت بھی بنی نوع انسان کا طرزِ عمل عموماً اسی قسم کا ہے - نہیں بلکہ اس سے بھی بدتر ہے - فقط اتنی ہی بات نہیں کہ وہ بغیر مطالعہ کے اُن چیزوں کے پاس سے کترا کر نکل جاتے ہیں - جن کو وہ روزمرہ نہایت عجیب وغریب بتاتے ہیں - بلکہ جو لوگ قدرت کے مشاہدہ میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں - اکثر اوقات اُن پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ فعل عبث میں اوقات ضائع کرتے ہیں - جو لوگ ان عجائبات میں عملی ذوق وشوق ظاہر کرتے ہیں سچ مچ اُن کو حقیر سمجھتے ہیں - پس ہم مکرر بیان کرتے ہیں کہ سائنس نہیں - بلکہ سائنس سے غفلت کرنی بے‌دینی[له] ہے - سائنس کی محبت خاموش عبادت ہے یعنی جن چیزوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے - اُن کی عظمت کو - اور کنایۃً اُن کی علّت (خداے تعالیٰ) کی عظمت کو چپ چاپ تسلیم کرنا ہے - یہ صرف زبانی بندگی نہیں ہے بلکہ ایسی بندگی ہے جو افعال سے ظاہر ہوتی ہے - یہ ایسی طاعت نہیں ہے جس میں صرف اقرار باللسان ہو بلکہ ایسی طاعت ہے جس میں تصدیق بالجنان اور عمل بالارکان بھی شامل ہیں -

له قرآن شریف میں سینکڑوں مقامات پر کائنات اور مخلوقات سے خداے تعالیٰ کی ہستی اور اُس کی قدرت پر استدلال کیا گیا ہے - اور انسان کو جابجا اس امر کی ہدایت کی گئی ہے کہ وہ مظاہر قدرت کا غور سے مطالعہ کرکے خداے تعالیٰ کی عظمت وجلالت کو سمجھے - مثلاً سورۂ آل عمران میں ہے -

اوراس کا ثبوت وقت، غور وفکر اور محنت کو قربان کرنے سے ملتا ہے۔

سچا سائنس صرف اسی وجہ سے خالص مذہبی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ اس وجہ سے بھی مذہبی حیثیت رکھتا ہے کہ وہ خدائے تعالیٰ کی عظمت و جلالت ہمارے دلوں

سائنس کا ایک بڑا فائدہ کہ اس سے خالقِ قدرت پر اور انکی فرمانبرداری کی ترغیب پیدا ہوتی ہے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۰ (۱) ان فی خلق السموٰت والارض واختلاف الیل والنھار لأیٰت لاولی الالباب ۝ الذین یذکرون اللہ قیاما و قعودا و علی جنوبھم و یتفکرون فی خلق السموٰت والارض ربنا ما خلقت ھذا باطلا سبحانک فقنا عذاب النار ۝ (سورہ آل عمران۔ آیت ۱۸۷-۱۸۸)

آسمان اور زمین کی بناوٹ اور رات اور دن کے ردّوبدل میں عقلمندوں کے لیے قدرت الٰہی کی نشانیاں موجود ہیں۔ جو کھڑے۔ بیٹھے اور لیٹے خدا کو یاد کرتے ہیں۔ اور آسمان و زمین کی ساخت میں غور کرتے ہیں۔ (اور بے اختیار بول اٹھتے ہیں کہ) اے ہمارے پروردگار تو نے اس عالم کو بے فائدہ نہیں بنایا۔ تیری ذات پاک ہے ہم کو عذاب دوزخ سے بچا لیجیو۔

سورہ نحل میں ہے

(۲) ھو الذی انزل من السماء ماء لکم منه شراب و منه شجر فیه تسیمون ینبت لکم به الزرع والزیتون والنخیل والاعناب ومن کل الثمرات ط ان فی ذلک لأیة لقوم یتفکرون ۝ و سخر لکم الیل والنھار والشمس والقمر ط والنجوم مسخرات بامرہ ط ان فی ذلک لأیٰت لقوم یعقلون ۝

(سورہ نحل۔ آیت ۱۰-۱۲)

وہی قادر مطلق ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا جس سے کچھ تمہارے پینے کا ہے اور اسی سے درخت پرورش پاتے ہیں جنہیں مویشیوں کو کھلاتے ہو۔ اُسی پانی سے خدا تمہارے لیے کھیتی اور زیتون اور کھجور اور انگور اور ہر طرح کے پھل پیدا کرتا ہے۔ جو لوگ غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔ ان کے لیے اس میں قدرت خداوندی کا ایک نشان ہے۔ اور اُسی نے رات اور دن اور سورج اور چاند کو تمہارا تابع کر رکھا ہے۔ اور ستارے بھی اُسی کے حکم سے تمہارے فرماں بردار ہیں۔ عقل والوں کے لیے ان چیزوں میں قدرت خدا کی بہت سی نشانیاں ہیں۔

میں پیدا کرتا ہے ۔ اور قدرت کی تمام چیزیں جو اپنے افعال میں یکسانی اور یک رنگی ظاہر کرتی ہیں ۔ اس بات کا پختہ اعتقاد دل میں بیٹھ جاتا ہے ۔ سائنس کے عالم کو مظاہر قدرت کے غیر متغیر تعلقات کا علت و معلول کے لازوال علاقہ کا ۔ نیک و بد نتائج کے لزوم کا ۔ کامل یقین ہو جاتا ہے ۔ سماعی اعتقاد جزا و سزا کی بجائے ۔ جس کو حاصل کرنے یا جس سے بچنے کی ۔ باوجود نافرمانی اور سرکشی کے ۔ لوگ بے فائدہ توقع رکھتے ہیں ۔ وہ یہ بات دیکھتا ہے ۔ کہ ایک مقررہ آئین کے موافق جزا و سزا ملتی ہے ۔ اور نافرمانی کے بد نتائج اٹل ہیں ۔ وہ دیکھتا ہے کہ جن قوانین کی ہم کو فرماں برداری کرنی چاہیئے وہ نامہربان بھی ہیں اور مہربان بھی وہ دیکھتا ہے کہ اُن قوانین کی پابندی سے ہر شے کی رفتار ہمیشہ زیادہ تر کمال اور اعلےٰ تر خوشی کی طرف رجوع کرتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ اُن قوانین پر زور دیتا ہے ۔ اور جب اُن کی طرف سے بے پروائی کی جاتی ہے ۔ تو اُس کو غصہ آتا ہے ۔ اور اس طرح چیزوں کے ازلی و ابدی اصول اور ان کی تعمیل کی ضرورت کا اقرار کر کے حقیقت میں اپنے تئیں مذہبی آدمی ثابت کرتا ہے ۔

سائنس اس امر کو تسلیم

آخر میں ہم سائنس کی ایک اور مذہبی حیثیت دکھاتے ہیں ۔ وہ یہ کہ زندگی کے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۱ ۔ شیخ سعدی رح قرآن شریف کے اسی مضمون کو اس طرح بیان کیا ہے ؎

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کار اند
تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار
شرط انصاف نباشد کہ تو فرماں نبری

قرآن شریف میں سینکڑوں آیتیں اس مضمون کی موجود ہیں ۔ جن کو ہم بخوف طوالت اس مختصر نوٹ میں درج نہیں کر سکتے ۔ جن سے ثابت ہے کہ خدائے تعالےٰ نے موجودات قدرت کا علم (یعنی سائنس) کے حاصل کرنے کی انسان کو کس قدر تاکید کی ہے ۔ پس مصنف کا یہ قول کہ ”سائنس سے غفلت کرنی بے دینی ہے“ بجائے خود درست ہے ۔ مترجم

رازہائے سربستہ کے ساتھ ہم کو جو تعلق ہے اُس تعلق کا اور خود اپنے نفس کا صحیح تصوّر۔ سائنس ہی کی بدولت حاصل ہو سکتا ہے سائنس اُن تمام باتوں کو بتاتا ہے۔ جن کا جاننا ممکن ہے اور ساتھ ہی اس کے۔ اُس حد کو بتاتا ہے جس سے آگے کا حال ہم کو کچھ نہیں معلوم ہو سکتا۔ سائنس ہم کو بطور اعتقاد کے یہ بات نہیں سکھاتا کہ علت العلل کی ماہیت کا سمجھنا محال ہے۔ بلکہ ہر طرف اس سرحد پر پہنچا کر جس سے آگے قدم رکھنے کی مجال نہیں۔ اِس امر کے محال ہونے کو کھلم کھلا ہم سے تسلیم کرالیتا ہے۔ سائنس اس بات کو برائے العین مشاہدہ کرا دیتا ہے۔ اور کسی دوسرے طریقہ سے یہ بات حاصل نہیں ہو سکتی۔ کہ اُس ہستی کے آگے جو عقل انسانی سے بالاتر ہے عقل انسانی قاصر و عاجز ہے۔ سماعی روایات اور لوگوں کی اسناد کی طرف اُس کی روش شاہانہ متکبرانہ ہو۔ مگر اُس پردۂ اسرار کے آگے۔ جس میں قادر علے الاطلاق چھپا ہوا ہے۔ اور جس میں کوئی شخص باریاب نہیں ہو سکتا۔ اُس کی روش عاجزانہ ہے [۵]

اگر یک سر موئے برتر پرم	فروغ تجلّی بسوزد پرم

پس سائنس کا کبر بھی سچّا ہے اور انکسار بھی صرف سائنس کا سچّا عالم (اور اس لقب سے ہماری مراد اُس شخص سے نہیں ہے جو محض فاصلوں کا اندازہ کرتا ہے۔ یا مرکبات کی تحلیل کرتا ہے۔ یا چیزوں کی نوعیں مقرر کرتا ہے۔ بلکہ ہماری مراد اُس شخص سے ہے۔ جو ادنیٰ حقیقتوں کے ذریعہ سے اعلےٰ حقیقتوں کا اور آخر کار اعلیٰ ترین حقیقتوں کا سراغ لگاتا ہے) ہاں صرف سائنس کا سچا عالم حقیقت میں یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ قادر مطلق کی قدرت جو سب چیزوں پر حاوی ہے۔ نہ صرف انسانی علم۔ بلکہ انسانی خیال و

کرتا ہے۔ کہ خدا تعالےٰ کی حقیقت کا سمجھنا نہ صرف عقل انسانی بلکہ خیال و قیاس سے بھی بالاتر ہے۔

---

[۵] موقع اور محل کی مناسبت سے یہ اشعار ترجمہ میں بڑھا دئے گئے ہیں۔ مترجم

قیاس سے بھی کس قدر برتر ہے - اور کائنات حیات اور ادراک اُسی قدرت کے کرشمے ہیں! سُبْحَانَہٗ مَا اَعْظَمَ شَانَہٗ ؂

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر	وز ہر چہ گفتہ اند شنیدیم و خواندہ ایم ما ہمچناں در اوّل وصفِ تو ماندہ ایم

پس ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ تربیت اور نیز ہدایت کے اعتبار سے سائینس کی قدر و قیمت سب سے بڑھ کر ہے - بہر حال چیزوں کے معنوں کا یاد کرنا - لفظوں کے معنے یاد کرنے سے بہتر ہے - کیا باعتبار عقلی و اخلاقی تربیت کے اور کیا بہ لحاظ مذہبی تربیت کے گرد و پیش کے مظاہر قدرت کا مطالعہ - صرف و نحو اور لغت کے مطالعہ پر بے حد فوقیت رکھتا ہے -

پس اس مضمون کے شروع میں جو سوال ہم نے کیا تھا کہ "کون سا علم سب سے زیادہ قیمتی ہے" ؟ اُس کا یہی ایک جواب ہے کہ وہ سائینس ہے، تمام بیانات پر عدالت کا حکم ناطق یہی ہے - "بلا واسطہ حفاظت نفس" یعنی زندگی اور صحت کو قائم رکھنے کے لیے سب سے زیادہ قیمتی علم سائنس ہے - "بالواسطہ حفاظت نفس" کے لیے جس کو ہم حصول معاش کہتے ہیں سب سے زیادہ قیمتی علم سائنس ہے فرائض والدین کے باقاعدہ ادا کرنے کے لیے مناسب ہدایت صرف سائینس سے حاصل ہوتی ہے - گزشتہ و موجودہ قومی زندگی جس کے بغیر کوئی باشندہ شہر درستی سے اپنے چال چلن کا انتظام نہیں کر سکتا - اُس کو کھولنے کے لیے جس کُنجی کی ضرورت ہے وہ سائنس ہی ہے - علیٰ ہٰذا القیاس ہر قسم کے فن کی پُوری پُوری تکمیل اور اُس سے موجودہ لطف اُٹھانا - اِس مقصد کے واسطے بھی سائینس ہی ہم کو تیار کرتا ہے اور عقلی و اخلاقی و مذہبی تربیت کی غرض سے بھی سب سے زیادہ موثر مطالعہ سائنس ہے - جو سوال پہلے پہل نہایت پریشان

مضمون کے عنوان پر جو سوال درج کیا گیا ہے اس کا جواب کہ سب سے زیادہ قیمتی علم سائنس ہے

؂ موقع اور محل کی مناسبت سے یہ اشعار ترجمہ میں بڑھا دئے گئے ہیں - مترجم

کرنے والا معلوم ہوتا تھا دوران تحقیقات میں نسبتہً آسان ہوگیا ہے - اب ہمکو اس
بات کا اندازہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ مختلف قسم کے انسانی مشاغل کی
عظمت کس قدر ہے اور کس کس قسم کی تعلیم اُن مشاغل کے واسطے ہم کو لائق بناتی
ہے - کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں - کہ سائینس کا مطالعہ - اپنے نہایت ہی وسیع معنوں میں
اُن تمام مشاغل کے لیے نہایت عمدہ طور پر تیار کرتا ہے - ہم کو مختلف علموں کے
دعووں کا فیصلہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کون سے علم کی قدر و قیمت زیادہ ہے
گو رسمی و اعتباری ہو - اور کون سے علم کی قدر و قیمت کم ہے - گو اصلی و واقعی ہو - کیوں کہ
ہم نے تحقیق کر لیا ہے کہ جو علم دیگر اعتبارات سے سب سے زیادہ قیمتی ثابت ہو چکا
ہے اُس کی اصلی و ذاتی قدر و قیمت بھی سب سے زیادہ ہے - اُس کی قدر و قیمت
لوگوں کی رائے پر منحصر نہیں ہے - بلکہ ایسی ہی مستقل اور معیّن ہے جیسا کہ انسان کا
تعلق گرد و پیش کی دنیا سے - چوں کہ سائینس کی حقیقتیں ضروری اور ابدی ہیں - اس لیے
تمام سائنس تمام نوع انسان سے مدّت معین کے لیے تعلق رکھتا ہے - آج کل اور
نہایت ہی بعید آیندہ زمانہ میں بھی لوگوں کے چال چلن کے باضابطہ انتظام کے لیے
سائنس کی عظمت ضرور بے حد و حساب رہے گی - تاکہ وہ جسمانی - عقلی - اور تمدنی حیثیت
سے علم المعاشرت کو سمجھ سکیں - اور باقی تمام سائنس کو اس حیثیت سے سمجھ سکیں
کہ وہ علم المعاشرت کی کنجی ہے -

اگرچہ سائینس کے مطالعہ کی عظمت ہر قسم کے مطالعہ سے بہت ہی زیادہ
فوقیت رکھتی ہے - تاہم اس زمانہ میں کہ لوگوں کو اپنی تعلیم پر بڑا ناز ہے - سائنس کی
تعلیم پر سب سے کم توجہ کی جاتی ہے - حالاں کہ اگر سائنس نہ ہوتا تو جس کو ہم تہذیب
کہتے ہیں - اُس کا کہیں وجود ہی نہ ہوتا - اس پر بھی ہماری تعلیم میں جس کو ہم "مہذّبانہ
تعلیم" کہتے ہیں - سائنس کا عنصر اس قدر کم ہے کہ گویا نہ ہونے کے برابر ہے - اگرچہ

ہرچند سائنس کے فوائد مسلّم ہیں - مگر لوگ اب تک سائنس کی طرف سے عموماً غافل ہیں -

سائنس ہی کی ترقی کی بدولت یہ بات ہے کہ جہاں کسی زمانہ میں صرف ہزاروں آدمیوں کو خوراک مل سکتی تھی - اب لاکھوں کھا آدمی پرورش پاتے ہیں - تاہم ان لاکھوں کھا آدمیوں میں سے صرف چند ہزار آدمی اُس تعلیم کا کسی قدر ادب ولحاظ کرتے ہیں جس نے ان کی زندگی کو ممکن کر دیا[1] ہے - اگرچہ اشیا کے خواص و تعلقات کے روز افزوں علم

[1] انگلستان - جیسے چھوٹے سے ملک میں جس کی مردم شماری صرف ۳ تین کروڑ ہے - اور یہ مردم شماری صوبہ جات متحدہ آگرہ واودھ کی مردم شماری سے بھی بقدر ایک ثلث کے کم ہے - بقول مصنّف اگر چند ہزار آدمی سائنس کی تعلیم کی طرف متوجہ اور اُس کے قدر کرنے والے موجود ہیں - تو یہ تعداد کچھ کم نہیں ہے - انگلستان کی موجودہ ترقی کا حال سب کو معلوم ہے - عیاں را چہ بیاں - مگر مصنّف اس ترقی کو کافی نہ سمجھ کر اپنی قوم کو آگے قدم بڑھانے کی ترغیب دیتا ہے - وائے برحال ہندوستان - جہاں ۳۰ تیس کروڑ باشندوں میں سے کئی ہزار تو کجا کئی سو آدمی بھی ایسے نہیں نکلیں گے - جنھوں نے سائنس کی معمولی ہی تعلیم حاصل کی ہو - اور اگر سائنس کے عملی پہلو کو لیا جائے تو یہ تعداد صفر سے متجاوز نہ ہوگی - ہمارے ملک میں سائنس کی علمی و عملی تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت نہایت شدید ہے - اور ابنائے مُلک کی ایک معتدبہ تعداد کو اس طرف ضرور توجہ کرنی چاہیئے - اگر یہ فرض کفایہ ادا نہ کیا گیا تو تمام اہل ملک خدائے تعالیٰ کے سامنے گنہگار ٹھیرینگے - کہ اُنھوں نے اپنی خدا داد قابلیتوں کو معطل کر دیا - اور ملک کو اُن سے فائدہ نہ پہنچایا - قحط کے متواتر دوروں سے آئے دن لاکھوں آدمی بھوکوں مرتے ہیں - اور کروڑوں آدمیوں کو پیٹ بھر کر روٹی میسر نہیں ہوتی - اگر ہندوستان میں سائنس کی علمی و عملی ترقی ہو - جابجا صنعت و حرفت کے مختلف کارخانے کھل جائیں تو ملک کا افلاس بہت کچھ دُور ہو سکتا ہے - ہمارے ہموطنوں نے تعلیم کا بڑا مقصد یہ سمجھ رکھا ہے - کہ بی اے - یا ایم اے کی ڈگری حاصل کر کے سرکاری نوکری حاصل کر لیں - اوّل تو نوکری ہی غلامی ہے - دوسرے اُس کا دائرہ اُسی نسبت سے روز بروز تنگ ہوتا جاتا ہے جس نسبت سے کہ تعلیم یافتوں کی تعداد میں ترقی ہوتی جاتی ہے - پس ضرور ہے کہ اس بھیڑیا چال کو روکا جائے - میری اس رائے سے کسی کو اختلاف نہ ہوگا - کہ موجودہ تعلیم مُلک میں مفلسوں کی تعداد کو ترقی دے رہی ہے - اس کا انسداد بجز اس کے ممکن نہیں ہے کہ سائنس کی تعلیم کی طرف لوگوں کو توجہ دلائی جائے - اور ہر قسم کے کارخانے ملک میں کھولے جائیں تاکہ کروڑوں مفلس اور فاقہ مست روزی کے لگ جائیں - اب وقت آگیا ہے کہ علی گڈہ کالج سائنس اور صنعت و حرفت کی تعلیم کو بھی اپنے اہم ترین مقاصد میں داخل کر لے - اگر اس کی طرف سے غفلت کی گئی تو آئندہ چل کر اُس کا تدارک سخت دشوار ہو جائیگا -

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہ رہی ہے گنگا ؛ کچھ کر لو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں مترجم

(سائنس) نے قبائل خانہ بدوش کی حالت میں اتنی ہی تبدیلی پیدا نہیں کی - کہ وہ ترقی کر کے متمدن اور کثیر الافراد قومیں بن گئے - بلکہ ان قوموں کے بے شمار لوگوں کو ایسا عیش و آرام بہم پہنچا دیا ہے - جو اُن کے قلیل التعداد ننگے پھرنے والے آباو اجداد کے وہم و گمان میں بھی کبھی نہ آیا تھا - اور نہ وہ اُس کا یقین کر سکتے تھے - تاہم ہماری اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیمی درس گاہوں میں اب اب کر کے اس قسم کے علم کی وقعت کو - ایک طرح کی بے دلی کے ساتھ تسلیم کرنے لگے ہیں - مثلاً ہر قدرتی شے کے غیر متبدل لوازم و ملزومات اور نتائج سے آہستہ آہستہ واقفیت حاصل کرنے اور غیر متغیر قوانین کے قایم کرنے کی بدولت - ہم کو نہایت ہی سخت توہمات سے نجات ملی ہے - اگر سائنس نہ ہوتا تو ہم اب تک چیزوں کی پرستش کرتے رہتے - یا سینکڑوں بیلوں کی قربانیوں سے شیطانی دیوتاؤں کو خوش کیا کرتے - سائنس جس نے اشیا کی نسبت نہایت ہی ذلیل خیالات کو دور کر کے مخلوقات کی عظمت و جلالت ہمارے دلوں میں بٹھا دی ہے - ہماری الٰہیات کی کتابوں میں اس سائنس کے برخلاف لکھا جاتا ہے - اور ہمارے خطیب برسر منبر اُس سے ناک بھوں چڑھاتے ہیں ۔

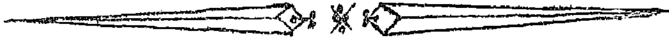
ایک ایشائی حکایت جس پر تمثیل و استعارہ کے پیرایہ میں سائنس کی عظمت اور لوگوں کی اس سے غفلت کا حال بیان کیا گیا ہے

ہم ایک ایشائی کہانی کا ترجمہ بیان کرتے ہیں :-

"علموں کے خاندان میں سائنس ایک مزدورنی ہے - جو محنت مشقت کے کام کرتی ہے - اُس کی خوبیاں تاریکی میں پڑی ہوئی - اور لوگوں کی آنکھوں سے چھپی ہوئی ہیں - اُس کے کمالات کو کوئی تسلیم نہیں کرتا - سارے کام دھندے اُس کو سونپ دئے گئے ہیں - اُسی کی عقل - سلیقہ اور سرگرمی کی بدولت تمام آرام اور خوشیاں حاصل ہوئی ہیں - حالانکہ وہ لگاتار سب کی خدمت کرتی ہے - مگر اُس کو گمنامی کی حالت میں ڈال رکھا ہے - تاکہ اُس کی مغرور بہنیں لوگوں کی آنکھوں میں اپنے پرائے

دھرا نے پھولوں کی بھڑک دکھائیں۔"

مگر یہ تمثیل اور بھی زیادہ صادق آتی ہے۔ کیوں کہ اب ہم اُس نتیجہ تک پہنچے جاتے ہیں۔ جب کہ درجے بدل جائیں گے۔ اور یہ مغرور بہنیں دریائے فراموشی میں ڈوب جائیں گی۔ جس کی وہ مستحق ہیں۔ مگر سائنس کو قدر و قیمت اور حسن دونوں میں سب سے اعلیٰ درجہ دیا جائے گا۔ اور اُس کی حکومت سب سے بالا ہوگی۔



باب دوم

تعلیم عقلی

مدارج تعلیم اور معاشرت کی مختلف حالتوں کا باہمی تعلق۔

نظام تعلیم کے مختلف مدارج اور معاشرت کی مختلف حالتوں کے درمیان جن کے ساتھ وہ مدارج موجود رہے ہیں۔ باہمی تعلق ضرور ہوتا ہے۔ ہر ایک زمانے کے قوانین کی مشترک اصلی قومی طبیعت ہی ہے گو اُن کے خاص عمل کچھ ہی ہوں۔ اس لیے اُن میں خاندانی مشابہت کا پایا جانا ضروری ہے۔ جس زمانہ میں لوگوں نے اپنے عقیدہ کے مطلب کو ایسے شخص سے حاصل کیا تھا جس کو معصوم سمجھا جاتا تھا۔ اور جس نے اُس عقیدے کی تشریح کرنی مناسب نہیں سمجھی تھی۔ اُس زمانہ میں یہ بات قدرتی تھی کہ بچوں کی تعلیم بھی محض تحکمانہ اصول پر ہو۔ جس زمانہ میں مذہب کا اصول یہ تھا کہ ایمان لاؤ اور سوال نہ کرو، اُس زمانہ میں مدرسہ کی تعلیم کے لیے بھی یہی اصول مناسب تھا۔ برعکس اس کے آج کل جب کہ فرقۂ پراٹسٹنٹ[1] (معترضین) نے بالغوں کو مذہبی معاملات میں اپنی ذاتی رائے قائم کرنے کا حق دیدیا ہے۔ اور عقل سے کام لینے کا دستور جاری کردیا ہے بچوں کی تعلیم میں بھی اُسی مناسبت

[1] سنہ ۱۵۱۷ء میں ملک جرمنی کے ایک پادری مسمی لوتھر نے مذہب عیسوی کی خرابیوں کے دور کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ جن عیسائیوں نے اُس کی اصلاح کو قبول کیا اُن کا ایک جداگانہ فرقہ قائم ہوگیا ہے اس فرقہ کو پراٹسٹنٹ (معترضین) کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ مترجم

سے ایک تغیر پیدا ہوگیا ہے۔ اور اُن ہی کی سمجھ کے مطابق توضیح و تشریح کی کارروائی شروع ہوگئی ہے جس زمانہ میں بادشاہ بالکل مطلق العنان ہوتا تھا۔ اُس کے احکام سخت ہوتے تھے۔ ہیبت اور دبدبہ کے زور سے حکومت کی جاتی تھی خفیف جرموں پر موت کی سزا دی جاتی تھی۔ سرکشوں سے انتقام لینے میں بے رحمی ظاہر کی جاتی تھی۔ اُس کا لازمی نتیجہ یہی تھا کہ ملکی اقتدار کے ساتھ ساتھ مدرسہ کی تادیب بھی ویسی ہی سخت ہوتی۔ یہ وہ تادیب تھی جس میں بے شمار احکام صادر ہوتے تھے اور ہر حکم کی خلاف ورزی پر "اُٹھتے جوتی اور بیٹھتے لات" کا سلوک کیا جاتا تھا۔ یہ وہ تادیب تھی جس کی غیر محدود خود مختاری کو قمچی اور بید اور اندھیری کوٹھری کی قید کے ذریعہ سے قایم رکھا جاتا تھا۔ برخلاف اِس کے پولیٹکل آزادی کی ترقی شخصی عمل کو روکنے والے قوانین کی منسوخی۔ اور ضابطہ فوجداری کی اصلاح کے ساتھ ساتھ تعلیم میں بھی جبر و تعدی کی کمی ہوگئی ہے۔ شاگردوں کی روک ٹوک بہت کم ہوگئی ہے۔ اُن کو قابو میں رکھنے کے لیئے سزا کے سوا اور وسائل استعمال کیے جاتے ہیں۔ اُس رُہبانیت کے زمانے میں جب کہ لوگ سخت ترین ریاضت کے اصول پر عمل کر کے یہ سمجھتے تھے کہ لذائذ اور حظِ نفس سے جس قدر پرہیز کریں گے اِسی قدر زیادہ نیک بن جائیں گے۔ اُس زمانہ میں لا محالہ یہی خیال ہونا چاہیئے تھا کہ سب سے بہتر تعلیم وہی ہے جو بچّوں کی خواہشوں کو سب سے زیادہ روک دے۔ اور اُن کی تمام قدرتی چستی و چالاکی کو یہ کہہ کر فنا کر دے کہ "تم کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے" برعکس اس کے اس زمانہ میں جب کہ خوشی کو زندگی کا ایک واجبی مقصد سمجھنے لگے ہیں جب کہ محنت کے گھنٹے کم ہوتے جاتے ہیں۔ اور عام پسند تفریح طبع کے سامان مہیا ہوتے جاتے ہیں والدین اور معلّم یہ بات سمجھنے لگے ہیں کہ نہایت ہی طفلانہ خواہشوں کا پورا کرنا بھی حق بجانب ہے۔ اور یہ کہ طفلانہ کھیل کود کی طرف بچّوں کو ضرور شوق دلانا چاہیئے۔ اور یہ بھی کہ بچّے

کے نشو و نما پانے والے نفس کی رغبتیں بالکل شیطانی ہی نہیں ہیں۔
جیسا کہ پہلے خیال کیا جاتا تھا۔ جس زمانے میں سب لوگوں کو اس امر کا یقین تھا کہ "تجارت
کو بخشش اور ممانعت[1] کے ذریعہ سے قایم کرنا ضروری ہے۔ دستکاری کے
مصالح اور صفت اور قیمت کو مقرر کرنے کی ضرورت ہے۔ اور یہ کہ روپیہ کی قیمت قانون
کے ذریعہ سے معین کی جا سکتی ہے،، یہ وہی زمانہ تھا جب کہ لوگوں کے دلوں میں
خواہ مخواہ اس قسم کے خیالات سمائے ہوئے تھے کہ "بچے" کی طبیعت کو فرمائش کر کے
جیسا چاہیں بنوا سکتے ہیں۔ معلم ہی اُس کو قواے عقلیہ عطا کرتا ہے۔ اُس کا نفس ایک
ظرف ہے جس میں علم رکھا جاتا ہے۔ اور وہیں اُستاد کے نمونہ کے موافق تیار ہو جاتا ہے،،
مگر اس تجارتی آزادی کے زمانہ میں۔ جب کہ ہم کو یہ بات معلوم ہوتی جاتی ہے کہ ہر چیز
میں اپنا انتظام آپ رکھنے کی قوت بہت زیادہ موجود ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ لوگ
خیال کیا کرتے تھے۔ یہ کہ صنعت۔ تجارت۔ زراعت اور جہازرانی۔ انتظام
کے ساتھ جس طرح چل سکتی ہیں۔ بغیر انتظام کے زیادہ تر خوبی کے ساتھ چل سکتی ہیں۔
اور یہ کہ پولٹیکل حکومتوں کے کارگر ہونے کے لیے ضرور ہے کہ وہ اپنی اندرونی
قوّت سے نشو و نما حاصل کریں۔ نہ کہ کسی خارجی قوت سے۔ تو ہم کو اس امر کا علم بھی
حاصل ہوتا جاتا ہے کہ روحانی ارتقا کا ایک ایسا قدرتی عمل موجود ہے کہ اگر اس میں
مداخلت کی جائے تو ضرور نقصان ہوگا۔ اور یہ کہ ہم اس بات کے مجاز نہیں ہیں کہ
نشو و نما پانے والے نفس پر اپنی مصنوعی تدبیروں کو زبردستی عمل میں لائیں۔ بلکہ علم

---

[1] یہاں بخشش سے یہ مراد ہے کہ ملکی کارخانوں کو سلطنت کی طرف سے مالی مدد دی جائے اور ممانعت
سے یہ مراد ہے کہ غیر ملکوں کا مال جو اپنے ملک میں آئے اُس پر سخت محصول لگا دیا جائے تاکہ باہر کے مال کی قیمت
گراں ہو جائے اور رعایا اس کو نہ خرید سکے۔ تجارت کی آزادی سے پہلے تمام یورپ میں یہی قانون رائج تھا۔ انگلستان
میں کوئی پچاس ساٹھ سال سے یہ قانون منسوخ ہو گیا ہے مگر یورپ کے بعض ممالک مثلاً فرانس اور جرمنی میں یہی قانون اب تک
جاری ہے۔ مترجم۔

سماجی کا لوجی بھی رسد اور مانگ کا ایک قانون ہمارے سامنے ظاہر کرتا ہے۔ جس کی پابندی۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ کچھ نقصان نہ ہو۔ ہم کو ضرور کرنی چاہیئے۔ پس قدیم تعلیمی دستورالعمل اپنے بعید الفہم اُصول میں۔ اپنی سخت تربیت میں۔ اپنی بے حد روک ٹوک میں۔ اپنی نفس کشی میں جس کا اُس کو دعویٰ ہے۔ اور لوگوں کی تدبیروں پر اپنا اعتقاد رکھنے میں اپنے زمانہ کے طریق معاشرت سے مشابہت رکھتا تھا۔ علیٰ ہذالقیاس۔ برعکس ان خصوصیتوں کے تربیت کے نئے اصول ہمارے زیادہ تر آزاد شدہ مذہبی وملکی قوانین کے مطابق ہیں۔

مگر ابھی اور زیادہ مشابہتیں باقی ہیں۔ جن پر ہم نے اب تک توجہ نہیں کی یعنی وہ مشابہت جو باہم اُن عملوں میں پائی جاتی ہے جن سے یہ جداگانہ تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں اور نیز وہ مشابہت جو مختلف الجنس رائے کی متعدد حالتوں کے درمیان پائی جاتی ہے جو حالتیں اُن عملوں سے پیدا ہوئی ہیں۔ چند صدیوں پہلے سب لوگوں کے مذہبی۔ ملکی اور تعلیمی عقاید یکساں تھے۔ سب رومن کیتھولک تھے۔ سب شخصی سلطنت کے حامی تھے۔ سب ارسطو[1] کے پیرو تھے۔ کسی شخص کو مدرسہ صرف ونحو کے اُس دستورالعمل پر اعتراض کرنے کا خیال نہ آتا تھا جس کے موافق سب نے تعلیم وتربیت حاصل کی تھی۔ اب اُن ہی لوگوں نے ہر ایک حالت میں اس یک رنگی کے بجائے اُس اختلاف کو رکھا ہے جو ہمیشہ بڑھتا ہی رہتا ہے۔ شخصیت کی حمایت کا وہ میلان جو فرقہ پراٹسٹنٹ کی ایک بڑی جماعت پیدا کرنے میں ممد ومعاون ہوا۔ اور بعد ازاں اس وقت سے اب تک مذہبی فرقوں کی روز افزوں تعداد پیدا کرتا رہا ہے وہ میلان جس نے پولٹیکل فریق پیدا کر دئے ہیں اور

یا وجہ ہے کہ آج کل تعلیم کے بہت سے جدید طریقے پیدا ہو گئے ہیں؟

[1] ارسطو زمانہ قدیم میں یونان کا مشہور حکیم گزرا ہے ۳۸۴ قبل مسیح میں پیدا ہوا تھا اور ۳۲۲ قبل مسیح میں وفات پائی۔ مترجم

دو ابتدائی فریقوں[1] میں سے آج کل بے شمار فریق پیدا کر دئے ہیں جن کی تعداد میں ہر سال اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ وہ میلان جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیکن نے مدارس کے برخلاف بغاوت اختیار کی۔ اور جس کی وجہ سے اس ملک اور بیرونی ممالک میں چند جدید طریق تعلیم پیدا ہو گئے ہیں یہی وہ میلان ہے جس نے تعلیم میں بھی فریق اور نئے طریقے پیدا کر دئے ہیں۔ چونکہ یہ عمل ایک ہی اندرونی تبدیلی کے بیرونی نتیجے ہیں۔ اس لیے وہ قریب قریب ایک ساتھ ہی پیدا ہوئے ہیں۔ اقتدار کا زوال۔ خواہ پوپ[2] کا اقتدار ہو خواہ حکما کا۔ خواہ بادشاہ کا۔ خواہ اتالیق کا۔ فی الحقیقت ایک ہی کرشمۂ قدرت ہے۔ اس کرشمہ کی ہر ایک صورت میں ایک میلان آزادانہ عمل کی طرف نظر آتا ہے۔ اور یہ میلان آزادی خود اس انقلاب کے وقوع پذیر ہونے میں اسی طرح دیکھا جاتا ہے۔ جس طرح کہ خیال و عمل کی نئی صورتوں میں۔ جو اس انقلاب سے پیدا ہوتی ہیں۔

مختلف طریق تعلیم کا پیدا ہونا درحقیقت مناسب ہے اور اسی اختلاف رائے کی بدولت ایک معقول طریقۂ تعلیم نکل آئے گا۔

تربیت اطفال کے طریقوں کی اس زیادتی پر بہت سے لوگ افسوس کرینگے مگر جو شخص آزادانہ نظر سے غور کرے گا اس کو معلوم ہو جائیگا کہ یہ کثیر التعداد طریقے ایک آخری معقول طریقہ کے قرار دینے کا ذریعہ ہیں۔ علم الہیات میں اختلاف رائے کی بابت کچھ ہی خیال کیا جائے۔ مگر یہ بات صاف ظاہر ہے کہ تعلیم کے معاملہ میں اختلاف رائے کا یہی نتیجہ ہے کہ تقسیم محنت کی وجہ سے تحقیقات میں سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔

---

[1] ابتدائی دو فریقوں سے مراد لبرل اور کنسرویٹو ہیں۔ لبرل وہ فریق ہے جو ملکی یا مذہبی معاملات میں آزادانہ رائے رکھتا ہے اور موجودہ پابندیوں کو دور کرنا چاہتا ہے۔ کنسرویٹو اس فریق کو کہتے ہیں جو قدیم آئین اور رسم و رواج کو بحال رکھنا چاہتا ہے۔ مترجم

[2] عیسائیوں کے فرقہ رومن کیتھولک کے سب سے بڑے پادری کو پوپ کہتے ہیں جو ملک اٹلی کے دار السلطنت شہر روما میں رہتا ہے۔ رومن کیتھولک فرقہ کے لوگ اس کو محفوظ عن الخطا اور نائب

اگر تعلیم کا صحیح طریقہ ہمارے پاس موجود ہوتا - تو البتہ اُس سے انحراف کرنا مضر ہوتا
مگر چوں کہ صحیح طریقہ ابھی دریافت کرنا ہے - اِس لیے بے شمار جداگانہ تحقیقات
کرنے والوں کی کوششیں جو اپنی تحقیقات کو مختلف پہلوؤں میں جاری رکھتے ہیں
صحیح طریقہ کے دریافت کرنے کے لیے بہ نسبت کسی دوسرے ذریعہ کے جو تجویز کیا
جا سکتا ہے - بہتر ذریعہ ہے - چوں کہ ہر شخص کے دل میں کوئی نہ کوئی نیا خیال پیدا
ہوتا ہے جس کی تھوڑی بہت بنیاد واقعات پر ہوتی ہے چوں کہ ہر شخص اپنی تجویز
کی تائید میں سرگرم ہوتا ہے - اور اُس کی صحت کو جانچنے کے لیے اُس کے پاس
بہت سے موقع ہوتے ہیں - اور وہ اپنی کامیابی کو ظاہر کرنے کی کوششوں میں
نہیں تھکتا - چوں کہ ہر شخص باقی طریقوں پر بے دردی کے ساتھ نکتہ چینی کرتا ہے
اس لیئے - اجتماعِ قوی کے ذریعہ سے یہ نتیجہ ضرور پیدا ہو کر رہیگا کہ یہ سب طریقے
رفتہ رفتہ ٹھیک رستہ کے قریب پہنچ جائیں گے - باقاعدہ طرز تعلیم کا جس قدر حصہ
کوئی شخص دریافت کرتا ہے اور بار بار اُس کے نتیجوں کو ظاہر کرتا ہے اُس حصہ کو
اختیار کرنے کے لیے لوگ ضرور مجبور ہو جائین گے - اور جس قدر غلط عمل اُس طریقہ کے
ساتھ اُس نے شامل کر دئے ہیں - وہ متواتر تجربہ اور ناکامیابی کی وجہ سے ضرور رد ہو جائینگے
پس اس طرح حقایق اصلیہ کے اجتماع اور غلطیوں کے اخراج سے آخر کار ایک
صحیح اور کامل اصول کا مجموعہ ضرور تیار ہو جائے گا - انسانی رائے تین صورتیں
اختیار کرتی ہے - یعنی جہلا کا اتفاق - محققین کا اختلاف - اور عقلا کا اتفاق
ظاہر ہے کہ ان میں سے دوسری صورت - تیسری صورت کی بنیاد ہے - یہ صورتیں نہ صرف
باعتبار زمانہ (ایک دوسرے سے) متاخر ہیں - بلکہ سببیت کے لحاظ سے بھی متاخر ہیں -

بقیہ حاشیہ صفحہ (۹۴) صحیح سمجھتے ہیں - اور اُس کے حکم کو حضرت عیسیٰ ع کا حکم سمجھتے ہیں - جب سے فرقہ
پراٹسٹنٹ نکلا ہے - اس وقت سے پوپ کے اقتدار میں بہت کچھ فرق آگیا ہے - اور عیسائیوں کا ایک معتدبہ گروہ پوپ کی حکومت سے آزاد ہو گیا
مترجم

پس طرق تعلیم کے موجودہ تناقص کو دیکھ کر ہم کیسے ہی بے قرار کیوں نہ ہو جائیں اور اُن خرابیوں پر جو اُن کے ساتھ لگی ہوئی ہیں۔ ہم کتنا ہی افسوس کیوں نہ کریں۔ تاہم یہ بات ضرور تسلیم کرنی چاہیے کہ یہ انقلاب کا زمانہ ہے جس میں سے گزرنا ضروری ہے اور جس کے آخری نتائج عمدہ برآمد ہونگے۔

تعلیم کے قدیم طریقوں کو ترک کرنے اور جدید طریقوں کو اختیار کرنے کے لیے پچاس سال سے کشاکش ہو رہی ہے۔

اس ضمن میں کیا یہ بات مفید نہ ہوگی کہ ہم اپنی ترقی کا محاسبہ کریں؟ پچاس سال کے مباحثہ۔ تجربہ۔ اور نتائج کے مقابلہ کے بعد کیا ہم کو منزلِ مقصود کی طرف جسکو پہلے ہی طے کرنا چاہیے تھا چند قدم بڑھنے کی توقع نہیں رکھنی چاہیے؟ اس عرصہ میں بعض پُرانے طریقے ضرور متروک ہو گئے ہونگے۔ بعض نئے طریقے ضرور قائم ہو گئے ہونگے اور بہت سے دوسرے طریقوں کو عام طور پر ترک اور اختیار کرنے کے لیے ضرور کشمکش و کوشش ہو رہی ہوگی۔ ظن غالب ہے کہ ان مختلف تغیرات میں بھی۔ جب کہ اُن کو پہلو بہ پہلو رکھا جائے۔ اسی قسم کی خصوصیتیں ہم کو نظر آئیں۔ یعنی اُن میں ایک عام میلان پایا جائے۔ اور اُس کا نتیجہ یہ ہو کہ ہم کو اُس رُخ کا سُراغ مل جائے۔ جدھر تجربہ ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ اور ایسے اشارے حاصل ہو جائیں جن سے معلوم ہو سکے کہ اور زیادہ ترقیاں کیوں کر حاصل ہو سکتی ہیں۔ پس ہم اس مضمون پر زیادہ غور اور تعمق کی غرض سے زمانہ ماضی وحال کی تعلیم کے بڑے بڑے اختلافات پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

ایک غلطی سے نجات پاکر لوگ عموماً دوسری متضاد غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں جسمانی اور عقلی تربیت کی مثال سے اس عام قاعدہ کی توضیح۔

یہ عام قاعدہ ہے کہ ہر ایک غلطی کے انسداد کے بعد دوسری متضاد غلطی کو عارضی عروج حاصل ہو جاتا ہے۔ اور ایسا ہی ہوا بھی کہ جس زمانہ میں صرف جسمانی نشوونما لوگوں کا مقصود تھا۔ اُس کے بعد وہ زمانہ آیا جب کہ محض عقلی تربیت کی طرف لوگوں کا خیال تھا۔ جب کہ دو تین سال کی عمر میں بچوں کے سامنے کتابیں رکھ دی جاتی تھیں۔ اور یہ سمجھتے تھے کہ فقط علم کا حاصل کرنا ہی ایک شے ضروری ہے۔ اِس کے سوا عموماً ایسا ہوا کرتا ہے کہ اِن مزاحمتوں میں سے کسی مزاحمت کے بعد آئندہ ترقی

اس طرح حاصل ہوتی ہے کہ تشنفا و غلطیوں کو مساوی درجہ پر رکھا جائے۔ اور یہ سمجھ لیا جائے کہ وہ ایک وسط حقیقی کے اطراف ہیں۔ (جو افراط و تفریط سے خالی نہیں ہیں) اسی طرح اب ہم کو اس امر کا یقین ہوتا جاتا ہے۔ کہ جسم اور نفس دونوں کی نگہداشت کرنی چاہیئے اور دونوں کے مجموعہ کا نشوونما ہونا چاہیئے۔ جبری طریقہ کو بہت سے لوگوں نے ترک کر دیا ہے۔ اور کسی قوت کو قبل از وقت ترقی دینا پسند نہیں کیا جاتا لوگ سمجھنے لگے ہیں کہ زندگی میں کامیابی کے لیے پہلی شرط ہے اچھا حیوان بننا اچھے سے اچھا دماغ بےکار ہے۔ اگر اس سے کام لینے کے لیے کافی قوت حیات موجود نہ ہو۔ اور اسی وجہ سے جسمانی قوت کے سرچشمہ کو قربان کرکے دماغی قوت کا حاصل کرنا آج کل حماقت سمجھا جاتا ہے۔ یہ وہ حماقت ہے جس کی مثالیں اُن نوخیز بچوں کی آخری ناکامیابی سے ہمیشہ ملتی رہتی ہیں جو بچپن میں غیر معمولی طور پر ذکی اور طباع ہوتے ہیں۔ پس ہم اس مقولہ کی حکمت کو معلوم کرتے جاتے ہیں کہ تعلیم کا ایک بھید یہ ہے کہ "وقت کو عقلمندی سے کیوں کر گنوانا چاہیئے"

طوطے کی طرح یاد کر لینے کا طریقہ اب متروک ہوتا جاتا ہے۔ اس طریقہ کے نقصانات۔

کتابوں کو رٹ لینے کا عام رواج جو کسی زمانہ میں تھا۔ روز بروز ساقط الاعتبار ہوتا جاتا ہے۔ زمانہ حال کے تمام معتبر اساتذہ حروف تہجی کی تعلیم کے قدیم عملی طریقہ کو قابل الزام ٹھیراتے ہیں۔ آج کل پہاڑے اکثر تجربہ کی رو سے سکھائے جاتے ہیں زبانوں کی تحصیل میں۔ مدارس صرف و نحو کے طریقہ کی بجائے ایسے طریقے تجویز کیے گئے ہیں جو اُس قدرتی عمل پر مبنی ہیں جس کو بچہ اپنی مادری زبان کے سیکھنے میں اختیار کرتا ہے "مدرسہ تعلیم المعلمین واقع مقام بیٹرسی[1]" کی رپورٹوں میں تعلیم کے اُن طریقوں کا ذکر کرکے جو وہاں رائج ہیں یہ بیان کیا گیا ہے کہ "وہ تمام ابتدائی نصاب کی تعلیم زیادہ تر زبانی ہوتی ہے۔ اور اسکی توضیح و تشریح کے لیے حتی الامکان موجودات قدرت کی طرف رجوع کی جاتی ہے" اور سب صورتوں میں ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ رٹ لینے کا طریقہ اپنے زمانہ کے

[1] بیٹرسی۔ نواح لندن میں سے ایک مقام ہے۔ اور دریا سے ٹیمز پر واقع ہے۔ مترجم

دوسرے طریقوں کی طرح ۔ صورتوں اور علامتوں کو ۔ بہ نسبت اُن چیزوں کے جن کو وہ صورتیں اور علامتیں تعبیر کرتی ہیں ۔ زیادہ عزیز رکھتا تھا ۔ لفظوں کا صحت کے ساتھ دہرا لینا سب کچھ تھا ۔ اُن کے معنوں کا سمجھنا ہیچ تھا ۔ اور اس طرح سے رُوحِ معنی کو حرفوں پر قربان کر دیا جاتا تھا ۔ آخر کار یہ بات معلوم ہو گئی ہے کہ مثل دوسری صورتوں کے اس صورت میں یہ نتیجہ اتفاقی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ جس قدر علامتوں پر توجہ کی جاتی ہے اسی قدر اصل چیزوں کی طرف سے جن کو وہ علامتیں ظاہر کرتی ہیں بے توجہی ہوتی ہے یا جیسا کہ مانٹین¹⁵ نے ایک مدت پہلے کہا تھا کہ "حفظ یا ذکر لینا حقیقی علم نہیں ہے"

طوطے کی طرح تعلیم دینے کے ساتھ ہی قواعد کے ذریعہ سے تعلیم دینے کا طریقہ بھی جو قریب قریب اُسی قسم کا ہے ۔ زائل ہوتا جاتا ہے ۔ نیا طریقہ یہ ہے کہ اوّل خاص مثالیں اور پھر عام نتائج بتائے جاتے ہیں ۔ اگرچہ یہ طریقہ جیسا کہ مدرسۂ بلیٹرسی کی رپورٹوں میں درج ہے "اُس طریقہ کے برعکس ہے جس کی پیروی عموماً کی جاتی ہے جس میں شاگردوں کو پہلے ہی قاعدہ بتا دیا جاتا ہے"، تاہم تجربہ سے ثابت ہو گیا ہے کہ صحیح طریقہ یہی ہے ۔ قاعدہ سکھانے پر آج کل یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اُس سے محض عملی علم حاصل ہوتا ہے ۔ یعنی صرف ظاہری سمجھ پیدا ہوتی ہے جس کی حقیقت کچھ نہیں ہوتی ۔ تحقیقات کا خالص نتیجہ بتا دینا ۔ اور اُس تحقیقات کو نہ بتانا جو اُس نتیجہ کی طرف اشارہ نمائی کرتی ہے ۔ یہ عمل قوائے عقلیہ کو ضعیف کرنے والا اور غیر موثر بھی ثابت ہوا ہے حقایق عامہ سے باقاعدہ اور مستقل فائدہ اُٹھانے کے لیے یہ امر ضروری ہے کہ اُن کو کمائی کر کے پیدا کیا جائے ۔ یہ مقولہ کہ "آسانی کی کمائی آسانی سے گنوائی"، علم پر بھی ایسا ہی صادق آتا ہے ۔ جیسا کہ دولت پر ۔ چوں کہ قواعد ذہن میں منتشر پڑے رہتے ہیں یعنی مواد موجود فی الذہن سے اُن قواعد کا تعلق ۔ اس اعتبار سے ۔ کہ وہ اُس مواد کا ماحصل ہیں ۔ نہیں ہوتا ۔ اسی وجہ سے وہ بار بار ذہن سے نکل جاتے ہیں ۔ مگر وہ اصول جو اُن

قواعد کے ذریعہ سے تعلیم دینے کی بجائے آج کل اُن کے ذریعہ سے تعلیم دی جا[تی ہے] پہلے طریقے کے نقصانا[ت] اور دوسرے طریقہ کے فو[ائد]

[15] مانٹین ۔ فرانس کا ایک فلسفی اور مضمون نگار تھا ۱۵۳۳ء میں پیدا ہوا اور ۱۵۹۲ء میں فوت ہوا ۔ مترجم

قواعد سے جدا جدا ظاہر ہوتے ہیں - اگر ایک مرتبہ چیتے پر چڑھ جائیں - تو اُن پر مستقل قبضہ ہو جاتا ہے - قواعد پڑھا ہوا طالب علم تو جب اپنے قاعدوں سے آگے بڑھتا ہے گھبرا جاتا ہے مگر جس طالب علم کو اصول کی تعلیم دی جاتی ہے وہ جس قدر مستعدی سے پرانی بات کو حل کرتا ہے اتنی ہی مستعدی سے نئی بات کو حل کر لیتا ہے - قواعد کے ذریعہ سے تعلیم پائے ہوئے اور اصول کے ذریعہ تعلیم پائے ہوئے نفس میں ایسا فرق ہے جیسا مصالح کے ایک منتشر ڈھیر میں اور اُسی مصالح میں جب کہ اُس کو باضابطہ ترتیب دے کر ایک مکمل مجموعہ کی صورت میں ظاہر کیا جائے - اور اُس کے حصوں کو باہم دگر وابستہ کر دیا جائے - اِن دونوں طریقوں میں سے پچھلے طریقہ میں نہ صرف اتنا فائدہ ہے کہ اُس کے اجزاے اصلیہ زیادہ اچھی طرح ذہن میں محفوظ رہتے ہیں - بلکہ بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ طریقہ - تحقیقات کے لیے آزادانہ غور و خوض کے لیے اور دریافت کرنے کے لیے - ایک کارگر وسیلہ ہے - اور ان مقاصد کے لیے پہلا طریقہ بے کار ہے - یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ یہ نری تمثیل ہی تمثیل ہے - نہیں بلکہ یہ بات حرف بہ حرف صحیح ہے - واقعات کو جمع کر کے اُن سے اصول کلیہ کا استنباط کرنا علم کی باضابطہ ترتیب ہے - خواہ مسئلہ صوری کی حیثیت سے اُس پر غور کی جائے خواہ مسئلہ معنوی کی حیثیت سے - عقلی رسائی کا اندازہ اُسی حد تک کیا جا سکتا ہے جس حد تک کہ اِس باضابطہ ترتیب کو عمل میں لایا جاتا ہے -

بخلاف قدیم زمانہ کے آج کل صرف و نحو کی تعلیم بڑی عمر میں شروع کرائی جاتی ہے -

قواعد کی جگہ اصول کو رواج دینے سے اور اُس عمل سے جو ضروری طور پر اُس کا ہم پلہ ہے یعنی مجردات کی تعلیم کو اُس وقت تک چھوڑ دینا - جب تک کہ نفس کو اُن چیزوں سے واقفیت نہ ہو جائے جن سے وہ مجردات حاصل ہوتے ہیں یہ نتیجہ پیدا ہوا ہے کہ جن مضامین کی تعلیم کسی زمانہ میں بچپن ہی میں شروع کرائی جاتی تھی اب اُن کو زمانہ مابعد تک ملتوی رکھا جاتا ہے - اس کی ایک مثال یہ ہے کہ بچوں کو قواعد

(صرف ونحو) کی تعلیم دینے کا سخت احمقانہ دستور متروک ہوگیا ہے۔ مسٹر مارسل[1]
کہتے ہیں ویسے یہ بات بلا تامّل کہی جا سکتی ہے کہ گرامر تعلیم کی پہلی سیڑھی نہیں ہے
بلکہ تکمیل تعلیم کا آلہ ہے"۔ مسٹر وائرٹر کا استدلال حسب ذیل ہے:-

مسٹر وائرٹر کی دلیل اس امر کے متعلق کہ سائنس استقرا کا نتیجہ ہے۔

"صرف ونحو۔ قوانین اور قواعد کا مجموعہ ہے۔ قواعد مشق سے صحیح ہوتے ہیں۔ قواعد استقراء کے نتائج ہیں۔ اور عرصہ دراز کے تجربہ اور واقعات کے مقابلہ کے ذریعہ اُس استقرا تک ہماری رسائی ہوتی ہے۔ بالآخر استقرا زبان کا سائنس اور فلسفہ ہے۔ قدرت کے عمل کی پیروی میں ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ افراد یا اقوام پہلے ہی سائنس تک پہنچ جائیں۔ صرف ونحو یا علم عروض کا خیال تک کبھی کو پیدا نہیں ہوتا۔ مگر برسوں پہلے سے لوگ زبان بولتے اور نظم لکھتے ہیں ایسا نہیں ہوا تھا کہ ارسطو کی منطق کو مدوّن کرنے سے پہلے لوگ حجت اور دلیل لانے کے لیے منتظر بیٹھے رہے ہوں"۔

المختصر چوں کہ صرف ونحو زبان کے بعد بنتی ہے۔ اس لیے اس کو زبان کے بعد سکھایا جائے۔ یہ ایسا نتیجہ ہے کہ جو لوگ قومی یا شخصی ارتقا کے باہمی تعلق کو تسلیم کرتے ہیں۔ وہ سب کے سب اس نتیجہ کے ناگزیر ہونے کو ضرور سمجھ لیں گے۔

قوائے مشاہدہ کی تربیت اور اُس کی عظمت و ضرورت۔

اِن پُرانے دستوروں کے زوال کے زمانہ میں جو نئے دستور پیدا ہو گئے ہیں اُن میں سے سب سے زیادہ اہم قوائے مشاہدہ کی باقاعدہ تربیت ہے۔ ایک مدّت مدید کی کورانہ تقلید کے بعد آخر کار لوگ سمجھتے جاتے ہیں کہ بچوں کے قوائے مشاہدہ کی قدرتی چستی و چالاکی کچھ معنی رکھتی ہے۔ اور کام کی چیز ہے۔ جس بات کو کسی زمانہ میں لوگ ایک فعل عبث۔ یا لہو و لعب۔ یا شرارت۔ جیسی کہ صورت ہو۔ سمجھتے تھے۔ اب اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ جس علم پر آئندہ علم کی بنیاد ہے اُس کو حاصل کرنے کا عمل یہی ہے۔ اسی وجہ سے اسباق الاشیاء کا طریقہ خوب غور و خوض کر کے نکالا گیا ہے۔ مگر اُس کو اچھی طرح کام میں نہیں

[1] مارسل۔ ملک فرانس کا باشندہ اور السنہ مشرقیہ کا عالم تھا۔ ۱۷۶۷ء میں پیدا ہوا تھا اور ۱۸۵۴ء میں فوت ہوا۔ مترجم

لایا جاتا۔ بیکن کا مقولہ کہ "علم طبعی علموں کی ماں ہے" اب لوگ سمجھنے لگے ہیں کہ تعلیم میں اس مقولہ کے کچھ معنی ہیں۔ اشیا کے مرئی ومحسوس خواص کی صحیح واقفیت کے بغیر ہمارے تصورات نادرست ہمارے نتائج مغالطہ خیز۔ اور ہمارے افعال ناکام یا ضرور ہونگے "حواس کی تربیت سے اگر غفلت کی جائے۔ تو آئیندہ کی تمام تربیت میں ایک قسم کی کاہلی۔ تاریکی۔ اور کوتاہی پیدا ہوجاتی ہے جس کا علاج محال ہے" حقیقت میں اگر ہم اس کو سوچیں۔ تو ہم کو معلوم ہوجائیگا کہ کامل مشاہدہ تمام بڑی کامیابی کا جزو اعظم ہے۔ نہ صرف اہل حرفہ۔ عالمان خواص الاشیاء (نیچرلسٹ) اور عالمان سائینس ہی کے لیے مشاہدہ کی ضرورت ہے۔ اور تشخیص امراض کی صحت کے لیے نہ صرف طبیب کا اس پر مدار ہے اور نہ صرف انجینیر کے لیے وہ ایسا ضروری ہے کہ اس کے لیے چند سال کارخانہ میں کام کرنا لازمی قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ ہم سمجھ سکتے ہیں کہ فلسفی بھی دراصل وہی شخص ہے جو اُن چیزوں کے تعلقات کا مشاہدہ کرتا ہے جن کو دوسرے لوگوں نے نظر انداز کردیا تھا۔ اور شاعر بھی وہی شخص ہے جو کائنات میں ایسی باریک باتوں کو دیکھ لیتا ہے۔ کہ اگر وہ باتیں بتا دی جائیں تو سب اُن کو پہچان لیں۔ مگر پہلے سے کسی کے خیال میں نہیں آتیں۔ اِس سے زیادہ کسی بات پر زور دینے کی ضرورت نہیں ہے کہ صاف اور پوری طرح سے اُن باتوں کا دل پر نقش ہوجانا نہایت ہی ضروری ہے عقلمندی کا مضبوط پارچہ بوسیدہ کچے سوت سے نہیں بنا جا سکتے

قدیم زمانہ میں علمی مسائل کی تعلیم معجزات کی شکل میں دی جاتی تھی زمانہ حال میں ان کی تعلیم مادّیات کی شکل میں دی جاتی ہے

واقعات کو معجزات کی شکل میں پیش کرنے کا پُرانا طریقہ متروک ہوتا جاتا ہے۔ اور اُس کی بجائے اُن واقعات کو مادّیات کی صورت میں پیش کرنے کا طریقہ اختیار کرتے جاتے ہیں۔ حقیقی سائنس کے ابتدائی واقعات کا علم آج کل براہ راست قدرتی کاموں کے ذریعہ سے حاصل کیا جاتا ہے۔ جس طرح کہ بناوٹ۔ ذائقہ اور رنگوں کا علم حاصل کیا جاتا ہے۔ حساب کے ابتدائی سبقوں

میں بال فریم[51] (گولیوں کے چوکھٹے) کا استعمال اس امر کی ایک مثال ہے پروفیسر ڈی مارگن[52] کے طریقہ تشریح کتابت اعشاریہ میں بھی اس کی بخوبی توضیح کی گئی ہے۔ مسٹر مارسل کی یہ رائے صحیح ہے کہ وہ جدولیں حفظ کرا دینے کے قدیم طریقہ کو ترک کر کے ماپ تول کے پیمانوں کو اصلی گز اور فٹ، پونڈ[53] اور اونس۔ گیلن اور کوارٹ کے ذریعہ سے سکھاتے ہیں۔ اور ان پیمانوں کے تعلقات کی تحقیقات۔ تجربہ کے ذریعہ سے کراتے ہیں جغرافی نمونوں اور اجسام منتظم کے نمونوں وغیرہ کا استعمال۔ جو علم جغرافیہ اور علم ہندسہ کی تمہید ہیں۔ یہ بھی اسی قسم کے واقعات ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان طریقوں کی ایک مشترک خصوصیت یہ ہے کہ اُن کی وجہ سے ہر ایک بچہ کا نفس ایسے مدارج کو طے کر لیتا ہے جن میں سے بالعموم نوع انسان کے نفس کو گزرنا پڑا ہے۔ عدد شکل۔ اور تعلق مکانی کے تمام حقائق۔ اوّل اوّل اشیاء کے ذریعہ سے پیدا ہوئے تھے۔ اور ان حقائق کو بچے کے سامنے مادیات کی شکل میں پیش کرنا۔ گویا اس طریقہ پر تعلیم دینا ہے جس طریقہ پر کہ نوع انسان نے تعلیم پائی ہے شائد رفتہ رفتہ لوگوں کی سمجھ میں آجائے گا کہ اُن حقیقتوں کو کسی دوسرے طریقہ سے سکھانا ممکن نہیں ہے۔ کیوں کہ اگر بطور مجردات کے بچے سے بار بار اُن باتوں کا اعادہ کرایا جائے تو اس کے نزدیک ان مجردات کے کچھ معنی ہی نہیں ہو سکتے۔ تاوقتیکہ اس کو معلوم

---

[51] بال فریم۔ ایک مستطیل شکل کا چوکھٹا ہوتا ہے جس کے عرض میں خطوط متوازی کی طرح دھات کے تار لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہر ایک تار میں لکڑی کی متعدد گولیاں پروئی جاتی ہیں۔ گولیوں کی تعداد ہر ایک تار میں یکساں ہوتی ہے بال فریم میں عموماً سولہ[16] تار اور ہر تار میں سولہ[16] سولہ گولیاں ہوتی ہیں۔ اس کے ذریعہ سے بچوں کو گنتی حساب کے ابتدائی اصول اور پہاڑے (۱۶ × ۱۶) تک نہایت آسانی سے سکھائے جا سکتے ہیں۔ مترجم

[52] ڈی مارگن۔ انگلستان کا باشندہ اور علم ریاضی کا عالم تھا۔ ۱۸۰۶ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۸۷۱ء میں فوت ہوا۔ مترجم

[53] پونڈ۔ تقریباً آدھ سیر کا۔ اونس آدھی چھٹانک کا۔ گیلن چار سیر کا اور کوارٹ ایک سیر کا ہوتا ہے۔ مترجم

نہ ہو جائے کہ وہ واقعات صرف اُن چیزوں کے بیانات ہیں جن کو وہ بداہتہً دیکھتا ہے۔

ضرور ہے کہ تحصیل علم بچوں کے لیے فرحت و مسرت کا باعث ہو نہ کہ رنج و کلفت کا۔

مگر اُن تمام تغیرات میں جو پیش آرہے ہیں سب سے زیادہ نمایاں تغیر اس بات کی روز افزوں خواہش ہے کہ تحصیل علم کو موجب فرحت و مسرت بنایا جائے۔ نہ کہ باعث رنج و کلفت یہ خواہش کم و بیش اس بات کو صاف صاف سمجھ لینے پر مبنی ہے کہ ہر ایک زمانہ میں وہی عقلی عمل بچہ کے واسطے مفید ہوتا ہے جس کو وہ پسند کرتا ہے۔ اور برعکس اس کے جو عمل اُس کو ناپسند ہوتا ہے وہ مضر پڑتا ہے۔ یہ رائے عام طور پر پھیلتی جاتی ہے کہ کسی قسم کی معلومات کی اشتہا کا بڑھ جانا۔ اس بات کی دلیل ہے کہ بچے کا کھلنے والا دل اُس غذا کو جزو بدن کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ اور نشو و نما کی غرض سے اُس کی ضرورت ہے۔ اور برعکس اس کے ایسی معلومات سے نفرت پیدا ہونی اس بات کی علامت ہے کہ وہ غذا یا تو قبل از وقت دی گئی ہے یا ایسے طریقہ سے دی گئی ہے کہ ہضم نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی تعلیم اور تمام تعلیم کو موجب تفریح اور دل کش بنانے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کھیل کود کی قدر و قیمت پر لکچر دئے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دایہ خانہ کی تُک بندیوں (یعنی لوریوں) اور پریوں کی کہانیوں کی تائید کی جاتی ہے۔ ہم روز بہ روز اپنی تدبیروں کو زیادہ تر بچوں کی رائے کے مطابق بناتے جاتے ہیں۔ ہم برابر یہ سوال کرتے رہتے ہیں کہ بچہ فلاں قسم کی تعلیم کو پسند کرتا ہے یا نہیں؟ اُس کی طرف توجہ کرتا ہے یا نہیں؟ مسٹر مارسل کہتے ہیں کہ "جو بچوں میں قدرتی خواہش ہوتی ہے کہ وہ طرح طرح کی مختلف چیزوں کو پسند کرتے ہیں اُس کی رعایت کرنی چاہیے اور اون کے شوق تجسس کی تکمیل کو اُن کی ترقی کے ساتھ شامل کر دینا چاہیے" صاحب موصوف یہ بھی کہتے ہیں کہ "بچہ پر تکان کے آثار ظاہر ہونے سے پہلے ہی سبقوں کو بند کر دینا چاہیے" اور آیندہ تعلیم بھی اسی طرح ہونی چاہیے مدرسہ کے گھنٹوں کے بیچ میں تھوڑا تھوڑا وقفہ دینا۔ مضافات کی سیر و تفریح۔ دل چسپ

لکچر - آواز ملا کر گانا - اِن باتوں میں اور اسی قسم کی بہت سی خصوصیتوں میں یہ تغیر و تبدل صاف نظر آسکتا ہے - نفس کشی - تعلیم میں سے ایسی گم ہوتی جاتی ہے جیسی معاشرت میں سے - اور ملکی قانون کا معمولی معیار - یعنی خوشی کو ترقی دینے کا میلان - یہی وہ معیار ہے جو زیادہ تر قانون مدرسہ اور قانون دایہ خانہ کے لیے بھی مقرر ہوتا جاتا ہے

طریقہ تعلیم روز بروز قانون قدرت سے مطابق ہوتا جاتا ہے -

اب غور کرو کہ ان مختلف تغیرات کی مشترک خصوصیت کیا ہے ؟ کیا وہ خصوصیت یہی نہیں ہے کہ تعلیم کے طریقوں میں قدرت کے طریقوں سے روز بروز زیادہ مطابقت ہوتی جاتی ہے ؟ یہ اِس بات سے ثابت ہے کہ بچپن میں جبر کرنا جس کے برخلاف قدرت بغاوت کرتی ہے - اب متروک ہوگیا ہے - اور ابتدائی عمر کو اعضا اور حواس کی مشق کے واسطے چھوڑ دیا جاتا ہے - یہ اس بات سے بھی ثابت ہے کہ طوطے کی طرح حفظ یاد کر لینے کا طریقہ جاتا رہا ہے اور کھیت کے کاروبار اور کھیل کود کے سبقوں کی طرح جملہ اسباق کی تعلیم زبانی اور تجربہ کے ذریعہ سے دی جاتی ہے - یہ اِس بات سے ثابت ہے کہ قواعد کے ذریعہ سے تعلیم دینے کا دستور متروک ہوگیا ہے - اور اصول کے ذریعہ سے تعلیم دینے کا رواج ہوگیا ہے - یعنی نتائج عامّہ کو اُس وقت تک چھوڑ دیا جاتا ہے جب تک کہ وہ خاص امور موجود نہ ہوں - جن پر وہ نتائج مبنی ہیں - اسباق الاشیاء کے طریقہ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے - سائنس کے ابتدائی اصول کو مجرّدات کی بجائے مادّیات کے ذریعہ سے تعلیم دینے سے بھی یہ بات ثابت ہے - اور اِن سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ یہ میلان اُن مختلف کوششوں سے ثابت ہے جو علم کو دلکش صورتوں میں پیش کرنے کی غرض سے کی جاتی ہیں - تاکہ تحصیل علم موجب مسرت ہو جائے وجہ یہ ہے کہ تمام مخلوقات میں قدرت کا انتظام یہ ہے کہ ضروری فرائض کے پورا کرنے سے جو حظ حاصل ہوتا ہے - وہ اُن کو پورا کرنے کے لیے محرک کا کام دیتا ہے - مثلاً جس زمانہ میں چھوٹا بچہ بطور خود تعلیم حاصل کرتا ہے - تو اُس کو مونگوں کے کاٹ کھانے

اور کھلونوں کو توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دینے سے جو خوشی حاصل ہوتی ہے۔ وہ اُن کا موں کی محرک ہوتی ہے جو مادّہ کے خواص کی تعلیم دیتے ہیں۔ اس لیے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مختلف مضامین اور تعلیم کے اُن طریقوں کو جو شاگرد کے لیے سب سے زیادہ دلچسپ ہیں۔ انتخاب کرنے سے ہم قدرت کے احکام کو پورا کر رہے ہیں۔ اور اپنی کارروائیوں کو قوانین زندگی کے موافق ترتیب کر رہے ہیں۔

مضمون کی ترتیب اور تعلیم کا طریقہ عقلی ارتقا کے اُصول کے مطابق ہوتا جاتا ہے۔

پس ہم اُس مسئلہ کی شاہراہ پر پہنچ گئے ہیں جس کو پیستا لوتزی[۵] نے ایک مدت پہلے بیان کیا تھا کہ تعلیم اپنی ترتیب اور نیز اپنے طریقوں کے لحاظ سے عقلی ارتقا کے قدرتی عمل کے مطابق ہونی چاہیئے۔ اور یہ کہ ایک خاص ترتیب ایسی موجود ہے جس کے موافق قوتیں قدرتاً نشوونما پاتی ہیں۔ اور ایک خاص قسم کا علم ہر ایک قوت کیلئے اُسکے نشوونما کے زمانہ میں درکار ہے۔ اور یہ کہ اس ترتیب کی تحقیق کرنی اور اس علم کو بہم پہنچانا ہمارا کام ہے۔ جن ترقیوں کا ذکر اوپر اشارۃً کیا گیا ہے۔ وہ سب اسی عام اصول کے جزوی استعمال ہیں۔ اِس بات کا ایک دھندلا سا خیال آجکل معلموں میں پیدا ہو گیا ہے اور تعلیمی تصانیف میں روز بروز اس بات پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ مسٹر مارسل کہتے ہیں کہ "قدرت کا طریقہ تمام طریقوں کا اصلی نمونہ ہے۔" مسٹر وائز لکھتے ہیں کہ "اس کام میں اصل اصول یہی ہے کہ شاگرد کو اِس قابل بنا دیا جائے کہ وہ اپنے آپ کو ٹھیک ٹھیک تعلیم دے سکے۔" سائنس ہم کو نظام اشیاء سے جس قدر زیادہ آگاہ کرتا ہے۔ اُسی قدر زیادہ خلقی کمال بجائے خود اُن میں نظر آتا ہے۔ اعلیٰ درجہ کا علم ہم کو متواتر اس امر کی طرف مائل کرتا ہے کہ زندگی کے عملوں سے کم تعرض کریں جس طرح طبابت میں۔ قدیم "بہادرانہ علاج" کی جگہ نرم علاج کا رواج ہو گیا ہے اور اکثر اوقات باقاعدہ پرہیز کے سوا کوئی علاج ہی نہیں کیا جاتا جس طرح کہ ہم کو معلوم ہو گیا ہے کہ شیر خوار بچوں کے جسموں کو پٹیاں باندھ کر۔ جیسا کہ شمالی امریکہ کے وحشی باشندے

[۵] پیستا لوتزی ملک سوئٹزرلینڈ کا باشندہ اور ایک جدید طریقہ تعلیم کا بانی ہوا ہے۔ ۱۷۴۶ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۲۷ء میں فوت ہوا۔ (مترجم)

کرتے ہیں - یا اور کسی طرح - سانچے میں ڈھالنے کی ضرورت نہیں ہے جس طرح یہ بات
ظاہر ہوتی جاتی ہے کہ جیل خانوں میں قیدیوں کی اصلاح کے لیے مصنوعی تربیت
اتنی کارگر نہیں ہوتی جتنی قدرتی تربیت - اسی طرح تعلیم میں بھی ہم کو معلوم ہوتا جاتا ہے
کہ کامیابی صرف اس طرح حاصل ہو سکتی ہے کہ اپنی تدبیروں کو اُس قدرتی نشوونما کے تابع
بنایا جائے جس میں سے حالت بلوغ تک پہنچنے سے پہلے سب لوگوں کو گزرنا پڑتا ہے
بے شک تعلیم کا یہ بنیادی اصول کہ "مضمون اور طریقہ کی ترتیب - قویٰ کی ترتیب
ارتقا اور طریقۂ عمل کے مطابق ہونی چاہیئے" جو ایسا صریح اور صحیح اصول ہے کہ ایک
دفعہ بیان کرنے کے ساتھ ہی اُس کی صداقت تقریباً بدیہی معلوم ہوتی ہے - اُس کو کبھی
بالکلیہ نظر انداز نہیں کیا گیا معلموں نے اپنے مدرسوں کے نصاب کو چاروناچار کسی قدر
اِس اصول کے مطابق بنایا ہے محض اس وجہ سے کہ تعلیم اسی شرط پر ممکن ہے - ایسا
کبھی نہیں ہوا کہ لڑکوں کو اربعہ متناسبہ کی تعلیم دی گئی ہو جب تک اُنہوں نے جمع نہ سیکھ
لی ہو - ایسا بھی نہیں ہوا کہ کاپیاں لکھانے سے پہلے اُن کو مشقیں لکھائی شروع
کرائی گئی ہوں - علم تراشہائے مخروطی سے پہلے ہمیشہ اقلیدس کی تعلیم دی گئی ہے
مگر قدیم طریقوں کی غلطی اس امر پر مشتمل ہے کہ جو بات اُن کو مجملاً تسلیم کرنی پڑتی ہے - اُس کو
مفصلاً تسلیم نہیں کرتے - تاہم یہ اصول ہر جگہ صادق آتا ہے - اگر اُس وقت سے لے کر
جب سے کہ بچہ دو چیزوں کے تعلق مکانی کو سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہے - اُس وقت
تک - جب کہ وہ زمین کا صحیح تصور اس حیثیت سے کر سکے کہ وہ ایک کرہ ہے خشکی اور
تری سے مرکب ہے پہاڑوں - جنگلوں - دریاؤں - اور شہروں سے معمور
ہے - اپنے محور پر گھومتا ہے آفتاب کے گرد بھی گردش کرتا ہے - کئی سال کی مدت کا
منقضی ہونا ضروری ہے اگر وہ ایک تصور سے دوسرے تصور تک بہ تدریج پہنچتا ہے
اگر درمیانی تصورات جن کو وہ حاصل کرتا ہے - سلسلہ بہ سلسلہ زیادہ بڑے اور پیچیدہ

اصول مذکور کی پابندی مدرسوں کے نصاب تعلیم میں کچھ نہ کچھ ضرور ہوتی ہے -

ہوتے جاتے ہیں۔ تو کیا یہ بات صاف ظاہر نہیں ہے کہ اسی قسم کا ایک عام سلسلہ ایسا موجود ہے کہ اُسی سلسلہ کو بہ تدریج طے کرنا بچّہ کے لیے ضروری ہے اور یہ کہ ہر ایک بڑا تصوّر چھوٹے تصوّرات کے مجموعہ سے بنتا ہے۔ اور اُس سے پہلے اُن تصوّرات کا وجود مان لیا جاتا ہے۔ اور یہ کہ اُن مرکب تصوّرات میں سے کسی تصوّر کو بچّہ کے سامنے ایسے وقت میں پیش کرنا جب کہ اُس تصوّر کے اجزاے ذاتی ابھی اُس کے ذہن میں حاضر نہیں ہیں۔ ایک بیہودہ بات ہے اور یہ بیہودگی صرف اسی بیہودگی سے کم ہے کہ سلسلہ کے آخری تصوّر کو ابتدائی تصوّر سے پہلے پیش کر دیا جائے۔ ہر ایک مضمون پر عبور حاصل کرتے وقت بہ تدریج پیچیدہ خیالات کو طے کرنا پڑتا ہے۔ ان خیالات کے مقابل میں جو قوتیں موجود ہیں اُن کی ترقی اس بات پر منحصر ہے کہ وہ خیالات پوری طرح ذہن نشین ہو جائیں۔ اور یہ بات نفس الامر میں اُس وقت تک محال ہے۔ جب تک کہ اُن خیالات کو باقاعدہ ترتیب سے دل میں نہ ڈالا جائے۔ اور جب اس ترتیب کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کو بے اعتنائی یا نفرت کے ساتھ حاصل کیا جاتا ہے۔ اور جب تک کہ شاگردوں میں اس قدر عقل نہ ہو کہ وہ آخر کار اس نقصان کی تلافی خود کر سکے یہ خیالات مردہ واقعات کی طرح اُس کے حافظہ میں پڑے رہتے ہیں جن سے بہت کم فائدہ اُٹھا سکتے ہیں یا فائدہ اُٹھا ہی نہیں سکتے۔

مگر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ درسطلق کسی نصاب تعلیم کے لیے ہم کیوں اپنے آپ کو دقت میں پھنسائیں؟ اگر یہ بات صحیح ہو کہ جسم کی طرح۔ ترقیِ نفس کی رفتار بھی ایسے اصول کے موافق ہوتی ہے۔ جو پہلے سے مقرر ہو چکے ہیں۔ اگر اُس کا نشو و نما قدرتی طور پر ہوتا ہے اگر خاص خاص معلومات حاصل کرنے کے لیے۔ نفس کی متواتر خواہشیں اُسی وقت پیدا ہوتی ہیں۔ جب کہ وہ اُس کی غذا کے لیے مطلوب ہوں۔ پس اگر مناسب وقت میں مناسب قسم کی تحریک کا محرک خود بخود موجود ہو جاتا ہے تو ہم کیوں اُس میں کسی طرح

ایک بڑا اعتراض کا جواب جو یہ ہوتا ہے
ترقی بلحاظ قانون نشو و نما
[illegible]
[illegible] نفس ناطقہ بھی اُن ہی
قوانین کے موافق نشو و
نما پاتا ہے۔

کی دست اندازی کریں؟ بچوں کو بالکل قدرت ہی کی تربیت پر کیوں نہ چھوڑا جائے؟ کیوں مداخلت کو بالکل ترک نہ کیا جائے۔ اور جس طرح بطور خود بچے علم حاصل کریں کیوں نہ اُسی طرح اُن کو علم حاصل کرنے دیا جائے؟ کیوں تمام حالتوں میں یکساں روش اختیار نہ کی جائے"؟ یہ سوال بے ڈھنگا سا معلوم ہوتا ہے۔ ظاہرا یہ اعتراض اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مسائل مذکورہ بالا کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ دست اندازی سے بالکل اجتناب کیا جائے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُن مسائل کو لغو بتا کر اُن کے ابطال کا سامان مہیا کرتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے جب اُن مسائل کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لیا جائے۔ تو وہ ہم کو کسی ایسے بے بنیاد اصول تک نہیں پہنچاتے جسمانی مشابہتوں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات صاف ظاہر ہو جائیگی یہ زندگی کا عام قانون ہے کہ جس قدر زیادہ پیچیدہ جسمانی ساخت تیار کرنی مقصود ہوتی ہے اُسی قدر زیادہ مدت تک خوراک یا حفاظت کے لیے اُسکو ماں باپ کا محتاج رہنا پڑتا ہے۔ مہین ریشہ دار آبی پودے کا ننھا سا بیج۔ جلدی سے بن جاتا اور خود بخود حرکت کرنے لگتا ہے۔ اور ایک درخت کا بیج۔ آہستہ آہستہ نشو ونما پاتا ہے۔ جس میں بے شمار لفافے اور غذا کا بڑا ذخیرہ ہوتا ہے تاکہ نمو کے ابتدائی مدارج کو طے کرنے میں بیج کی پرورش ہو سکے۔ اِن دونوں قسم کے بیجوں میں جو فرق ہے اُس سے اس امر کی تشریح ہوتی ہے کہ نباتاتی دُنیا پر یہ قانون صادق آتا ہے۔ حیوانات میں اِس قانون کا سراغ اُس سلسلۂ تفاوت سے۔ جو نہایت ہی ننھے ننھے کیڑوں سے لے کر۔ جن کے قدرتی طور پر تقسیم کیے ہوئے نصف حصے جدا ہونے کے بعد بھی بجائے خود ایسے ہی کامل ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اصلی کیڑا ہوتا ہے انسان تک نظر آتا ہے۔ اور انسان کی اولاد کو نہ صرف حمل کی طویل مدت میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور اُس کے بعد مدت تک پستان مادر سے غذا حاصل کرنے کی احتیاج رہتی ہے۔ بلکہ اُس کے بعد بھی ضرور ہے کہ اُس کو مصنوعی طور سے خوراک دی جائے

اور جب وہ اپنے آپ کھانا سیکھ جائے اُس وقت بھی ضرور ہے کہ روٹی - کپڑا اور حفاظت کا سامان - اس کے لیے مہیا کیا جائے - اور اُس مدت تک - جو پیدائش کے بعد باختلاف حالات پندرہ سال سے بیس سال تک ہوتی ہے - پوری طرح آپ اپنا گزارہ کرنے کی قوت حاصل نہیں کرتا[٥١] - اب دیکھو - یہی قانون جس طرح جسم پر صادق آتا ہے - اُسی طرح نفس پر صادق آتا ہے - روحانی غذا کے حاصل کرنے کے لیے بھی ہر ایک اعلیٰ مخلوق - اور خصوصًا انسان - اوّل اوّل اپنے سے بڑوں کی مدد کا محتاج ہوتا ہے - جیوں کہ ننھے بچے میں اِدھر اُدھر حرکت کرنے کی قابلیت نہیں ہوتی اس لیے جس طرح وہ اپنا پیٹ پالنے کے لیے خوراک حاصل کرنے کے قابل نہیں ہوتا تقریبًا اسی طرح اُس امداد کے حاصل کرنے کی قوت بھی نہیں رکھتا جس پر وہ اپنے ادراک کو عمل میں لاسکے - جس طرح وہ اپنی خوراک تیار کرنے کے قابل نہیں ہوتا - اُسی طرح علم کی بہت سی قسموں کو دل نشین کرنے کے لیے ایک مناسب صورت میں نہیں لاسکتا جس زبان کے ذریعہ سے تمام اعلیٰ درجہ کے حقائق حاصل ہوتے ہیں - وہ اُس زبان کا بیشتر گرد و پیش کے حقائق کے ذریعہ سے حاصل کرتا ہے - اور جب والدین اور اتاؤں کی طرف سے کوئی مدد نہیں ملتی تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نشو و نما میں خلل پڑتا ہے - جیسا کہ ہم آویرن[٥٢] کے جنگلی لڑکے کی مثال سے مشاہدہ کرتے ہیں - پس روز بروز

[٥١] - اس مطلب کو شیخ سعدی نے اس طرح ادا کیا ہے ؎ ہر چہ زود بر آید دیر نہ پاید ؏

مرغک از بیضہ برون آید و روزی طلبد
آدمی زادہ ندارد خبر از عقل و تمیز
آں کہ ناگاہ کسے گشت بچیزے نرسید
وین بہ تمکین و فضیلت بگذشت از ہمہ چیز
آبگینہ ہمہ جا بینی ازاں قدرش نیست
لعل دشوار بدست آید ازاں ہست عزیز

مترجم

[٥٢] آویرن ایک ضلع ہے فرانس کے جنوب میں - آویرن کے جنگلی لڑکے سے غالبًا ایسا لڑکا مراد ہے جس نے بھیڑیوں میں پرورش پائی ہو - بھیڑیے کبھی کبھی چھوٹے بچوں کو اُٹھا لے جاتے ہیں - اور یہ بات مشہور ہے کہ کسی کسی بچے کو بجائے پھاڑ کھانے کے اپنے بچوں کے ساتھ پرورش کر لیتے ہیں - میں نے بہت کوشش کی مگر افسوس ہے کہ آویرن کے جنگلی لڑکے کا حال کسی کتاب میں بجز اس کے کچھ معلوم نہ ہو سکا - مترجم

صحیح قسم کے واقعات مہیا کرنے میں ۔ جو صحیح طریقے سے تیار کیے گئے ہوں اور
مناسب وقفوں سے ۔ باندازہ مناسب اُن واقعات کو ذہن نشین کرنے کی غرض سے
بچے کے نفس کے لیے مستعدانہ مدد کی اُسی قدر گنجایش ہے جس قدر کہ اُس کے جسم کے
لیے ۔ دونوں صورتوں میں والدین کا مقدم فرض اس بات کا دیکھنا ہے کہ جو شرطیں نشو ونما
کے لیے ضروری ہیں اُن کو قائم رکھا جائے اور جس طرح خوراک ۔ لباس ۔ مکان بہم پہنچاتے
ہیں والدین اِس فرض کو اِس طرح پورا کر سکتے ہیں ۔ جس سے اعضا اور اعصا کے قدرتی
نشو ونما میں کیا بلحاظ ترتیب کے اور کیا بلحاظ طریقہ نشو ونما کے مطلق خلل واقع نہ ہو
اسی طرح نقل کے لیے آوازیں ۔ دیکھ بھال کے لیے اشیا ۔ پڑھنے کے لیے کتابیں
اور حل کرنے کے لیے سوالات بھی مہیّا کر سکتے ہیں ۔ اور اگر وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ جبر
و مزاحمت نہ کریں تو روحانی ارتقا کے باقاعدہ عمل میں کسی کا طرح کا خلل واقع نہ ہوگا ۔
بلکہ یوں کہو کہ اُس عمل میں بہت کچھ سہولت ہو جائیگی ۔ یہی وجہ ہے کہ مسائل مذکورہ کا
تسلیم کرنا اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ تعلیم کو ترک کر دیا جائے ۔ جیسا کہ بعض اشخاص حجت
پیش کر سکتے ہیں ۔ بلکہ تربیت کے ایک مفید اور مکمل نصاب کے لیے کافی گنجائش باقی رہتی ہے

اُصول کُلیہ کو چھوڑ کر خاص خاص امور پر غور کی جائے تو یہ بات قابل بیان ہے
کہ پستالوزی کے طریقہ تعلیم نے اپنے خیالی منصوبہ کے اقرار کو عملاً بہت ہی کم پورا کیا ہے
ہم نے سنا ہے کہ بچے اِس طریقہ کے سبقوں سے ذرا بھی دلچسپی نہیں رکھتے ۔ بلکہ اُن
سے متنفر ہیں ۔ جو مدرسے پستالوزی کے اصول کے موافق قایم ہوئے ہیں ۔ جہاں
تک ہم تحقیق کر سکتے ہیں ۔ اُن کے طالب علم اگر اوسط درجہ پر پہنچے بھی ہیں ۔ تو بھی اُن
میں سے ممتاز اور سرآوردہ لوگوں کی غیر معمولی تعداد پیدا نہیں ہوئی ۔ ہم کو اس بات
تعجب نہیں ہے ۔ ہر ایک آلہ کی کامیابی زیادہ تر اِس بات پر منحصر ہے کہ کس دانش مندی
سے اُس کو کام میں لایا جاتا ہے ؟ یہ ایک عام اور مبتذل مقولہ ہے کہ اناڑی کاریگر

پستالوزی کے طریقہ
کی ناکامیابی ۔ اور اُس
بڑی وجہ ہے لائق معلم
کا دستیاب نہ ہونا

عمدہ سے عمدہ اوزاروں سے بھی بھدّا کام بنتا ہے - اور بُرے معلم اچھے سے اچھے طریقوں سے بھی ناکامیاب رہتے ہیں - حقیقت یہ ہے کہ ایسی حالت میں طریقہ کی عمدگی اسی طرح ناکامیابی کا باعث ہو جاتی ہے جس طرح کہ حسب تمثیل مذکورہ بالا - اوزار کا کمال اناڑی کے ہاتھوں ناقص نتائج کا ذریعہ بن جاتا ہے - سیدھے سادے - غیر متغیر - اور قریب قریب کل کی طرح چلنے والے تعلیم کے کام کو نہایت ہی معمولی عقل کا آدمی چلا سکتا ہے جس سے اسی قدر کم فائدہ مند نتیجہ پیدا ہوتا ہے جس قدر کہ پیدا ہو سکتا ہے - مگر کامل طریقہ - یعنی وہ طریقہ جس کے عمل ایسے ہی مختلف الجنس ہیں جیسے کہ نفس ناطقہ کی قوتیں مختلف قسم کی ہیں - یا یوں کہو کہ وہ طریقہ جو ہر خاص مقصد کے واسطے ایک خاص وسیلہ تجویز کرتا ہے اس کے صحیح استعمال کے لیے ایسی قوتیں درکار ہیں جو بہت کم معلموں میں پائی جاتی ہیں - مدرسۂ نسوان کی معلّمہ بچوں کے سبق سن سکتی ہے - اور ایک معمولی مدرسہ کا معلّم بچوں کو ضرب کے پہاڑوں کی مشق کرا سکتا ہے مگر صحیح طور پر ہجے سکھانے کے لیے جس میں حرفوں کے ناموں کی بجائے اُن کی قوتوں سے کام لیا جائے - یا مجموعۂ اعداد کی تعلیم اس طرح دینے کے لیے - کہ اُن کی ہیئت ترکیبی کو تجربہ کے ذریعہ سے سمجھا دیا جائے - ذرا عقل چاہیے - اور تمام سلسلۂ تعلیم میں اسی قسم کے معقول طریقہ کو اختیار کرنے کے لیے کسی قدر قوت فیصلہ - قوت ایجادی عقلی ہمدردی - اور قابلیت تحلیل درکار ہے - اور جب تک معلمی کے پیشہ کی ایسی کم قدری رہیگی اُس وقت تک ہم کبھی نہیں دیکھیں گے کہ معلّم اِن قوتوں کا استعمال کریں سچی تعلیم تو سچے حکیم (فلسفی) ہی سے ممکن ہے - پس انصاف کرو کہ آج کل حکیمانہ طرز تعلیم پر عمل کیے جانے کی کیا خاک توقع ہو سکتی ہے ! ہم تو اب تک سائیکالوجی سے بہت ہی کم واقف ہیں - اور ہمارے معلّم اس تھوڑی سی معلومات سے بھی ناواقف ہیں - بھلا ایسی حالت میں جس طریقہ کی بنیاد ہی سائیکالوجی پر ہے - اس کی کامیابی کا کیا

احتمال ہو سکتا ہے۔

اس کے سوا پستالوتزی کے اصول کو اُن صورتوں کے ساتھ گڈمڈ کر دینا جن میں وہ شامل ہیں۔ اور بھی سدِّ راہ اور دل شکنی کا باعث ہو گیا ہے۔ چوں کہ خاص خاص تدبیروں سے جیسی کہ توقع تھی کامیابی نہیں ہوئی۔ اس لیے جو اصول اُن سے متعلق ہے اُس کو بے اعتباری کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس بات کی تحقیقات نہیں کی جاتی کہ آیا یہ تدبیریں حقیقت میں اُس اصول کے مطابق ہیں بھی یا نہیں۔ لوگ عادۃً تجربہ و واقعات کی بجائے باتوں کے ذریعے سے رائے قائم کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے اُنہوں نے عمل کی غلطیوں کا الزام اصل مسئلہ پر لگا دیا ہے۔ یہ ایسی بات ہے جیسا کہ ہوائی انجن بنانے کی ابتدائی ناچیز کوشش کو اس امر کا ثبوت قرار دیا گیا تھا کہ بھاپ قوت محرکہ کا کام نہیں دے سکتی۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ گو پستالوتزی کے اصولی خیالات صحیح تھے۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اپنے تمام خیالات کے استعمال میں حق بجانب تھا۔ پستالوتزی کے مداح بھی یہی کہتے ہیں کہ وہ ایسا شخص تھا جس میں قدرتی ذکاوت کم تھی۔ یعنی ایسا شخص جس کے اندر سے کبھی کبھی نورِ بصیرت کے چمکارے نکلتے تھے نہ کہ ایسا شخص جو باضابطہ رائے رکھتا ہو۔ اُس کو بڑی کامیابی بہ مقام ستانز اُس وقت حاصل ہوئی تھی جب کہ اُس کے پاس کتابیں یا معمولی تعلیم کا سامان نہ تھا۔ اور جب کہ "اُس کی توجہ کا مقصد صرف یہ تھا کہ ہر وقت اس بات کا پتا لگائے کہ اُس کے بچوں کو خاص کس تعلیم کی ضرورت ہے اور جس علم کو بچے پہلے ہی حاصل کر چکے ہیں اُس کے ساتھ نئے علم کو نہایت عمدہ طور پر کس طرح شامل کرنا چاہیے۔" اُس کی بہت سی قوت۔ تربیت کی اُن تدبیروں پر مبنی نہ تھی جو اطمینان سے بحث و دلیل کے بعد نکالی جاتی ہیں۔ بلکہ اوس کی گہری ہمدردی کی بدولت تھی۔ جس کی وجہ سے بچوں کی ضروریات اور مشکلات کا اوراک اُس کو جلد حاصل ہو گیا تھا۔ اُس میں یہ قابلیت نہیں تھی کہ اُن اصول کو جن پر اُس نے

پستالوتزی کا طریقۂ تعلیم اصولاً صحیح ہے گو اُس کو عملاً صحیح طور پر استعمال نہیں کیا گیا۔

وقتاً فوقتاً اس طرح قابو پایا تھا منطقی طور پر باضابطہ مرتب کرتا اور ترقی دیتا۔ اور یہ معاملہ
اُس کو بہت کچھ اپنے مددگاروں - گروبزی - تایلر - بس - سنیڈرز - اور شمدر پر چھوڑنا
پڑتا تھا - اس کا نتیجہ یہ ہوا - کہ خود اُس کے اپنے منصوبے اور نیز جو منصوبے اُس کے
مددگاروں نے بنا بنا کر تجویز کیے تھے - اِن دونوں کے جزئیات میں بے شمار خامیاں اور
اختلافات ہیں - چوں کہ اُس کا بنایا ہوا قانون دایہ خانہ - جو کتاب "مدرز میںول" (ماں
کی کتاب) میں بیان کیا گیا ہے - اُس کے شروع میں جسم کے مختلف حصوں کے نام
درج ہیں - اِس کے بعد اُن کے اضافی محل وقوع اور پھر اُن کے تعلقات کا ذکر کیا گیا ہے
اس لیے یہ بات ثابت ہو سکتی ہے - کہ یہ قانون عقلی ارتقا کے ابتدائی مدارج کے
موافق بالکل نہیں ہے - مادری زبان کی تعلیم کا طریقہ جو اُس نے تجویز کیا ہے کہ لفظوں
کے معنوں اور جملوں کی ساخت کی باقاعدہ مشق کرائی جائے - بالکل غیر ضروری ہے اور
اُس سے شاگردوں کے وقت محنت اور خوشی کا نقصان ضرور ہوگا - پسٹا لوزی کے
تجویز کیے ہوئے جغرافیہ کے سبق اُس کے مقرر کردہ اصول کے بالکل خلاف ہیں۔
اور اکثر اوقات دیکھا جاتا ہے کہ جہاں کہیں اُس کے منصوبے دراصل صحیح ہیں - وہاں
بھی یا تو نامکمل ہیں - یا پرانے دستور العمل کا کچھ اثر باقی رہ جانے کی وجہ سے خراب ہو گئے
ہیں - پس جہاں ہم اُس عام اصول کی پوری پوری حمایت کرتے ہیں جس کو پسٹا لوزی
نے جاری کیا ہے - ہم یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ اُس کے خاص طریقوں کو بلا تحقیق
و تنقید قبول کر لینے سے بڑی خرابی پیدا ہونے کا احتمال ہے - بنی نوع انسان کا
میلان ہمیشہ اس بات کی طرف ظاہر ہوتا رہا ہے کہ جن شکلوں اور جن عملوں کے ساتھ
اُن کو کوئی بڑا مسئلہ تلقین کیا جاتا ہے - اُن شکلوں اور عملوں ہی کو آئین و شریعت قرار
دے لیتے ہیں - یعنی اپنی عقلوں کو پیغمبر کے سامنے سر بسجود ڈال دینے اور اُس کے
ہر لفظ کی قسم کھانے کے لیے مستعد رہتے ہیں - یا یوں کہو کہ لوگوں کی رغبت اس طرف

ہے کہ جس لباس میں اُس خیال کو ظاہر کیا گیا ہے غلطی سے اُس لباس ہی کو
خیال سمجھ لیتے ہیں۔ اس لیے ضرورت اس امر کی مقتضی ہے کہ پسٹالوزی کے
طریقے کے بنیادی اصول میں اور جو تدابیر اُس کو عمل میں لانے کے لیے تجویز کی گئی ہیں
اُن میں جو فرق ہے۔ اُس پر مضبوطی کے ساتھ زور دیا جائے۔ اور یہ بات جتا دی
جائے کہ گو اُس طریقہ کو ایک قانون مسلّم قرار دے سکتے ہیں۔ مگر غالباً ان تدابیر میں
باقاعدہ طریقہ کی محض خفیف سی جھلک کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ بے شک اپنے علم
کی حالتِ موجودہ پر نظر کر کے ہم اِس بات کا پورا الیقین کر سکتے ہیں کہ یہی صورت ہے قبل
اِس کے کہ طرقِ تعلیم کو۔ بہ لحاظ اُن کی نوعیت اور ترتیب کے قوای عقلیہ کے
طریقہ و تربیت نشو و نما کے مطابق بنایا جائے۔ سب سے پہلے اِس بات کی ضرورت ہے کہ
ذرا کامل طور پر اِس امر کی تحقیق کر لیں۔ کہ اُن قویٰ کا نشو و نما کیوں کر ہوتا ہے فی الحال
اس بارہ میں ہم نے محض چند عام خیالات حاصل کیے ہیں۔ اِن عام خیالات کو
بالتفصیل ترقی دینی چاہیئے۔ یعنی قبل اِس کے کہ ہماری نسبت یہ کہا جا سکے کہ ہم نے اُس
علم (سائینس) کو حاصل کر لیا ہے۔ جس پر تعلیم کے فن (آرٹ) کی بنیاد رکھنی لازم ہے
یہ بات ضروری ہے کہ اُن عام خیالات کو بے شمار خاص خاص مختلف شکلوں میں ظاہر
کیا جائے۔ اور پھر جب ہم کو قطعی طور پر یہ معلوم ہو جائے کہ کس ترتیب اور کس اجتماع
سے قوای عقلیہ چست و چالاک ہوتے ہیں۔ تو یہ کام باقی رہ جاتا ہے کہ ہر ایک قوت کی مشق
کے لیے من جملہ بہت سے طریقوں کے اُس طریقہ کو پسند کر لیا جائے جو اُس کے قدرتی
طریق عمل سے سب سے زیادہ مطابقت رکھتا ہو۔ پس صاف ظاہر ہے کہ سب سے عمدہ اور ترقی
یافتہ طرقِ تعلیم کی بابت بھی یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ وہ صحیح یا تقریباً صحیح طریقے ہیں۔
پس پسٹالوزی کے اصول اور عمل میں اس امتیاز کو ذہن نشین کر کے اور پیش
کی ہوئی دلیلوں سے یہ نتیجہ نکال کر کہ اُس کا عمل بالضرور بہت ناقص ہے۔ ناظرین

پسٹالوزی کے اصول و عمل میں اختلاف ہے۔ صحیح طرز تعلیم کا معیار کیا ہے؟

اس امر کا اندازہ کر سکیں گے کہ بعض لوگوں نے اِس طرزِ تعلیم سے جو ناراضی ظاہر کی ہے اُس کی حقیقی وقعت کس قدر ہے اور اِس بات کو دیکھ لینگے کہ پیتالوتزی کے خیال کی تکمیل ابھی باقی ہے۔ جو کچھ ہم نے ابھی بیان کیا ہے اگر ناظرین اُس پر یہ حجت پیش کریں کہ اس قسم کی تکمیل بالفعل ممکن العمل ہی نہیں ہے۔ اور یہ تمام کوشش ابتدائی تحقیقات ہی میں مصروف رکھنی چاہیئے۔ تو ہم اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ اگرچہ تربیت کے کسی منصوبہ کی تکمیل۔ خواہ مادّہ کے اعتبار سے ہو خواہ صورت کے اعتبار سے۔ اُس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ عقلی سائیکالوجی قایم نہ ہوجائے۔ تاہم بعض رہنمائی کرنے والے اصول کی مدد سے یہ ممکن ہے کہ ہم تجربہ کے ذریعہ سے مکمل منصوبہ کے قریب قریب جا پہنچیں۔ ہم آیندہ تحقیقات کا رستہ صاف کرنے کی غرض سے اِن اصول کو خاص طور پر بیان کرینگے۔ اِن میں سے بعض اصول تو صفحات ماسبق میں کم و بیش صراحت کے ساتھ بیان ہو چکے ہیں۔ مگر یہاں اُن سب کو منطقی ترتیب سے بیان کرنا بہتر ہوگا۔

عقلی ارتقا کے سات اُصول
(۱) آسان باتوں سے مشکل باتوں کی طرف جانا چاہیئے۔

(۱) یہ بات کہ "تعلیم میں آسان باتوں سے پیچیدہ باتوں کی طرف جانا چاہیئے" ایسی حقیقت ہے جس پر کسی حد تک ہمیشہ عمل ہوتا رہا ہے۔ گو حقیقت میں صاف و صریح طور پر عمل نہیں کیا گیا۔ اور معقول مناسب طریق پر بھی مطلقاً عمل نہیں ہوا۔ نفس ناطقہ کا نشو و نما ہوتا رہتا ہے۔ مثل اُن تمام چیزوں کے جو نشو و نما پاتی ہیں۔ نفس بھی ہم جنس چیزوں سے مختلف الجنس چیزوں تک بہ تدریج پہنچتا ہے۔ اور چونکہ تربیت کا باقاعدہ طریقہ اس معنوی عمل کی صوری شبیہ ہے۔ اس لیے اُس میں بھی اسی طرح بہ تدریج ترقی ظاہر ہونی چاہیئے۔ اس کے علاوہ اصول مذکور کی اس طرح تشریح کرنے کے بعد۔ ہم یہ بات دیکھ سکتے ہیں کہ اس کا اطلاق۔ جتنا اوّل اوّل معلوم ہوتا ہے۔ اُس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اُس کی تشریح میں یہ بات داخل ہے کہ نہ صرف علم کی

ہر ایک شاخ کی تعلیم میں مفرد شے سے مجموعہ کی طرف جانا چاہیے۔ بلکہ تمام علم ہی اس طریقے سے سکھانا چاہیے۔ چوں کہ نفس ناطقہ میں عمل کرنے والی قوتوں کی تعداد اوّل اوّل بہت ہی کم ہوتی ہے اور جو قوتیں بعد میں تکمیل کو پہنچتی ہیں وہ یکے بعد دیگرے اپنا عمل کرنا شروع کرتی ہیں۔ اور آخر کار نفس ناطقہ کی تمام قوتیں ایک ساتھ اپنا اپنا عمل شروع کر دیتی ہیں۔ اس لیے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ابتدائی تعلیم میں ایک ہی دو مضمونوں کی تعلیم ایک ساتھ شروع ہونی چاہیے۔ اور بتدریج اُن مضامین کی تعداد میں اضافہ کر کے آخر کار تمام مضامین کی تعلیم کو ساتھ ساتھ جاری رکھنا چاہیے نہ صرف جزئیات میں۔ بلکہ مجموعی حیثیت سے بھی آسان سے مشکل کی طرف جانا چاہیے۔

(۲) بچوں کو علمی اصطلاحیں اور تعریفیں شروع میں نہیں [illegible] باتیں اُن کی سمجھ کے موافق بتا دینی کافی ہیں۔

(۲) نفس ناطقہ کے نشوونما میں بھی جیسا کہ سب چیزوں کے نشوونما میں ہوتا ہے مبہم و غیر معین چیزوں سے معین چیزوں کی طرف ترقی ہوتی ہے۔ دیگر اعضائے بدن کی [illegible] دماغ کی مکمل ساخت بھی زمانہ بلوغ کو پہنچ کر ہی پوری ہوتی ہے کر اس کی بناوٹ نامکمل ہوتی ہے۔ اُسی قدر اس کے عملوں میں صحت و درستی نہیں ہوتی یہی وجہ ہے کہ گفت و گو سیکھنے کے لیے بچہ کی ابتدائی حرکات اور ابتدائی کوششیں جس طرح مبہم اور غیر معین ہوتی ہیں۔ اُس کے ادراکات اور خیالات بھی مبہم اور غیر معین ہوتے ہیں۔ جس طرح کہ نا تربیت یافتہ نگاہ۔ صرف روشنی اور تاریکی کے فرق کو معلوم کرتی ہے۔ اور پھر ترقی کر کے وہی نگاہ ایسی بن جاتی ہے جو بڑی صحت کے ساتھ رنگ کی قسموں اور درجوں میں اور شکل کے جزئیات میں تمیز کرنے لگتی ہے اسی طرح عقل بھی۔ کیا بہ حیثیت مجموعی اور کیا بہ اعتبار اپنی ہر ایک قوت کے شروع میں تو اشیا اور افعال کے نہایت موٹے موٹے فرقوں ہی میں تمیز کر سکتی ہے۔ مگر رفتہ رفتہ ترقی کر کے نہایت نازک اور باریک فرقوں کو سمجھنے لگتی ہے۔ ہمارا تعلیمی نصاب اور طریق تعلیم

اس عام قانون کے مطابق ضرور ہونے چاہئیں۔ یہ بات ممکن العمل نہیں ہے۔
اور اگر ممکن العمل بھی ہو تو پسندیدہ نہیں ہے کہ ناتربیت یافتہ نفس میں ٹھیک جچے تلے
خیالات ڈال دئے جائیں۔ یہ بات درحقیقت ممکن ہے کہ الفاظ کی صورتیں جن میں وہ
خیالات ملفوف ہیں بچوں کو بچپن ہی میں بتا دی جائیں۔ اور جو معلم عادۃً ایسا کرتے ہیں
وہ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ جب الفاظ کی صورتیں صحیح طور پر یاد ہو جائینگی۔ تو جو خیالات اُن
صورتوں میں بھرے ہوئے ہیں وہ بھی حاصل ہو جائینگے۔ مگر طالب علم سے مختصر سے
جرحی سوالات کرنے سے معاملہ بالعکس ثابت ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یا تو یہ نکلتا ہے
کہ الفاظ یاد کر لیے گئے ہیں۔ اور اُن کے معنوں کا بہت کم خیال کیا گیا ہے یا بالکل نہیں
کیا گیا۔ اور یا یہ کہ اُن کے معنوں کی بابت جو علم حاصل کیا گیا ہے۔ وہ نہایت تاریک اور
دھندلا سا علم ہے۔ صرف اُس وقت جب کہ بے شمار تجربوں کے ذریعے سے قطعی
و معین تصورات کا مواد بہم پہنچ جاتا ہے صرف اُس وقت جب کہ مشاہدہ کے
[illegible] سال بسال ایسے اوصاف ظاہر ہوتے رہتے ہیں جو صاف طور پر نمایاں
نہ تھے۔ اور جن کی وجہ سے اُن چیزوں اور عملوں میں تمیز ہو جاتی ہے۔ جن میں پہلے
کچھ تمیز نہیں ہو سکتی تھی صرف اُس وقت جب کہ ہر قسم کے لوازم و ملزومات اور
نتائج سے واقفیت ہو جاتی ہے۔ اور یہ واقفیت اُن باتوں کے متواتر وقوع پذیر
ہونے کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔ جو اس مشاہدہ کے تحت میں داخل ہیں صرف
اُس وقت جب کہ مختلف قسم کے تعلقات میں باہمی حدود و قیود کی وجہ سے۔ ایک
دوسرے سے ٹھیک ٹھیک تمیز ہو سکتی ہے۔ ترقی یافتہ علم کی صحیح صحیح تعریفیں واقعی طور پر سمجھ
میں آسکتی ہیں۔ پس ہم کو لازم ہے کہ ابتدائی تعلیم میں ناتکمل خیالات ہی پر قناعت
کریں۔ ہمارا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ اُن خیالات کو بتدریج زیادہ صاف اور واضح
کیا جائے۔ اور یہ مقصد اس طرح پورا ہو سکتا ہے کہ اوّل اُن ہی تجربوں کے حاصل کرنے

میں سہولت پیدا کی جائے۔ جن سے بچوں کی موٹی موٹی غلطیاں دور ہو جائیں اور بعد ازاں
اُن غلطیوں کی اصلاح بہ تدریج ہو جائے جو اُن سے کم درجہ کی ہیں۔ اور جس وقت
تصورات کامل ہو جائیں علمی اصول صرف اُسی وقت بتانے چاہئیں۔

(۳) یہ قول کہ "اسباق مادیات سے شروع ہونے چاہئیں اور مجردات پر ختم
ہونے چاہئیں" اس قول کی نسبت یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ وہ اصول مذکورہ بالا میں
سے پہلے اصول کا کسی قدر اعادہ ہے۔ تاہم یہ ایسا مسئلہ ہے جس کو ضرور بیان کرنا چاہیے۔
اگر اور کسی غرض سے نہیں۔ تو اسی غرض سے سہی کہ بعض صورتوں میں یہ بات ظاہر ہو جائے
کہ درحقیقت آسان باتیں کون سی ہیں اور مشکل باتیں کون سی۔ کیونکہ بدقسمتی سے اس
خصوص میں بہت کچھ غلط فہمی ہو رہی ہے۔ مجموعہ جزئیات کے ظاہر کرنے کے
لیے جو عام اصول لوگوں نے تجویز کیے ہیں۔ اور جن کی وجہ سے اُن کے تصورات
آسان ہو گئے ہیں [illegible] اس طرح کہ [illegible]
اسکول کی بابت لوگوں نے یہ قیاس کر لیا ہے کہ اُن کی وجہ سے بچہ کے تصورات
بھی ضرور آسان ہو جائینگے۔ اور وہ اس بات کو بھول گئے ہیں کہ عام اصول صرف اُن
خاص امور کے مجموعہ کے مقابلہ میں آسان ہوا کرتا ہے جو اُس میں شامل ہیں۔ یعنی وہ
نتیجہ۔ اُن میں سے کسی ایک حقیقت کی نسبت۔ اگر اُس کو بحیثیت انفرادی لیا جائے
زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ اور جب بہت سی حقیقتیں فرداً فرداً حاصل ہو جاتی ہیں۔ اُس کے
بعد ہی عام نتیجہ سے حافظہ کو سہولت اور عقل کو مدد مل سکتی ہے۔ اور جس نفس میں یہ
حقائق منفرداً موجود نہ ہوں۔ اُس کے لیے وہ نتیجہ بالضرور ایک عقدہ لاینحل
ہے۔ پس اِن دو قسم کی سہولتوں کو گڈمڈ کر دینے کی وجہ سے معلموں نے ہمیشہ ہی
غلطی کی ہے کہ وہ اصول اوّلیہ ہی سے تعلیم شروع کر دیتے ہیں۔ یہ کارروائی
اگرچہ ظاہراً نہیں۔ مگر حقیقتاً اُس ابتدائی قاعدہ ہی کے خلاف ہے جس کا حاصل یہ

> (۳) ابتدائی تعلیم میں [illegible] عام کی طرف یعنی مادیات سے مجردات کی طرف جانا چاہیئے۔

ہے کہ نفسِ ناطقہ کو اصولوں کی تعلیم مثالوں کے ذریعے سے دینی چاہیئے۔ اور اس طرح خاص سے عام کی طرف۔ یعنی مادّیات سے مجرّدات کی طرف اُس کی رہ نمائی کرنی چاہیئے۔

(۴) بچہ کی تعلیم۔ طریقہ اور تربیت دونوں کے اعتبار سے نوعِ انسان کی تعلیم کے مطابق ہونی چاہیئے۔ جب کہ تاریخی حیثیت سے اُس پر نظر کی جائے۔ اس مطلب کو دوسرے لفظوں میں یوں بیان کر سکتے ہیں۔ کہ جس طریقہ سے نوعِ انسان میں علم نے جنم لیا ہے فردِ واحد میں بھی اُسی طریقے کے مطابق اُس کا جنم ہونا چاہیئے۔ اگر ٹھیک ٹھیک دیکھا جائے تو ہم خیال کر سکتے ہیں کہ یہ اصول پہلے ہی کنایتہً بیان ہو چکا ہے۔ چوں کہ یہ دونوں ارتقا کے عمل ہیں۔ اِس لیے ضرور ہے کہ وہ اُن عام قوانینِ ارتقا کے موافق ہوں۔ جن کو ہم زور دیکر اوپر بیان کر چکے ہیں۔ اور اسی وجہ سے یہ دونوں عمل ایک دوسرے کے مطابق ضرور ہونے چاہئیں۔ [illegible] مشابہت اُس خاص ہدایت کی غرض سے بھی۔ جو اُس سے حاصل ہوتی ہے۔ قابلِ قدر ہے۔ ہم کو یقین ہے کہ قوم مسٹر کونت[۱] کی وجہ سے ممنونِ احسان ہے کہ انھوں نے اِس بات کو بیان کر دیا ہے اور ہم صاحبِ موصوف کے فلسفہ کے اِس حصّہ کو قبول کر سکتے ہیں۔ اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُن کے باقی ماندہ فلسفہ کو بھی تسلیم کر لیا جائے۔ کسی مجرد مسئلہ سے بالکل قطع نظر کر کے یہ مسئلہ دو دلیلوں سے ثابت ہو سکتا ہے۔ اور اُن میں سے کوئی ایک دلیل اُس کے ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ ایک دلیل تو قانونِ توارث سے پیدا ہوتی ہے (یعنی آبا و اجداد کے اوصاف و خصائل کا نسلاً بعد نسلٍ اولاد تک پہنچنا)۔ جب کہ اس قانون پر اُس کے وسیع تر نتائج کے اعتبار سے غور کی جائے۔ کیوں کہ۔ اگر یہ بات سچ ہو کہ لوگ شکل و شباہت اور عادات و خصلات

(۴) بچوں کی تعلیم اُسی اصول کے موافق ہونی چاہیئے جس کے موافق نوعِ انسان نے تعلیم حاصل کی ہے۔

[۱] کونت۔ فرانس کا ایک فلسفی تھا ۱۷۹۸ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۸۵۷ء میں انتقال کیا۔ مترجم

دونوں میں اپنے اسلاف کے ساتھ مشابہت ظاہر کرتے ہیں۔ اگر یہ بات سچ ہو کہ
بعض عقلی ظہور۔ مثلاً جنون۔ ایک ہی خاندان کے لوگوں میں ایک ہی عمر میں نسلاً
بعد نسلٍ پیش آتے ہیں۔ اگر بعض منفرد صورتوں (خاص شخصوں) سے قطع نظر کر کے
جن میں بہت سے مردہ بزرگوں کے خط وخال چند زندہ بزرگوں کے خط وخال کے
ساتھ مل جل کر اس قانون کو بہت کچھ تاریکی میں ڈال دیتے ہیں۔ تاہم قومی شکل وشباہت
کی طرف توجہ کریں۔ اور اس امر پر غور کریں کہ ان کے باہمی اختلافات قرناً بعد قرنٍ
کیسے مستقل رہتے ہیں۔ اگر ہم یہ بات یاد رکھیں کہ یہ شکل وشباہت ایک [illegible] مشترک مخرج
سے پیدا ہوئی ہے۔ اور یہ کہ اسی وجہ سے موجودہ نمایاں فرق جو ان میں پائے
جاتے ہیں۔ وہ بالضرور ان تبدیل شدہ حالات کے اثر سے پیدا ہوئے ہیں
جو یکے بعد دیگرے ان نسلوں کو پیش آئے ہیں۔ اور ان نسلوں نے اثراتِ مجتمعہ
کو جدا جدا اپنی اولاد تک پہنچایا ہے۔ اگر ہم کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ آج کل یہ فرق
خلقی ہیں۔ یہاں تک کہ ایک فرانسیسی بچہ۔ اگر اجنبی لوگوں میں پرورش پائے
تو بھی۔ بڑا ہو کر فرانسیسی آدمی بن جاتا ہے۔ اور اگر یہ عام بات جس کی ہم نے اس
طرح تشریح کر دی ہے۔ جملہ کائنات ذی [illegible] بابت صادق آتی ہے۔ جس میں عقل بھی
شامل ہے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر کوئی ایسی ترتیب موجود ہو۔ جس ترتیب سے کہ نسلِ
انسانی نے مختلف قسم کے علوم پر عبور حاصل کیا ہے۔ تو ہر ایک بچہ میں اس قسم کے
علموں کو حاصل کرنے کی قابلیت اسی ترتیب سے پیدا ہو گی۔ پس اگر یہ ترتیب
فی حدِ ذاتہٖ غیر ضروری ہو۔ تو بھی تعلیم میں اس بات سے سہولت ضرور پیدا ہو جائیگی
کہ فرد واحد کے نفس کو اسی راہ پر قدم بہ قدم لے جائیں۔ جس بالعموم
نوعِ انسانی نے طے کیا ہے۔ مگر یہ ترتیب فی حدِ ذاتہٖ غیر ضروری نہیں ہے
لہذا یہ ایک اہم وجہ ہے کہ تعلیم میں کسی قدر تمدن کا اعادہ ہونا چاہیئے۔ یہ دونوں

باتیں ثابت ہو سکتی ہیں۔ کہ تاریخی واقعات کی بڑی بڑی باتوں کا ایک خاص ترتیب سے وقوع پذیر ہونا۔ ایک لازمی نتیجہ تھا۔ اور یہ کہ جو اسباب اس امر کا باعث ہوئے ہیں۔ وہ جس طرح نسل انسانی پر صادق آتے ہیں اُسی طرح ایک بچہ پر بھی صادق آتے ہیں۔ ان اسباب کی بالتفصیل صراحت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں صرف اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ چوں کہ نوع انسان کے نفس ناطقہ نے مظاہر قدرت کے درمیان رہ کر۔ اور اُن کو سمجھنے کی کوشش کر کے۔ بے حد و حساب مقابلوں۔ خیالوں۔ تجربوں۔ اور مسئلوں کے بعد ایک خاص راہ سے ہر مضمون میں موجودہ علم تک۔ رسائی حاصل کی ہے۔ لہذا معقول طور پر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ نفس ناطقہ اور مظاہر قدرت کا تعلق ایسا ہے کہ وہ اس علم کو کسی دوسرے رستہ سے حاصل ہونے سے روکتا ہے۔ اور چوں کہ ہر ایک بچہ کا نفس ناطقہ بھی مظاہر قدرت کے ساتھ یہی علاقہ رکھتا ہے۔ اس لیئے صرف اسی رستہ سے اُن مظاہر تک اُس کی رسائی ہو سکتی ہے یہی وجہ ہے کہ تعلیم کے صحیح طریقہ کی بابت تصفیہ کرنے میں طریق تمدن کی تحقیقات ہماری ہدایت کے لیئے ممد و معاون ہوگی۔

(۵) اس قسم کی تحقیقات جن نتائج تک ہم کو پہنچاتی ہے۔ اُن میں سے ایک نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم کی ہر ایک شاخ میں ہم کو عملی علم سے عقلی علم تک پہنچنا چاہیئے۔ انسانی ترقی کے دوران میں ہر ایک علم (سائنس) اپنے اپنے فن (آرٹ) سے نکلا ہے۔ شخصی حیثیت سے اور نیز بہ حیثیت قوم ہم کو اس امر کی ضرورت درپیش ہے کہ مادیات کے ذریعے مجردات تک رسائی حاصل کریں۔ اسی ضرورت کا یہ نتیجہ ہے کہ سائنس کے وجود سے پہلے مشق اور تجربہ۔ جو مشق سے حاصل ہوتا ہے۔ اور مشق کے عملی نتائج کا وجود ضروری ہے۔ سائنس۔ منضبط علم ہے۔ اور علم کے منضبط ہونے سے پہلے ضرور ہے کہ اُس کا کسی قدر

(۵) تعلیم کی ہر شاخ میں عملی علم سے عقلی علم تک پہنچنا چاہیئے۔

حصہ ہمارے قبضہ میں ہو۔ پس ہر ایک مطالعہ کی تمہید خالص تجربہ سے ہونی چاہیئے۔ اور جب مشاہدات کا وافر سرمایہ جمع ہو جائے اُس کے بعد دلیل کو شروع کرنا چاہیئے۔ اس قاعدہ کی توضیح میں ہم بطور تمثیل کے جدید نصاب تعلیم کو پیش کر سکتے ہیں جس میں صرف و نحو کی تعلیم کو زبان سے پہلے نہیں۔ بلکہ بعد میں رکھا گیا ہے۔ یا اس معمولی دستور کو پیش کر سکتے ہیں کہ فن مصوری میں قرب و بعد کے لحاظ سے اشیاء کی چھٹائی بڑائی کا خیال رکھنے سے پہلے عملی مصوری کی تعلیم دی جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ ہم اس بات کو بیان کرینگے کہ اس قاعدہ کا مزید اطلاق کن صورتوں میں ہو سکتا ہے۔

(۶) بچوں کو اس بات کی ترغیب دینی چاہیئے کہ جہاں تک ممکن ہو اپنے علم کو آپ ترقی دیں۔

(۶) مذکورہ بالا عام اصول سے دوسرا نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ تعلیم میں بچوں کو اس بات کی ہمت دلانی چاہیئے کہ وہ اپنے قوائے عقلیہ کو بطور خود ترقی دیں۔ یہ ایسا نتیجہ ہے کہ خواہ کتنی ہی سرگرمی سے اُس پر زور دیا جائے پھر بھی کم ہے۔ بچوں کو اس طرح رہنمائی کرنی چاہیئے کہ وہ اپنے آپ تحقیقات کریں اور اپنے آپ نتائج نکالیں۔ اُن کو جہاں تک ممکن ہو کم بتایا جائے اور جہاں تک ممکن ہو زیادہ تحقیقات کرنے کی ترغیب دی جائے۔ نوع انسان نے اپنے نفس کو آپ ہی تعلیم دینے سے ترقی کی ہے۔ اور اُن لوگوں کی نمایاں کامیابی سے۔ جو اپنی ہی کوشش سے بن گئے ہیں۔ یہ بات برابر ثابت ہو رہی ہے کہ بہترین نتائج حاصل کرنے کی غرض سے ہر ایک نفس کے واسطے ضروری امر ہے کہ کسی قدر اُسی روش پر ترقی کرے۔ جن لوگوں نے مدرسہ کی معمولی تربیت حاصل کی ہے اور جو مدرسے اس خیال کو اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ کہ تعلیم صرف اُسی قدیم ڈگر پر چل سکتی ہے۔ اُن کو تو اس خیال سے مایوسی ہوگی کہ بچوں کو آپ اپنا معلم بنایا جائے۔ البتہ۔ اگر وہ اس بات پر غور کریں کہ گرد و پیش کی اشیا کا نہایت ضروری علم جس کو بچہ ابتدائی عمر میں حاصل کرتا ہے۔ وہ بغیر مدد کے حاصل ہوتا ہے۔ اگر وہ اس بات کو یاد کریں کہ بچہ اپنی مادری زبان کا استعمال خود ہی سیکھتا ہے۔ اگر وہ اس بات کا اندازہ کریں کہ

زندگی میں تجربہ کیا کچھ بڑھ جاتا ہے یعنی مدرسہ سے باہر نکل کر عقل میں کس قدر ترقی ہو جاتی ہے جس عقل و تجربہ کو ہر ایک بچہ بطور خود حاصل کرتا ہے - اگر وہ لندن کے اُس آوارہ لڑکے کی غیر معمولی ذکاوت پر غور کریں جس کا کوئی خبر گیراں نہیں ہوتا - جس کی ذکاوت اُن کاموں میں ظاہر ہوتی ہے - جن میں اُس کی قوتیں مصروف رہتی ہیں - مزید براں اگر وہ یہ خیال کریں کہ کتنے بہت سے آدمی - نہ صرف ہمارے نامعقول نصاب تعلیم کی بھول بھلیاں میں بلکہ اور بھی بے شمار مزاحمتوں میں بلا امداد غیرے کشش و کوشش کر چکے ہیں - تو اُن کو معلوم ہو جائیگا کہ یہ نتیجہ کچھ خلاف عقل نہیں ہے کہ اگر کسی معمولی استعداد والے طالب علم کے سامنے مضامین کو صحیح ترتیب اور صحیح شکل میں پیش کیا جائے تو وہ اپنی مشکلات کو بہت ہی تھوڑی مدد سے بہ تدریج حل کر لیگا - بھلا کون ایسا شخص ہوگا جو اُس لگاتار مشاہدہ اور تحقیقات اور نتیجہ کو جو بچہ کے دل میں پیدا ہوتے رہتے ہیں - غور سے دیکھے - یا ایسے معاملات میں جو اُس کے قوای عقلیہ کی حد کے اندر ہیں - اُس کی عاقلانہ بات چیت کو غور سے سُنے - اور اس کو یہ معلوم نہ ہو جائے کہ اگر ان ہی قوتوں کو جو بچہ میں ظاہر ہوتی ہیں - ایسی چیزوں پر باقاعدہ مصروف رکھا جائے - جو اُس کی عقلی حد کے اندر ہیں - تو وہ بغیر مدد کے اُن کو جلد حاصل کر سکتا ہے ؟ یہ جو بچہ کو ہر ایک بات بتا دینے کی ضرورت ہمیشہ پیش آتی ہے - بچہ کی حماقت کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ہماری اپنی حماقت کا نتیجہ ہے جن باتوں سے بچہ کو دلچسپی ہے - اور جن کو وہ بذات خود مستعدی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے - ہم اُس کو اُن باتوں سے ہٹا دیتے ہیں - ہم اُس کے سامنے ایسی مشکل باتیں رکھ دیتے ہیں جن کو وہ سمجھ نہیں سکتا - اور اسی وجہ سے وہ اُس کو ناگوار معلوم ہوتی ہیں یہ معلوم کر کے کہ وہ خوشی خوشی اِن باتوں کو حاصل کرنا نہیں چاہتا - ہم تنبیہ و تہدید اور سزا کے زور سے اُن کو اُس کے دل میں ٹھونس دیتے ہیں - جس علم کی تحصیل

کو خواہش ہے۔ اُس علم سے تو اُس کو محروم رکھتے ہیں۔ اور جس علم کو وہ ہضم نہیں کر سکتا۔ اُس کو اُس کے اندر ٹھونس کر بھر دیتے ہیں۔ اِس سے اُس کے قویٰ کی حالت خراب ہو جاتی ہے۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُس کو بالعموم علم ہی سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور جب بچہ کسی بات کو بغیر سمجھائے نہیں سمجھ سکتا۔ اور محض ایک کاہل و مجہول آدمی کی طرح تعلیم حاصل کرتا ہے۔ اور یہ نتیجہ ہے کچھ تو اُس احمقانہ کاہلی کا جو ہم نے پیدا کی ہے۔ اور کچھ تحصیل علم میں اُس کی نالیاقتی کا۔ جو ہمیشہ بڑھتی رہتی ہے تو ہم یہی نتیجہ نکالتے ہیں کہ تعلیم کو بالضرور اسی طریقہ کے موافق جاری رکھنا چاہیئے ہم خود اپنے طریقہ تعلیم کی وجہ سے طلبہ کو لاچاری اور بےکسی کی ترغیب دیتے ہیں۔ اور اُس طریقہ تعلیم کو اِس لاچاری اور بےکسی کی علت قرار دیتے ہیں۔ پس صاف ظاہر ہے کہ جس طریقہ تعلیم کی ہم حمایت کر رہے ہیں۔ اُس کے خلاف میں نیم ملّاؤں کے تجربے کو پیش کرنا معقول بات نہیں ہے۔ اور جو شخص یہ بات سمجھتا ہے وہ یہ بھی سمجھ لے گا کہ ہم ہر حالت میں بے کھٹکے قدرت کی تربیت کی پیروی کر سکتے ہیں۔ یعنی نفس ناطقہ جس طرح ابتدائی مدارج میں بطور خود نشو و نما حاصل کرتا ہے اسی طرح مدارج مابعد میں بھی۔ اگر سلیقہ سے انتظام کیا جائے۔ بطور خود نشو و نما حاصل کر سکتا ہے۔ اور یہ بات بھی سمجھ لے گا کہ یہی ایسا کام ہے۔ جس کے کرنے سے نفس ناطقہ میں نہائت اعلیٰ درجہ کی قوت اور چستی و چالاکی پیدا ہو سکتی ہے۔

(۷) طریقہ تعلیم ایسا ہونا چاہیئے جس سے بچوں کو فرحت و مسرت حاصل ہو

(۷) جس آخری معیار پر تربیت کی کسی تدبیر کو پرکھنا چاہیئے وہ یہی سوال ہونا چاہیئے کہ آیا اُس تدبیر سے شاگردوں میں جوش مسرت پیدا ہوتا ہے یا نہیں۔ جب ہم کو اِس بات میں شبہ ہو کہ آیا فلاں طریقہ یا انتظام۔ بہ نسبت کسی دوسرے طریقہ یا انتظام کے۔ اصول متذکرہ بالا سے زیادہ تر موافقت رکھتا ہے یا نہیں۔ تو ہم اس معیار پر بے کھٹکے قایم رہ سکتے ہیں۔ اگر اصول حیثیت سے غور کرنے کے بعد کوئی

مجوزہ نصاب سب سے بہتر معلوم ہو۔ مگر اُس سے بچوں کو کوئی دلچسپی پیدا نہ ہو یا بمقابلہ کسی دوسرے نصاب کے کم دلچسپی پیدا ہو۔ تو بھی اُس کو ترک کر دینا چاہیے۔ کیوں کہ بچے کی عقلی فطرت ہمارے دلائل کی نسبت۔ زیادہ قابل اعتبار ہے قوای تعلّم کی بابت ہم اِس عام قانون پر پورا بھروسا کر سکتے ہیں کہ اگر با قاعدہ شرائط پائی جائیں تو صحت بخش عمل سے خوب فرحت ہوتا ہے۔ اور جس عمل سے تکلیف ہوتی ہے۔ وہ صحت بخش نہیں ہوتا۔ اگرچہ جذباتی فطرت کو اس قانون کے ساتھ بالفعل پوری موافقت نہیں ہے۔ تاہم عقلی فطرت یا کم از کم اُس کے وہ حصے جن کا ظہور بچے کی طبیعت میں ہوتا ہے۔ اس قانون سے قریب قریب پوری موافقت رکھتے ہیں۔ یہ جو خاص خاص مضمونوں سے بچوں کو نفرت ہوتی ہے۔ اور جس سے معمولی معلّم دق آجاتا ہے۔ یہ نفرت خلقی اور طبعی نہیں ہے۔ بلکہ معلّم کے ناوانش مندانہ طرز تعلیم کا نتیجہ ہوتا ہے۔ فیلن[1] برگ کہتا ہے کہ "تجربے نے مجھے سکھا دیا ہے کہ نوعمر اشخاص میں سستی و کاہلی کا پایا جانا۔ اُس چستی و چالاکی سے جس کی طرف اُن کو قدرتی میلان ہوتا ہے۔ براہ راست اِس قدر مخالف ہے۔ کہ وہ سستی و کاہلی تقریبًا ہمیشہ کسی نہ کسی جسمانی نقص سے پیدا ہوتی ہے۔ بجز اُس صورت کے کہ خراب تعلیم کا نتیجہ ہو۔ اور قدرتی چستی و چالاکی۔ جس کی طرف بچے اس طرح مائل ہوتے ہیں گویا اُن ہی مسرتوں کا حاصل کرنا ہے۔ جو قوی کی صحت بخش ورزش سے حاصل ہوتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بعض اعلیٰ درجے کے قوای عقلیہ جنہوں نے اب تک نسل انسانی میں بہت کم نشو و نما پایا ہے۔ اور جو نہایت اعلیٰ درجے کے ترقی یافتہ لوگوں ہی میں۔ کسی قدر زیادہ مقدار میں خلقی طور پر موجود ہوتے ہیں۔ وہ قوی اس قدر محنت کی طرف مائل نہیں ہوتے جو اُن سے لی جاتی ہے۔ مگر بوجہ اس کے کہ یہ قوی نہایت پیچیدہ ہوتے ہیں۔ با قاعدہ طریقۂ تربیت میں۔ اُن کا عمل سب سے پیچھے ہوتا ہے۔ اور جب تک طالب علم اُس

[1] فیلن برگ۔ ملک سوئٹزرلینڈ کا باشندہ اور طریقہ تعلیم صنعت و حرفت کا ماہر تھا۔ ۱۷۷۱ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۸۴۴ء میں فوت ہوا۔ مترجم

عمر تک نہ پہنچ جائے - جس عمر میں محرکات بعیدہ کو کام میں لایا جا سکتا ہے - اور بالواسطہ خوشی کا موازنہ بلا واسطہ خوشی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے - اُس وقت تک اُن قوی سے کوئی کام نہیں لیا جائیگا - مگر اُن پیچیدہ قوتوں کی نسبت جو قوتیں درجہ میں کم ہیں - اُن کا باقاعدہ محرک وہ خوشی ہے جو اُن قوتوں کو عمل میں لانے سے براہ راست حاصل ہوتی ہے - اور اگر عمدہ انتظام ہو تو صرف اِسی محرک کی ضرورت ہے - جب اس کو چھوڑ کر کوئی دوسرا محرک ہم کو اختیار کرنا پڑے تو ہم کو بطور ثبوت کے یہ بات تسلیم کر لینی چاہیئے کہ ہم غلط راہ پر چل رہے ہیں - تجربہ روزمرہ زیادہ صفائی سے یہ بات ثابت کر رہا ہے کہ ہمیشہ ایسا طریقہ دریافت کرنا چاہیئے - جو دلچسپی بلکہ خوشی کا بھی پیدا کرنے والا ہو - اور ہمیشہ یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ باقی تمام معیاروں کی رو سے بھی یہی طریقہ صحیح ثابت ہوتا ہے

پستالوتزی کی اس رائے سے سب کو اتفاق ہے کہ بچوں کی تعلیم شیرخواری ہی کے زمانہ سے شروع ہونی چاہیئے -

اگر اِن اصول ہدایت کو اسی مجرد شکل میں چھوڑ دیا جائے تو اکثر آدمی اُن کو نہایت کم وزن سمجھینگے - پس کچھ تو اس غرض سے کہ اُن کے اطلاق کو مثالوں کے ذریعہ سے واضح کر دیا جائے اور کچھ اس نظر سے کہ چند خاص تجاویز پیش کی جائیں - اب ہم تعلیم کے خیالی منصوبہ سے اُس کے عملی پہلو کی طرف رجوع کرتے ہیں -

پستالوتزی کی یہ رائے تھی کہ کسی نہ کسی قسم کی تعلیم گہوارہ ہی سے شروع ہو جانی چاہیئے - اور اُس کے زمانہ سے لے کر آج تک یہی رائے ہمیشہ ترقی پر ہے جس شخص نے ذرا غور و خوض سے شیرخوار بچہ کو دیکھا ہے - کہ وہ کھلی آنکھوں گھور گھور کر گرد و پیش کی چیزوں پر نظر ڈالتا ہے - وہ اِس بات کو بہت اچھی طرح جانتا ہے کہ تعلیم ابتدائی عمر میں بالضرور شروع ہو جاتی ہے - خواہ ہم تعلیم کا ارادہ کریں خواہ نہ کریں - اور یہ جو بچہ ہر چیز کو - جو اُس کے ہاتھ آجاتی ہے - ٹٹولتا چھوتا اور چوستا ہے - ہر ایک آواز کو منہ کھول کر سنتا ہے یہ اُس سلسلہ کے ابتدائی درجے ہیں - جو بن دیکھے سیاروں کی تحقیقات حسابی کلون کی ایجاد - بڑے بڑے مصوّری کے کاموں - یا نغمات خوش آہنگ اور

موسیقی ناٹکوں کی تصنیف پر جا کر منتہی ہوتا ہے۔ بچوں کا اوّل ہی سے قوی کا یہ عمل قدرتی اور لازمی ہوتا ہے۔ اس لیے یہ سوال درپیش ہے کہ "آیا ہم کو بچوں کے لیے مختلف قسم کے مواد کی ایک واجبی مقدار بہم پہنچانی چاہیے؟ جن پر وہ اپنی قوتوں کی مشق کر سکیں"۔ اور یہ جو سوال کیا گیا ہے مثبت جواب کے سوا اس کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا مگر جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے پستالوتزی کے خیال کے ساتھ موافقت کرنے میں یہ بات داخل نہیں ہے کہ اُس کے عمل کے ساتھ بھی موافقت کرنی چاہیے۔ اور اس مطلب کی ایک مثال بھی موجود ہے۔ بچوں کی تعلیم پر بحث کرتے ہوئے پستالوتزی یہ کہتا ہے:-

بچوں کی تعلیم اور ابتدائی تربیت کی نسبت پستالوتزی کی رائے اور اس رائے کی غلطی۔

"اس لیے بچوں کی کتاب میں زبان کی تمام آوازیں شامل ہونی چاہئیں۔ اور ہر ایک خاندان میں بچوں کو شیر خوارگی ہی کے زمانہ سے اُن آوازوں کی تعلیم دینی چاہیے۔ جو بچہ اپنی بچوں کی کتاب یاد کرے اُس کو چاہیے کہ گہوارہ کے شیر خوار بچے کے سامنے اُن کو دہرائے قبل اس کے کہ وہ اُن میں سے کسی ایک آواز کا تلفظ ادا کر سکے۔ تاکہ بار بار دہرانے سے اُس کے دل پر اُن آوازوں کا گہرا نقش جم جائے۔"

اگر اس طریقہ کو "دایہ خانہ کے قاعدہ" (تربیت اطفال) کی تجاویز کے ساتھ شامل کر دیا جائے۔ جو پستالوتزی کی کتاب "مدرز مینول" (ماں کی کتاب) میں درج ہیں۔ اور جن میں اُس نے اسماء۔ مقامات۔ تعلقات۔ اعداد۔ خواص۔ اور اعضاءِ جسم کے فوائد کو ابتدائی سبقوں میں رکھا ہے۔ تو یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ ابتدائی عقلی نشوونما کی بابت پستالوتزی کے خیالات اس قدر خام تھے کہ وہ عاقلانہ تدبیریں نہیں نکال سکتا تھا۔ آؤ اب اُس طریقہ تعلیم پر غور کریں۔ جس کی ہدایت سائیکالوجی کرتی ہے۔

مزید تشریح اس امر کی کہ شیر خوار بچہ آسان باتوں سے مشکل باتوں تک بہ تدریج ترقی کرتا ہے

نہایت ہی ابتدائی عمر میں جن خیالات سے نفس متاثر ہو سکتا ہے وہ ناقابل تحلیل (مفرد) احساسات ہیں جو حرارت۔ روشنی۔ آواز وغیرہ سے پیدا ہوتے ہیں

یہ بات ظاہر ہے کہ شعور کی وہ حالتیں جو قابل تحلیل (مرکب) ہیں۔ اُن کا وجود شعور کی اُن مفرد حالتوں سے مقدم نہیں ہو سکتا۔ جن سے وہ مرکب ہیں۔ جب تک روشنی کے مختلف درجوں اور صفتوں سے یا مزاحمت کی مختلف قسم کی سختیوں سے کسی قدر واقفیت حاصل نہ ہو جائے۔ اُس وقت تک شکل کا تصور نہیں ہو سکتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہم مرئی شکل کو طرح طرح کی روشنی کے ذریعے سے اور شکل ممکن اللمس کو طرح طرح کی مزاحمت کے ذریعے سے شناخت کرتے ہیں اور یہ مسئلہ مدت سے لوگوں کو معلوم ہے۔ علیٰ ہذالقیاس کوئی مرکب آواز اُس وقت تک محسوس نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ اُن مفرد آوازوں کو نہ سیکھ لیں۔ جن سے وہ آواز مرکب ہے۔ اور باقی تمام صورتوں میں بھی ضرور یہی کیفیت ہوگی۔ پس ترقی کے اس لازمی قانون کی پیروی کر کے کہ "ترقی سادہ صورت سے شروع ہو کر پیچیدہ صورت تک پہنچتی ہے" ہم کو چاہیے کہ شیر خوار بچہ کے واسطے ایسی چیزوں کا کافی ذخیرہ بہم پہنچاویں جن میں مختلف درجہ اور مختلف قسم کی مزاحمت پائی جائے اور ایسی چیزوں کا کافی ذخیرہ۔ جن سے ایسی روشنی منعکس ہو۔ جو اپنی مقدار اور صفات کے لحاظ سے مختلف قسم کی ہو۔ اور ایسی آوازوں کا کافی ذخیرہ۔ جو اپنی بلندی۔ اپنے اُتار چڑھاؤ۔ اور اپنے لہجہ میں ایک دوسرے سے مختلف ہوں۔ اگر لوگوں کو یہ بات یاد دلائی جائے کہ "چھوٹے بچہ کو۔ اپنے کھلونوں کو منہ سے کاٹنے سے۔ بھائی کی صدری کے چمک دار بٹنوں کو ٹٹولنے سے۔ اور باپ کی مونچھوں کو کھینچنے سے کس قدر خوشی حاصل ہوتی ہے" "کسی بھڑک دار رنگین شئے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے میں وہ کیسا محو ہو جاتا ہے" "اور محض اس کے چمک دار رنگوں کی وجہ سے اُس پر لفظ "اچھی" کا اطلاق کرتا ہے۔ جب کہ وہ اس لفظ کا تلفظ ادا کر سکتا ہے" "اور وہ اپنی انا کی بکواس کو سننے سے۔ کسی ملاقاتی کی انگلیوں کو چٹخانے۔ یا کسی آواز کے سننے سے۔ جو پہلے نہیں

سُنی - اُس کا چہرہ ہنسی کے مارے کیسا کھِل جاتا ہے تو وہ سب اِس بات کو خوب سمجھ لینگے - کہ یہ نتیجہ جو بُرہان لمّی سے نکلتا ہے - شیر خواروں کی فطرت - اُس نتیجہ کی کیسی پوری پوری تصدیق کرتی ہے - خوش قسمتی سے - دایہ خانہ کے معمولی دستور العمل تعلیم کی اِن ابتدائی ضروریات کو ایک معقول درجہ تک پورا کرتے ہیں مگر ابھی بہت کچھہ کرنا باقی ہے - اور اس کام کا پورا کرنا اول اول جیسا ضروری معلوم ہوتا ہے - اُس سے زیادہ ضروری ہے - ہر ایک قوت اُس قدرتی عمل کے زمانہ میں - جو اُس کے نشوونما کے ساتھہ ہوتا رہتا ہے - بہ نسبت کسی دوسرے زمانہ کے - زیادہ قوی اور گہرے اثرات کو قبول کر سکتی ہے اس کے علاوہ چونکہ اِن نہایت ہی سیدہے سادے ابتدائی اصول سے پوری واقفیت حاصل کرنی پڑتی ہے - اور چونکہ اس واقفیت کے حصول میں - خواہ کبھی حاصل ہو وقت ضرور لگتا ہے - اس لیے وقت کی کفائت اسی میں ہے کہ بچپن کے اِس ابتدائی زمانہ کو جس میں کوئی دوسرا عقلی عمل ممکن نہیں ہے - صرف اسی کام میں مصروف رکھا جائے کہ بچوں کو اُن اصول اور اُن اصول کی مختلف صورتوں سے پوری واقفیت حاصل ہو جائے - اس امر کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ جن خیالات کو ہر ایک بچہ طبعی شوق سے ذہن نشین کرتا ہے - اگر اُن خیالات کو باقاعدہ طور پر مہیا کر دیا جائے تو اس سے بچہ کو ہمیشہ ایسا حظ حاصل ہوتا ہے جس سے اُس کے مزاج اور صحت دونوں کو ترقی ہوتی ہے - اگر یہاں کچھہ گنجایش ہوتی - تو بعض ایسی تجویزوں کا درج کرنا مناسب ہوتا - جن میں یہ بات بتائی جاتی کہ اُن سیدہے سادے ادراکات کا زیادہ باقاعدہ بندوبست کیونکر ہو سکتا ہے - مگر صرف اسی بات کا بتا دینا کافی ہے کہ جس انتظام میں اِس عام قانونِ ارتقا کو تسلیم کیا گیا ہو کہ وہ مبہم اور غیر معین چیزوں سے ترقی کرکے قطعی اور معین چیزوں تک پہنچتے ہیں تو اُس انتظام کی بنیاد اس نتیجہ پر رکھنی چاہیے - کہ ہر ایک قوت کے نشوونما میں - اوّل اوّل اُن ہی خیالات میں

تمیز کرنی چاہیے۔ جن میں صاف نمایاں فرق نظر آتا ہو" اور اسی وجہ سے جو آوازیں بلندی اور اُتار چڑھاؤ میں بہت مختلف ہوں جو رنگ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوں۔ اور جو چیزیں سختی یا ساخت میں نہایت نامشابہ ہوں۔ اُن کو سب سے پہلے مہیا کرنا چاہیے۔ اور جو خیالات باہم دگر زیادہ قریبی تعلق رکھتے ہوں اُن خیالات تک ہر حالت میں آہستہ آہستہ بہ تدریج پہنچنا چاہیے۔

زمانہ شیر خواری کے بعد اسباق الاشیاء کی تعلیم تربیت حواس کے لیے ضروری ہے اور اسباق کی تعلیم کا طریقہ۔

اب ہم اسباق الاشیاء کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سبق حواس کی اس ابتدائی تربیت کا قدرتی سلسلہ ہیں۔ اس بارہ میں ہم کو یہ بیان کرنا ہے کہ جو طریقہ تعلیم عموماً اختیار کیا گیا ہے۔ وہ قدرت کے طریقہ کے بالکل خلاف ہے اور اس بات کا ظہور زمانہ شیر خواری۔ زمانہ بلوغ۔ اور طریق تمدن میں یکساں ہو رہا ہے مسٹر مارسل کہتے ہیں کہ "بچے کو یہ بات دکھانی چاہیے کہ ایک شئے کے تمام حصے کس طرح ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ وغیرہ" اور ان اسباق الاشیاء کی مختلف کتابوں میں محض واقعات کی فہرستیں ہوتی ہیں۔ اور جو شئے بچے کے سامنے رکھی جاتی ہے۔ اُس کی بابت وہ واقعات اُس کو بتا دیے جاتے ہیں۔ اب اس بات کو سمجھنے کے لیے کہ قوتِ گویائی کے حاصل ہونے سے پہلے چیزوں کی بابت جو کچھ علم حاصل ہوتا ہے۔ وہ از خود حاصل ہوتا ہے۔ ہم کو شیر خوار بچے کی روزانہ زندگی پر صرف ایک نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً سختی اور وزن کی صفتیں جو خاص خاص صورتوں سے تعلق رکھتی ہیں" خاص شخصوں کا خاص شکلیں اور خاص رنگ رکھنا" "خاص صورتوں کے جانوروں کا خاص قسم کی آوازیں نکالنا" یہ ایسے مظاہر قدرت ہیں جن کا مشاہدہ بچہ خود بخود کرتا ہے۔ بڑی عمر میں بھی جب کہ معلم پاس نہیں ہوتے یہ بات ضرور ہے کہ جو مشاہدے اور نتیجے ہر گھڑی ہدایت کے واسطے درکار ہیں۔ اُن کو بغیر کسی کی مدد کے حاصل کیا جائے۔ اور جس قدر

صحت اور تکمیل کے ساتھ اُن کو حاصل کیا جائے اُسی قدر زندگی کی کامیابی کا اُن پر
دارومدار ہے پس کیا یہ بات قرین قیاس ہے کہ جس حالت میں شیرخوار بچہ اور بڑا آدمی دونوں
باربار اُسی طریقہ پر عمل کرتے ہیں۔ جو جملہ بنی نوع انسان کی ترقی میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔
شیرخواری اور جوانی کے درمیان زمانہ میں اس کے بالعکس طریقہ اختیار کیا جائے؟ اور
وہ بھی ایسی سیدھی سادی بات میں جیسا کہ خواص اشیا کا علم حاصل کرنا؟ برعکس اِس
کے۔ کیا یہ بات صاف ظاہر نہیں ہے کہ ہر حالت میں ایک ہی طریقہ کی پابندی رکھنی
لازم ہے؟ اور کیا قدرت ہمیشہ جبراً اسی طریقہ کی طرف ہم کو ہدایت نہیں کرتی۔ اگر ہم میں
اتنی ہی عقل ہو کہ اُس کو سمجھیں اور اتنا انکسار ہو کہ اُس کو اختیار کریں؟ اس سے زیادہ صاف
اور صریح بات اور کیا ہوگی کہ بچے عقلی ہمدردی چاہتے ہیں؟ دھیان کرو کہ شیرخوار
بچہ جو تمہاری گود میں بیٹھا ہوا ہے۔ اُس کھلونے کو۔ جو اُس کے ہاتھ میں ہے۔ تمہارے
منہ کی طرف کیسا گھسا دیتا ہے۔ اِس غرض سے کہ تم اُس کو دیکھو۔ دیکھو جب وہ میز
پر اپنی گیلی اُنگلی سے ایک خاص آواز پیدا کرتا ہے۔ تو کیسا مُڑ مُڑ کر تم کو دیکھتا ہے۔ پھر ایسا
ہی کرتا ہے۔ اور پھر تم کو دیکھتا ہے۔ گویا حتی الامکان صاف طور پر بہ زبان حال یہ
کہتا ہے کہ "اس نئی آواز کو سنو" غور کرو کہ بڑی عمر کے بچے کمرہ میں آکر بول اُٹھتے ہیں:
"اماں۔ دیکھو کیسی عجیب چیز ہے" "اماں۔ اس چیز کو دیکھو" "اماں۔ اُس چیز کو دیکھو"
یہ ایسی عادت ہے کہ وہ اس کو جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر نادان ماں اُن سے یہ نہ
کہہ دے کہ "تم مجھے دق نہ کرو" مشاہدہ کرلو کہ جب چھوٹے بچے انّا کے ساتھ باہر سیر کو
جاتے ہیں۔ تو ہر ایک بچہ اُس نئے پھول کو لے کر۔ جو اُس نے توڑا ہے۔ دوڑ کر انّا کے
پاس آتا ہے۔ تاکہ اُس کو دکھائے کہ وہ پھول کیسا خوب صورت ہے۔ اور اُس سے یہی
کہلائے کہ ہاں خوب صورت ہے۔ غور کرو کہ کس ذوق و شوق کی چرب زبانی سے ہر ایک
لڑکا کسی ایسی نئی چیز کا حال بیان کرتا ہے۔ جس کو وہ دیکھ آیا ہے۔ اگر اُس کو

کوئی شخص ایسا مل جائے جو ذرا بھی دلچسپی سے اُس کی بات پر توجہ کرے۔ کیا یہ بات نہیں ہے؟ کہ یہ نتیجہ سطح پر موجود ہے۔ (اور اُس کو نکالنے کے لیے خوض کی ضرورت نہیں ہے)۔ کیا یہ بات صاف ظاہر نہیں ہے کہ اسی عقلی فطرت کے موافق ہم کو اپنا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔ یعنی ہم کو بھی قدرتی عمل کے ساتھ ہمدردی کرنی چاہیئے یا یوں کہو کہ بچہ ہر شے کی بابت جو کچھ ہم سے بیان کرے اُس کو کان لگا کر سننا چاہیئے۔ اُس کو اس امر کی ترغیب دینی چاہیئے کہ اُس شے کی بابت جو بات اُس کے خیال میں آسکتی ہے۔ اُس کو بیان کرے۔ کبھی کبھی اُس کی توجہ کو ایسی باتوں کی طرف مائل کرنا چاہیئے۔ جو اب تک اُس کے مشاہدہ میں نہیں آئی ہیں۔ تاکہ جب کبھی وہی باتیں دوبارہ پیش آئیں۔ تو اُس کو بذات خود اُن پر غور کرنے کے لیے ہدایت ہو۔ اور اسی قسم کی مکمل تحقیقات کے لیے اشیا کا نیا سلسلہ رفتہ رفتہ مہیا کرتے یا بتاتے رہنا چاہیئے؟ اب غور کرو کہ سمجھ دار ماں۔ اس طریقہ کی رو سے اپنے سبقوں کا انتظام کس طرح کرتی ہے۔ وہ اپنے چھوٹے لڑکے کو سہل تر اوصاف۔ سختی۔ نرمی۔ رنگ۔ ذائقہ۔ ڈیل ڈول سے بہ تدریج واقفیت پیدا کراتی ہے۔ اور وہ دیکھتی ہے کہ اس کام میں بچہ شوق سے اُس کو مدد دیتا ہے۔ ایک چیز لا کر اُس کو بتاتا ہے کہ یہ چیز لال ہے۔ اور دوسری چیز لا کر کہتا ہے اس کو چھو کر دیکھو یہ سخت ہے۔ جوں ہی کہ وہ اِن خاصیتوں کے لیے اُس کو الفاظ بتا دیتی ہے۔ جب بچہ کوئی نئی چیز اُس کے پاس لاتا ہے۔ اور وہ اُس نئی چیز میں کسی نئی خاصیت پر اُس کو توجہ دلاتی ہے۔ تو وہ اس بات کی احتیاط رکھتی ہے کہ اُس نئی خاصیت کو اُن چیزوں کے تعلق سے بیان کرے جن کو بچہ پہلے سے جانتا ہو تاکہ وہ نقل کرنے کے قدرتی میلان کی وجہ سے۔ یکے بعد دیگرے اُن کو دُہرانے کا عادی ہو جائے۔ جب رفتہ رفتہ ایسی صورتیں پیش آتی ہیں۔ کہ جن خاصیتوں سے بچہ واقف ہو گیا ہے۔ اُن میں سے

ایک یا زیادہ خاصیتوں کا نام لینا بھول جاتا ہے - تو وہ یہ کام کرتی ہے کہ بچہ سے پوچھتی ہے "وہ یہ چیز جو تمہارے پاس ہے اِس میں کوئی اور خاصیت تو نہیں ہے - جس کو تم بتا سکتے ہو" غالباً بچہ اس سوال کو نہیں سمجھیگا - تھوڑی دیر تک اُس کو ششدر و حیران رکھنے کے بعد خود بتا دیتی ہے - اور شاید اُس کی ناکامیابی پر ذرا اُس کی ہنسی بھی اُڑاتی ہے - چند مرتبہ اس طرح اعادہ کرنے سے بچہ کو معلوم ہو جاتا ہے کہ کیا کرنا چاہیئے - جب دوبارہ ماں - بچہ سے کہتی ہے کہ "وہ اس چیز کی بابت جو کچھ تم نے بیان کیا ہے میں اُس سے کسی قدر زیادہ جانتی ہوں" تو بچہ کا غرور جوش میں آتا ہے - وہ غور سے اُس شئے کو دیکھتا ہے اور اُن تمام باتوں پر غور کرتا ہے جو اُس نے سنی ہیں - اور چونکہ یہ سوال آسان ہوتا ہے فوراً اُس کو حل کر لیتا ہے - وہ اپنی کامیابی پر خوشی کے مارے پھولا نہیں سماتا - اور ماں اُس کے ساتھ ہمدردی کرتی ہے - وہ اپنی قوتوں کو معلوم کرکے خوش ہوتا ہے - اور ہر ایک بچہ ایسا ہی کرتا ہے - وہ اور زیادہ فتوحات کی خواہش کرتا ہے - اور بھی زیادہ چیزوں کی جستجو کرتا ہے - تاکہ اُن کا حال بھی ماں سے کہدے - جوں جوں اُسکی قوتیں نشوونما پاتی ہیں وہ اُس کی فہرست میں یکے بعد دیگرے نئی صفتوں کا اضافہ کرتی جاتی ہیں - سختی اور نرمی سے کھردرے پن اور ہمواری تک - رنگ سے چلانک - اجسام مفردہ سے اجسام مرکبہ تک - بہ تدریج آگے بڑھتی ہے یعنی جوں جوں بچہ کافی استعداد حاصل کرتا ہے - سوال کو ہمیشہ مشکل کرتی رہتی ہے اس کی توجہ اور حافظہ پر ہمیشہ زیادہ زور ڈالتی رہتی ہے - اُس کے واسطے ایسے نئے خیالات مہیا کیے جن کو وہ بخوبی سمجھ سکتا ہے - اُس کے ذوق و شوق کو ہمیشہ قایم رکھتی ہے - اور اُن فتوحات سے - جو چھوٹی چھوٹی مشکلوں کو حل کرنے سے حاصل ہوتی ہیں - ہمیشہ اُس کا دل خوش کرتی رہتی ہے - ظاہر ہے کہ وہ اس کام میں محض اُس قدرتی عمل کی پیروی کرتی ہے جو اب سے پہلے بچپن کے زمانہ میں جاری تھا - یا یوں کہو کہ

وہ صرف اس بات میں مدد دیتی ہے کہ لڑکا خود بخود ترقی کرے - اور جس ڈھنگ پر بچہ فطرۃً ماں کے ساتھ برتاؤ کرتا ہے - اُسی ڈھنگ پر اُس کو مدد دیتی ہے - یہ بھی ظاہر ہے کہ جو طریقہ وہ اختیار کرتی ہے - مشاہدہ کی عادت پیدا کرنے کے لیے وہی طریقہ سب سے بہتر ہے - اور ان سبقوں کا مقصد یہی بیان کیا جاتا ہے - اگر بچہ کو ایک چیز بتا دیں اور دوسری چیز دکھا دیں تو یہ بات طریق مشاہدہ کی تعلیم نہیں ہے بلکہ اُس کو ایسا بنا دینا ہے کہ محض دوسرے شخص کے مشاہدوں کو حاصل کرسکے - یہ ایسی کارروائی ہے جس سے بذات خود تعلیم حاصل کرنے کی قوتیں - قوی نہیں ہوتیں - بلکہ ضعیف ہو جاتی ہیں - جس کی وجہ سے بچہ اُن خوشیوں سے محروم رہ جاتا ہے - جو کامیابی کی چستی و چالاکی سے پیدا ہوتی ہیں - جو اِس نہایت دل کش علم کو رسمی تعلیم کی شکل میں پیش کرتی ہے - اور جو اُس بے اعتنائی بلکہ نفرت کو پیدا کرتی ہے - جو اکثر اوقات بچوں کو ان اشیا کے سبقوں سے ہوتی ہے - برعکس اِس کے طریقہ مذکورہ بالا کی پیروی کرنا صرف ایسی بات ہے گویا عقل کو اُس کی مناسب غذا تک لے جانا - عقلی اشتہا کے ساتھ اُس کے قدرتی اوصاف یعنی خود پسندی اور ہمدردی کی خواہش کو بھی شامل کر دینا - اور ان سب کو ملا کر بچہ کو پوری طرح توجہ کرنے کی ترغیب دینا جس سے صاف اور کامل ادراک حاصل ہو جاتا ہے - اور نفس کو شروع ہی سے اس کام کا عادی بنا دینا - جو انجام کار اُس کو ضرور کرنا پڑے - یعنی اپنی مدد آپ کرنا -

اشیا کی تعداد اور مدت دونوں کے اعتبار سے اسباق الاشیا کو وسعت دینی چاہیے

نہ صرف اِس بات کی ضرورت ہے کہ اسباق الاشیاء کی تعلیم مروجہ عام طریقے سے بالکل مختلف طریقہ پر ہونی چاہیے - بلکہ ضرورت اس امر کی بھی ہے کہ آج کل کی بہ نسبت ان سبقوں کو اشیا کے بہت زیادہ وسیع سلسلہ تک وسعت دی جائے - اور بہت زیادہ عرصہ تک اُن کی تعلیم جاری رکھی جائے - اِن سبقوں کو گھر کی چیزوں تک محدود نہیں رکھنا چاہیے - بلکہ کھیتوں - جھاڑیوں - پتھر کی کانوں - اور ساحل بحر

سبقوں کو بھی اُن میں شامل کرنا چاہیئے - ایسا نہ ہو کہ بچپن کی ابتدائی میں اِن سبقوں کو بند کر دیا جائے - بلکہ جوانی کے زمانہ میں بھی اُن کو بدستور جاری رکھنا چاہیئے - تاکہ یہی سبق نامعلوم طور پر نیچرل ہسٹری[۵] (علم حیوانات) اور سائینس کے عالم کی تحقیقات تک پہنچ جائیں - یہاں بھی ہم کو قدرت ہی کی ہدایتوں کی پابندی کرنی پڑتی ہے - نئے پھولوں کو جمع کرنے سے نئے کیڑوں کو غور سے دیکھنے سے یا کنکریوں اور سیپیوں کو اکٹھا کرنے سے بچوں کو جو لطف حاصل ہوتا ہے - اُس سے زیادہ گہرا لطف کہاں دیکھا جا سکتا ہے؟ اور کون ہے جو اس بات کو نہیں سمجھ سکتا کہ اگر بچوں کے ساتھ ہمدردی کی جائے تو ان چیزوں کی ساخت اور صفات کی تحقیقات جہاں تک چاہیں - اُن سے کرا سکتے ہیں؟ ہر ایک عالم نباتات نے جس کو جنگلوں اور باغ کی روشوں میں بچوں کو اپنے ساتھ لے جانے کا اتفاق ہوا ہے - اِس بات کو ضرور دیکھا ہوگا کہ بچے اُس کے کاموں میں کیسی سرگرمی سے شریک ہوتے ہیں - کیسے اشتیاق سے اُس کے واسطے پودوں کو تلاش کر کے لاتے ہیں - جب وہ پودوں کو دیکھتا بھالتا ہے تو کیسے غور سے دیکھتے ہیں - اور سوالوں سے اُس کو کیسا پریشان کر دیتے ہیں " قدرت کے خادم اور ترجمان" یعنی حکیم بیکن کا پکا مقلد اِس بات کو معلوم کریگا - کہ جو طریقہ تربیت اس طرح بتایا گیا ہے اُس کو عجز و انکسار کے ساتھ اختیار کرنا چاہیئے - سادہ چیزیں جن کی ساخت پیچیدہ نہیں ہے - جب بچہ اُن چیزوں کی زیادہ سہل خاصیتوں سے واقف ہو جائے تو اُس سے اُسی ترکیب سے اُن چیزوں کی پوری جانچ پڑتال کرانی چاہیئے - جن کو وہ اپنی روزانہ سیر میں جمع کرتا ہے - یعنی جو چیزیں زیادہ مشکل نہیں ہیں سب

---

[۵] نیچرل ہسٹری کے لفظی معنی قدرتی تاریخ ہیں - ابتدا میں اس کا اطلاق اس علم پر کیا جاتا تھا جس میں جملہ موجودات قدرت کا بیان ہو - مگر اب اس کا اطلاق صرف اُن علموں پر ہوتا ہے جن میں زمین اور اُس کی پیداوار سے بحث ہوتی ہے - مثلاً علم نباتات - علم حیوانات - علم معدنیات - اور بالخصوص علم حیوانات - مترجم -

سے پہلے اُن ہی پر توجہ کی جائے۔ مثلاً پودوں میں ۔پنکھڑیوں کے رنگ ۔تعداد اور صورتیں ۔ اور ڈنڈیوں اور پتّوں کی شکلیں ۔کیڑوں میں ۔ بازوؤں ۔ٹانگوں اور موچھوں کی تعداد اور اُن کے رنگ ۔جب یہ چیزیں پوری طرح سے سمجھ میں آجائیں۔ اور وہ ہمیشہ اُن کا مشاہدہ کرنے لگیں ۔ تو مزید واقعات بہ تدریج پیش کرنے چاہئیں مثلاً پودوں میں سٹیمن[۵۱] اور پیٹل[۵۲] کی تعداد ۔ پھولوں کی شکلیں ۔خواہ وہ پھول سٹ-ول طریقہ میں جڑ کے پاس سے نکلتے ہوں ۔خواہ دونوں طرف اُگتے ہوں ۔پتّوں کی ترتیب اور نوعیت ۔خواہ وہ متقابل واقع ہوں خواہ متبادل ۔خواہ ڈنڈی سے نکلتے ہوں خواہ تنے سے ۔خواہ صاف اور چکنے ہوں ۔خواہ بال دار خواہ آرہ کی شکل کے ہوں خواہ دندانہ دار ۔خواہ سینپ دار مچھلی کی شکل کے ہوں ۔ اور کیڑوں میں جسم کے حصّے ۔پیٹ کے حصّے بازوؤں کے نشانات ۔ٹانگوں کے جوڑوں کی تعداد ۔ اور چھوٹے اعضا کی شکلیں ۔المختصر تمام صورتوں میں جو طریقۂ تعلیم اختیار کیا جائے ۔ وہ ایسا ہونا چاہیئے جس سے بچّہ کو اس بات کا حوصلہ پیدا ہو کہ جو شئے اُس کو دستیاب ہو ۔ اُس کی بابت جو کچھ بیان کرسکتا ہو بیان کرے ۔ پھر جب بچّہ مناسب عمر تک پہنچ جائے ۔ تو اُس کے حق میں بڑی عنایت ہو گی ۔ اگر پودوں کو محفوظ رکھنے کا ذریعہ بہم پہنچا دیا جائے ۔جن سے اُس کو بڑی دلچسپی اس وجہ سے پیدا ہو گئی ہے کہ اُس نے اُن کا علم حاصل کیا ہے ۔اور عام تتیریوں اور پتنگوں کے بچّوں کو ۔ اُن کے متبدّل اشکال کی حالت میں پالنے کے واسطے بھی ضروری ساماں مہیّا کر دیا جائے ۔ تو اور بھی زیادہ عنایت ہو گی ۔ اس بات سے نہایت اعلیٰ درجہ کا لطف حاصل ہوتا ہے ۔جس کی تصدیق ہم بذات خود کر سکتے ہیں ۔ یہ لطف برسوں تک گرم جوشی کے ساتھ جاری رہتا ہے ۔ اور جب حشرات الارض

---

۵۱ سٹیمن ۔ پھول کے اُس حصّے کو کہتے ہیں جس سے ایک قسم کی خاک (جس کو پولن کہتے ہیں) پیدا ہوتی ہے اس خاک کو پھولوں کا مادۂ تولید سمجھنا چاہیئے ۔ مترجم

۵۲ پیٹل ۔ پھول کا وہ حصہ ہے جو پھول کے بیچ میں رہتا ہے ۔ اور جس میں بیج محفوظ رہتا ہے ۔ مترجم

کو بھی جمع کر لیا جائے تو شنبہ کی سہ پہر کی سیر کا لطف بے حد بڑھ جاتا ہے - اور یہ بات علم فزیالوجی کے مطالعہ کی گویا ایک قابل تعریف تمہید ہے -

تعلیم اسباق الاشیاء پر ایک اعتراض اور اوس کا جواب -

ہم بہت سے لوگوں سے یہ اعتراض سننے کے لیے بالکل تیار ہیں کہ "وہ اس تمام تعلیم میں وقت اور محنت کی بربادی ہے - اور اگر بچوں کو کاپیاں لکھنے یا نقدی کے جدول یاد کرنے میں مصروف رکھا جائے - اور اس طرح اُن کو زندگی کے کاروبار کے قابل بنایا جائے - تو بہت بہتر ہوگا" ہم افسوس کرتے ہیں کہ اس امر کی نسبت کہ "تعلیم میں کون سی چیزیں داخل ہیں" ؟ ایسے خام خیالات اور سود مندی کی بابت ایسے تنگ خیال اب تک لوگوں میں پھیلے ہوئے ہیں - اس بات کا ذکر جانے دو کہ باضابطہ طور پر تربیت ادراک کی ضرورت ہے - اور اُس طریقہ تعلیم سے بھی قطع نظر کرو جس کی بابت ہم بہ تاکید لکھ چکے ہیں کہ وہ اُس ضرورت کو پورا کرنے میں ممد و معاون ہے تو ہم اس وجہ سے بھی اس طریقہ تعلیم کی حمایت کے لیے تیار ہیں کہ اُس سے علم حاصل ہوتا ہے (کیوں کہ علم شئے بہ از جہل شئے) - اگر لوگوں کو صرف شہری بننا ہو - اور یہ مقصود ہو کہ صرف اپنے بہی کھاتوں کو بیٹھے بڑھا کریں - اور اپنے لین دین کے سوا دوسرے خیالات سے کچھ سروکار نہ رکھیں - اگر یہ بات مناسب ہو کہ وہ اُس باشندہ لندن کی مانند ہو جائیں جس کا تصور دیہقانی تفریحات کی بابت اِس سے زیادہ نہیں ہے کہ چائے کے باغ میں بیٹھ کر حقہ کے دم لگایا کرے - اور جو کی شراب اڑایا کرے - یا نواب صاحب بن جائیں جن کا یہ خیال ہوتا ہے کہ جنگل ہماری شکارگاہیں ہیں - اور جو پودے ہم نے نہیں لگائے وہ محض خار و خس ہیں - اور جو جانوروں کی تقسیم اس طرح کرتے ہیں - کہ شکار کے جانور[1] حشرات الارض[2] اور پالتو[3] مویشی - تو البتہ کسی ایسی شئے کا سیکھنا غیر ضروری ہو جس سے غول کو پُر کرنے یا گودام کو بھرنے میں براہ راست مدد نہ ملتی ہو - لیکن اگر ہمارے لیے زندگی کا زیادہ عمدہ مقصد موجود ہے - بہ نسبت اس کے کہ ہم مزدور بنے رہیں - اگر ہمارے گرد و پیش کی چیزوں میں - روپیہ پیدا کرنے

کی طاقت کے سوا - اور بھی فائدے موجود ہیں - اگر قوائے حصول دولت اور قوائے بہیمی
سے بڑھکر اعلیٰ درجہ کی قوتین موجود ہیں - جن کی مشق کرنی چاہیئے - اگر اُن خوشیون کی کچھہ قدر و
منزلت ہے جو شاعری - اور ارٹ (فن) اور سائنس اور فلسفہ سے حاصل ہوتی ہین -
تو اِس بات کی ضرورت ہے کہ اُس طبیعی میلان کو تقویت دی جائے - جس کو ہر
ایک بچہ قدرتی خوب صورتیون کا مشاہدہ کرنے اور قدرتی مظاہر کی تحقیقات کرنے کے لیے
ظاہر کرتا ہے - مگر یہ جو محض سودمندی کا خبط سمایا ہوا ہے (کہ لوگ ہر ایک شئے
کی خوبی کو اوس کے ظاہری فائدہ کی کسوٹی پر کستے ہین) جس مین اسی بات پر قناعت کی جاتی
ہے کہ دنیا مین آئیں اور پھر اوس کو چھوڑ جائین - اور اس بات کو معلوم نہ کرین کہ وہ کس قسم کی
دُنیا ہے - یا یہ کہ اُس مین کیا کیا چیزیں ہیں - ہم اس خیال کو اُن ہی دلائل سے باطل کر سکتے ہیں
جو اُس کے حق مین پیش کیے جا سکتے ہیں - رفتہ رفتہ یہ بات لوگوں کو معلوم ہوگی کہ
قوانین زندگی کا علم بہ نسبت کسی دوسرے علم کے - خواہ کوئی سا علم ہو - زیادہ ضروری ہے
یہ بات کہ قوانین زندگی - نہ صرف تمام جسمانی اور عقلی عملوں کی بنیاد ہین - بلکہ کنائنگہ گھر
اور بازار کے تمام کاروبار - تمام تجارت - تمام امور سلطنت اور تمام اخلاقی
مسائل کی بھی بنیاد ہین - اور یہ بات کہ اسی وجہ سے اُن قوانین کو سمجھے بغیر نہ تو کسی شخص
کا چال چلن ٹھیک باقاعدہ ہو سکتا ہے اور نہ کسی قوم کا - آخر کار یہ بات بھی معلوم ہو جائے گی
کہ دُنیا کی اس تمام پیچیدہ کل میں زندگی کے قوانین درحقیقت یکسان ہیں - اور مزید بران یہ بات بھی
کہ اُن قوانین کی پیچیدہ شکلوں کو اس وقت تک ٹھیک ٹھیک نہین سمجھ سکتے -
جب تک کہ مفرد شکلوں میں اُن کا مطالعہ نہ کیا جائے - اور جب یہ بات معلوم
ہو جائے گی اُس وقت یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ جس بیرونی معلومات کے حاصل
کرنے کے لیے بچہ بہت کچھہ شوق ظاہر کرتا ہے اگر ہم اُس معلومات کے حاصل
کرنے میں اُس کو مدد دیں اور اس بات کی ترغیب دیں کہ جوانی میں بھی اُس معلومات کو برابر

حاصل کرتا رہے تو یہ سمجھنا چاہئے کہ ہم اُس کو خام مصالح جمع کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں جس کو وہ آیندہ زمانہ میں مرتب و منضبط کر سکتا ہے - یا یوں کہو کہ ایسے واقعات جمع کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں جن کی بدولت وہ سائنس کے اُن بڑے بڑے عام اصول کو ایک نہ ایک دن پوری طرح سمجھ لے گا جن سے افعال میں باضابطہ ہدایت حاصل ہوتی ہے -

مصوّری کی تعلیم عقلی تربیت کے لیے ضروری ہے -

عقلی تربیت جس کا رواج آج کل ہونے لگا ہے - اُس کی بابت لوگوں کے خیالات زیادہ معقول ہوتے جاتے ہیں - اور اس بات کی بہت سی علامتوں میں سے ایک علامت یہ ہے کہ مصوّری کو عام طور پر تعلیم کا جزو تسلیم کرنے لگے ہیں - ہم یہ بات مکرر بیان کرتے ہیں کہ معلّم آخر کار اُس رستہ کو اختیار کرتے جاتے ہیں جس پر قدرت اُن کو متوجہ توجہ دلاتی رہتی ہے - سب جانتے ہیں کہ گرد و پیش کے آدمیوں - مکانوں - درختوں اور حیوانوں کی تصویریں بنانے کے لئے بچّے خود بخود کوشش کیا کرتے ہیں - اگر کوئی چیز بہتر نہیں مل سکتی تو سلیٹ پر یا کاغذ پنسل مانگا مل جائے - تو کاغذ پنسل ہی سے تصویریں بنا لیتے ہیں - اُن کی نہایت اعلیٰ درجہ کی خوشیوں میں ایک خوشی یہ ہے کہ اُن کو تصویروں کی کتاب دکھائی جائے - اور نقل اُتارنے کا قوی میلان جو بچّوں میں پایا جاتا ہے - اُس سے فی الفور اُن کے دل میں یہ شوق بالعموم پیدا ہو جاتا ہے کہ خود بھی تصویریں بنائیں - یہ کوشش - کہ جو عجیب چیز دیکھیں اُس کی تصویر اوتار لیں قوائے مدرکہ کی ایک اور قدرتی مشق ہے - یعنی یہ ایسا وسیلہ ہے جس سے اس بات کی ترغیب ہوتی ہے کہ اور بھی زیادہ صحیح اور مکمّل طور پر مشاہدہ کیا جائے - اور چوں کہ بچّے اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ چیزوں کی قابل حس خاصیتوں کے متعلق اپنی تحقیقات کی طرف ہم کو متوجہ کریں - اور خود بھی تصویریں بنانے کی کوشش کرتے ہیں - اس لیے گویا وہ ہم سے درخواست کرتے ہیں کہ اُن کو ٹھیک اسی قسم کی تربیت

کرنی چاہیئے جس کی اُن کو سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

بچّوں کو مصوّری کی تعلیم کس طرح دینی چاہیئے۔

اگر معلّم۔ نہ صرف مصوّری کو تعلیم کا جزو بناتے ہیں۔ بلکہ مصوّری سکھانے کے طریقوں کو منتخب کرنے میں بھی۔ قدرت کے اشاروں سے ہدایت حاصل کرتے۔ تو جس قدر فائدہ اُنہوں نے پہنچایا ہے۔ اُس سے زیادہ فائدہ پہنچاتے۔ وہ کیا ہے جس کی تصویر اتارنے کے لیے بچہ سب سے پہلے کوشش کرتا ہے؟ یہ وہ چیزیں ہیں جو بڑی ہیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو رنگ میں دل کش ہیں یہ وہ چیزیں ہیں جن سے اس کی خوشی سب سے زیادہ وابستہ ہوتی ہے۔ یعنی انسان جن سے اس نے بہت سے جذبات حاصل کیے ہیں۔ گائیں۔ اور کتے۔ جن سے اُن بہت سی باتوں کی وجہ سے۔ اُس کو دلچسپی ہے۔ جو اُن میں پائی جاتی ہیں۔ مکانات جو ہر ساعت دیکھنے میں آتے ہیں اور اپنے تفاوت خصص کی وجہ سے دل پر اثر کرتے ہیں۔ اور بھلا مصوّری کا کون سا عمل ہے۔ جس سے بہت ہی زیادہ لطف بچہ کو حاصل ہوتا ہے؟ رنگ بھرنے سے۔ اگر کاغذ اور پنسل سے زیادہ اچھی چیز موجود نہ ہو تو یہی چیزیں اچھی ہیں۔ مگر رنگوں کا بکس اور موقلم۔ یہ تو خزانے ہیں۔ خاکہ کھینچنا رنگ بھرنے سے ٹھیک دوسرے درجہ پر ہے یعنی خاکہ زیادہ تر رنگ بھرنے کی غرض سے کھینچا جاتا ہے۔ اور اگر اُن کو تصویروں کے خاکوں کی مطبوعہ کتاب میں رنگ بھرنے کی اجازت ہو جائے تو کیسی بڑی عنایت ہے! اب سنیئے کہ مصوّری کے معلّموں کو اگرچہ یہ بات قابل مضحکہ معلوم ہوگی۔ جو رنگ بھرنے کی تعلیم کو پیچھے ڈال دیتے ہیں۔ اور شکل بنانے کی تعلیم سے پہلے لکیروں کی مشق کراتے ہیں۔ جو ایک بے لطف تعلیم ہے۔ مگر ہم کو یقین ہے کہ جو طریقہ تربیت ہم نے اس طرح بتایا ہے وہی صحیح ہے۔ اِس امر کو شروع ہی سے سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ رنگ۔ شکل سے مقدم ہے۔ اور جیسا کہ پہلے اشارۃً بیان کیا گیا ہے۔ اسکی بنیاد

سائیکالوجی پر ہے - اور شروع ہی سے یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیئے کہ جن چیزوں کی نقل کیجائے وہ اصلی ہونی چاہیئے - رنگوں سے زیادہ لطف اُٹھانے کا شوق نہ صرف بچوں میں نمایاں طور پر پایا جاتا ہے - بلکہ اکثر اشخاص میں یہ شوق عمر بھر قایم رہتا ہے اور تصویر کی شکل کو پوری طرح سمجھنے کے لیے جو نسبتہً مشکل کام ہے اور دلچسپ بھی نہیں ہے - اس شوق کو بطور قدرتی محرک کے ہمیشہ کام میں لانا چاہیئے - اور اس کے بعد تصویر میں رنگ بھرنے سے جو خوشی حاصل ہوتی ہے - اُس کو خاکہ کشی کی محنت کا آیندہ انعام سمجھنا چاہیئے - اور ہم کو چاہیئے کہ بچوّں کو اس بات کی ڈھارس بندھائیں کہ وہ دلکش ہو بہو تصویریں بنانے کی کوشش کریں -
اور اس بات کا یقین رکھنا چاہیئے کہ جس طرح وسیع تجربہ کی بدولت - سیدھی سادی اور معمولی چیزیں دلچسپ بن جاتی ہیں - اسی طرح اُن کے لیے بھی کوشش کی جائیگی - اور اسی لیے رفتہ رفتہ ایسی تصویریں بنانے لگیں گے جو اصلی چیزوں سے کسی قدر مشابہت رکھتی ہوں - یہ جو شروع شروع میں بچوّں کے ہاتھ کی بنی ہوئی تصویریں نہایت بے کینڈے ہوتی ہیں - یہ بات قانونِ ارتقا کے موافق ہے - اور اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ تصویروں کو نظر انداز کر دیا جائے - کچھ مضایقہ نہیں - کیسی ہی بے ہنگم شکلیں کیوں نہ بنیں - کچھ مضائقہ نہیں - کیسے ہی بھدّے اور بدنما رنگ کیوں نہ ہوں - سوال یہ نہیں ہے کہ بچہ عمدہ تصویریں بنا رہا ہے یا نہیں - سوال یہ ہے کہ وہ اپنے قوائے عقلیہ کو ترقی دے رہا ہے یا نہیں - اول تو اِس بات کی ضرورت ہے کہ اُس کو اپنی انگلیوں پر ذرا قابو حاصل ہو جائے - کچھ ادھورے اور ناممکن خیالات مشابہت کی بابت حاصل ہو جائیں اور اِن مقاصد کے لیے - یہ مشق بہ نسبت کسی دوسری مشق کے بہتر ہے - کیونکہ یہ قدرتی اور دلچسپ مشق ہے - بچپن ہی میں باقاعدہ مصوّری کے سبق ممکن نہیں ہیں -

پس یہ جو بچے اپنی تربیت آپ کرنے کی کوششیں کرتے ہیں کیا ہم ان کی کوششوں کو روک دیں اور اُن کو مدد دینے سے غفلت کریں ؟ یا اس اعتبار سے کہ وہ ادراک اور قوائے دست کاری کی باضابطہ مشق پر ہیں۔ اُن کو تقویت دیں۔ اور سیدھی راہ پر ڈال دیں ؟ اگر سستے مصوّری کے نقشے رنگ بھرنے کے لیے۔ اور سادے خاکے۔ حدود کی لکیروں پر رنگ پھیرنے کے لیے بہم پہنچا دیئے جائیں۔ جس سے نہ صرف رنگ کا شعور پیدا ہو سکتا ہے۔ جو بچوّں کی خوشی کا باعث ہے۔ بلکہ چیزوں اور ملکوں کی حدود سے بھی ضمناً کسی قدر واقفیت حاصل ہو سکتی ہے۔ اور ہاتھ قلم کو استقلال سے حرکت دینے کی کسی قدر قابلیت بھی پیدا ہو سکتی ہے اور اگر ہم دل فریب چیزیں بہم پہنچا کر تصویریں بنانے کے اس قدرتی میلان کو قایم رکھ سکیں۔ خواہ وہ تصویریں کیسی ہی بھدّی ہوں تو ایسا ضرور ہو گا کہ جب مصوری کی تعلیم کا زمانہ آئے گا اُس وقت بچوں کو ایسی سہولت پیدا ہو جائے گی جو اور کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس سے وقت کی کفایت ہو گی اور معلّم و متعلّم دونوں کی محنت بچ جائے گی

مصوری کا مروجہ طریقہ تعلیم اور اُس کی خرابیاں

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ اُس سے یہ نتیجہ فی الفور نکل سکتا ہے کہ ہم کاپیوں سے تصویروں کی نقل اُتارنے کے عمل کو قابل الزام ٹھیراتے ہیں۔ اور خطوط مستقیم خطوط منحنی۔ اور خطوط مرکب بنانے کی اُس معمولی تعلیم کو اور بھی زیادہ قابل الزام ٹھیراتے ہیں جس سے ابتدا کرنا بعض معلّموں کا دستور ہے۔ ہم کو افسوس ہے کہ سوسائٹی آف آرٹس (انجمن فنون) نے فن مصوّری کی ابتدائی تعلیم" کے متعلق اپنے سلسلۂ کتب درسیہ میں مصوری کی ایک ابتدائی کتاب کی تعریف کی ہے۔ جو اصول کے لحاظ سے اُن کتابوں میں سب سے بدتر ہے جو ہماری نظر سے گذری ہیں۔ ہمارا اشارہ اس کتاب کی طرف ہے جس کا عنوان ہے "اوٹ لائن فرام آؤٹ لائن آر فرام دی فلیٹ" (خاکہ خاکے سے یا سطح مستوی سے)

اور جس کو جان بل بت تراش نے تصنیف کیا ہے - تمہید میں اس کتاب کی اشاعت کی غرض یہ بیان کی گئی ہے کہ طالب علم کے سامنے ایک آسان - مگر منطقیانہ - طریقہ تعلیم پیش کیا جائے - اور اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیے آغاز کتاب میں بہت سی حدود درج کی گئی ہیں - مثلاً -

"ساوی لکیر مصوری میں اُس پتلے نشان کو کہتے ہیں جو ایک نقطہ سے دوسرے نقطہ تک کھینچا جائے -

"لکیریں مصوری میں اپنی خصوصیت کے اعتبار سے دو قسم کی ہوسکتی ہیں -

اول - سیدھی لکیریں - یعنی وہ نشان جو دو نقطوں کے بیچ میں چھوٹے چھوٹے فاصلہ تک گزرتے ہیں - جیسے ا ب (ا ـــ ب)

۲ - یا ٹیڑھی لکیریں - یعنی وہ نشان جو دو نقطوں کے بیچ میں چھوٹے چھوٹے فاصلہ تک نہیں گزرتے - جیسے ج د (ج ⌒ د)"

اور یہ تمہید اسی طرح متوازی الافق لکیروں - عمودی لکیروں - ترچھی لکیروں - کئی قسم کے زاویوں - اور اُن مختلف شکلوں تک پہنچتی ہے - جو لکیروں اور زاویوں سے بنتی ہیں - المختصر مصوری کی کتاب کیا ہے - "شکلوں کی گریمر" ہے مع مشقوں کے تعلیم کو اس خشک طریقہ سے شروع کرنا - یعنی اجزائے اولیہ کی اس طرح تحلیل کرنا - گویا مصوری کی تعلیم میں اسی طریقہ کا بحال کرنا ہے - جس کو ہم زبان کی تعلیم میں رد کر چکے ہیں - یہ تو وہی بات ہوئی کہ مبہم خیالات کو چھوڑ کر قطعی خیالات سے بچوں کی تعلیم شروع کی جائے مادیات سے پہلے عقلی و ذہنی باتوں کو رکھ دیا جائے عملی تجارب سے پہلے ہی علمی تصورات بتا دئے جائیں - ہم کو اس بات کے دُہرانے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ طریقہ - باضابطہ طریق تعلیم کا عکس ہے - یہ جو رواج پڑ گیا ہے کہ کسی زبان کی بول چال سکھانے سے پہلے کلمات اور اُن کے اعمال

کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کی بابت کیا خوب کہا ہے کہ یہ دستور قریب قریب
ایسا ہی معقول ہے۔ جیسا کسی شخص کو چلنے پھرنے سے پہلے۔ ٹانگوں کی ہڈیوں۔ پٹھوں
اور رگوں کی بابت بہت سے سبق پڑھا دیے جائیں۔ اور یہی بات بہت کچھ اس تجویز کی
بابت بھی کہی جا سکتی ہے کہ چیزوں کی تصویر بنانے سے پہلے اُن لکیروں کے نام
اور تعریفیں یاد کرائی جائیں۔ جو عند التحلیل اُن چیزوں سے حاصل ہوتی ہیں۔ یہ مصطلحات
ناگوار بھی ہوتی ہیں اور غیر ضروری بھی۔ مصطلحات کی تعلیم شروع ہی میں مطالعہ کو
بے لطف بنا دیتی ہے۔ اور غرض اس تمام تعلیم سے یہ ہوتی ہے کہ بچوں کو اُس شے
کی تعلیم دی جائے۔ جس کو وہ دوران مشق میں خود بخود نامعلوم طور پر سیکھ سکتے ہیں
جس طرح بچہ معمولی الفاظ کے معنوں کو لغات کی مدد سے نہیں بلکہ اپنے گرد و پیش
کی گفت و گو سے ضمناً حاصل کرتا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح چیزوں۔ تصویروں اور
اپنے بنائے ہوئے نقش و نگار کی بابت بات چیت سننے سے اُن ہی علمی اصطلاحوں
کو۔ نہ صرف بغیر کسی کوشش کے۔ بلکہ خوشی خوشی تھوڑی سی مدت میں حاصل
کر لیتا ہے۔ اور اگر پہلے پہل اُن اصطلاحوں کی تعلیم دی جائے تو وہ ایک عقدۂ لاینحل
اور ملال کا باعث ہوتی ہیں۔

مصوری کے ابتدائی سبق سکھانے کا طریقہ اور اس طریقہ کے فوائد

اگر تعلیم کے اُن عام اصول پر جو تجویز کیے گیے ہیں کچھ اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ تو
مصوری سیکھنے کے عمل کو بچپن کی اُن ابتدائی کوششوں کے ساتھ مسلسل جاری
رکھنا چاہیے۔ جن کی نسبت ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ کہ وہ اس قابل ہیں کہ بچوں کو اُن کا
شوق دلایا جائے۔ یہ جو تصویریں بنانے کی مشق بچے اپنے شوق سے شروع کر دیتے
ہیں۔ جب اس مشق پر ذرا ہاتھ جم جائے اور تناسب کا خاصہ تصور پیدا ہو جائے۔ اُس
وقت اُن کو جسامت کا موہوم سا تصور پیدا ہو جائے گا۔ کہ جسم کے ابعاد ثلٰثہ
کو تصویروں میں کیونکر ظاہر کیا جاتا ہے اور کاغذ پر تصویر بنانے کی چند لاحاصل کوششوں کے

بعد۔ جیسی کہ چینیوں کی تصویریں ہوتی ہیں۔ جب بچوں کو خاصی صفائی سے اِس بات کا ادراک حاصل ہو جائے کہ کیا کام کرنا چاہیئے۔ اور اُس کو کرنے کی خواہش پیدا ہو جائے اُس وقت اُن آلات کے ذریعہ سے جو من حیث العلم مصوری کی تشریح کے لیے وقتاً فوقتاً استعمال کیے جاتے ہیں۔ عملی مصوری کے ابتدائی سبق کی تعلیم دی جا سکتی ہے۔ یہ بات کانوں کو خوفناک معلوم ہوگی۔ مگر یہ تجربہ معمولی عقل کے کسی لڑکے یا لڑکی کے لیے قابل فہم ہے اور دلچسپ بھی ہے۔ ایک شیشے کے چپٹے ٹکڑے کو چوکھٹے میں اس طرح لگائیں کہ وہ میز پر عمود وار واقع ہو۔ اور اُس کو شاگرد کے سامنے رکھ دیں۔ اوس کے دوسرے رُخ پر ایک کتاب یا اسی قسم کی کوئی دوسری سیدھی سادی چیز رکھ کر شاگرد سے کہا جائے کہ نگاہ کو ایک جگہ جما کر شیشہ پر روشنائی کے نقطے اِس طرح بنائے کہ وہ اس شئے کے کونوں پر منطبق ہو جائیں یا اُن کو پوشیدہ کرلیں۔ اب اُس سے کہا جائے کہ لکیروں کے ذریعہ سے اُن نقطوں کو ملا دے۔ اِس عمل سے اُس کو معلوم ہو جائیگا کہ جو لکیریں اُس نے کھینچی ہیں۔ اُس شئے کی حدود اُن لکیروں سے پوشیدہ یا اُن پر منطبق ہوگئی ہیں۔ اور پھر شیشہ کی دوسری طرف ایک کاغذ کا تختہ رکھنے سے یہ بات اُس پر صاف ظاہر ہو جائے گی کہ جو لکیریں اُس نے اِس طرح کھینچی ہیں۔ وہ شئے مذکور کی اُس حالت کی تصویر ہیں جس حالت میں کہ وہ اُس کو نظر آئی تھی۔ صرف اتنی بات نہیں کہ وہ لکیریں اُس شئے سے مشابہ معلوم ہوتی ہیں۔ بلکہ وہ یہ سمجھ لے گا کہ وہ لکیریں بالضرور اُس سے مشابہ ہونی چاہئیں کیوں کہ اُس نے اِن لکیروں کو اُسی شئے کے نقشہ کے مطابق بنایا تھا۔ اور کاغذ کو ہٹا کر وہ اپنا اطمینان کر سکتا ہے کہ یہ لکیریں اُسی نقشہ کے مطابق ہیں۔ یہ بات نئی اور عجیب ہے اور بچے کے لیے اس امر کا عملی ثبوت ہے کہ خاص خاص طولوں کی لکیروں کو ایک سطح مستوی پر۔ خاص خاص سمتوں میں رکھ کر ایسی لکیریں بنا سکتے ہیں جن کے طول اور جن کی سمتیں۔ یہ لحاظ

فاصلہ کے مختلف ہوں - اگر اُس شے کی جگہہ بہ تدریج بدلتے رہیں - تو شاگرد کو اس امر کا مشاہدہ کرایا جاسکتا ہے کہ بعض لکیریں کس طرح گھٹتی اور غائب ہوجاتی ہیں - اور بعض لکیریں نظر آنے لگتی اور بڑہتی جاتی ہیں - خطوط متوازی کا میلان - بلکہ فی الحقیقت مصوری کی تمام بڑی بڑی باتیں - وقتاً فوقتاً اسی طرح اس کو سمجھائی جاسکتی ہیں - اگر اُس کو باقاعدہ طور پر اپنی مدد آپ کرنے کی عادت ڈلوائی گئی ہے تو جس وقت کہا جائے وہ بخوشی کسی خاکہ کو صرف نگاہ سے کاغذ پر کھینچنے کی کوشش کرے گا - اور ممکن ہے کہ تھوڑے عرصہ میں - بغیر کسی مدد کے - ایسی تصویر بنانے کا شوق پیدا ہوجائے جو تا بہ مقدور اُس تصویر کے مطابق ہو جس کا خاکہ شروع میں شیشہ پر اُتارا گیا تھا - غرض کہ دوسرے کی بنائی ہوئی تصویروں کی نقل بے سمجھے بوجھے نہیں اُتاری جاتی - اور کل کی طرح اس عمل کو جاری نہیں رکھا جاتا - بلکہ ایک سادہ اور دل کش طریقہ سے یعنی ایسے طریقہ سے جو معقول ہے - مگر مشکل نہیں - شاگرد کو اشیار کے خاکہ سے واقفیت اور اُن کے بنانے کی قابلیت بہ تدریج حاصل ہوسکتی ہے - اِن فوائد کے علاوہ یہ فائدے بھی ہیں کہ اوّل تو شاگرد کو تقریباً نامعلوم طور پر بچپن ہی میں تصویر کا صحیح خیال پیدا ہوجاتا ہے (یعنی یہ بات کہ تصویر اشیار کا ایک خاکہ ہے - جیسی کہ وہ نظر آتی ہیں - جب کہ وہ خاکہ ایک ایسے سطح مستوی پر کھینچا جائے جو اُن اشیار اور آنکھ کے مابین واقع ہے - اور دوسرے یہ کہ جب اُس کی عمر اس قابل ہوجائے گی کہ اُس کو علمی مصوری کی تعلیم شروع کرائی جاسکے - تو اُسکو پہلے ہی اُن واقعات سے پوری واقفیت ہوگی - جن پر منطقی حیثیت سے علمی مصوری کی بنیاد ہے -

علم ہندسہ کے ابتدائی تصورات بچوں کے ذہن نشین - مسٹر وائز کا طریقہ تعلیم

اِس امر کے ظاہر کرنے کی غرض سے کہ ”علم ہندسہ میں ابتدائی تصورات کی تعلیم کا معقول طریقہ کیا ہے“ یہ اِس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں ہے کہ مسٹر وائز کے مضمون کا حسب ذیل اقتباس درج کیا جائے -

دو حساب کے لیے مکعب چیزوں سے کام لینے کی عادت تو بچہ کو پہلے ہی سے ڈلوائی گئی ہے۔ اب علم ہندسہ کے ابتدائی اصول کے لیے بھی اُن ہی چیزوں کا استعمال کراؤ۔ میں اس تعلیم کو مجسمات سے شروع کرنا پسند کرتا ہوں۔ جو معمولی طریقہ کے برعکس ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہے کہ نقاط۔ خطوط اور سطوح جو محض ذہنی چیزیں ہیں۔ اُنکی بیہودہ تعریفیں اور خرابیاں تشریحیں کرنے میں جو وقت پیش آتی ہے۔ اُس سے نجات ہو جاتی ہے ٭ ٭ ٭ مکعب شکل میں علم ہندسہ کے بہت سے بڑے بڑے اصول اولیہ موجود ہیں۔ نقاط۔ خطوط مستقیم۔ خطوط متوازی۔ زوایا۔ اشکال متوازی الاضلاع وغیرہ وغیرہ یہ سب چیزیں ایک ساتھ مکعب میں صاف صاف نظر آتی ہیں۔ اِن مکعبوں کو مختلف حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ گنتی سکھانے میں طالبعلم کو پہلے ہی اِن حصوں سے واقفیت پیدا کر دی گئی ہے۔ اور اب وہ اِس امر کی طرف رجوع کرتا ہے کہ اُن کے مختلف حصوں کا مقابلہ کرے۔ اور اِن حصوں کے باہمی تعلق کو سمجھے ٭ ٭ ٭ ٭ یہاں سے آگے بڑھ کر کرّوں کی طرف آتا ہے جن سے دائرہ کا اور بالعموم اشکال قوسیہ وغیرہ وغیرہ کا ابتدائی تصور حاصل ہوتا ہے مجسمات سے خاصی واقفیت حاصل کرکے اب اُن کی جگہ مسطحات کو لے سکتا ہے۔ یہ تبدیلی بہت آسانی سے ہوسکتی ہے۔ مثلاً مکعب کے پتلے پتلے ٹکڑے کاٹ کر کاغذ پر رکھ دیئے جائیں۔ تو اب اُس کو اتنی قایم الزاویہ شکلیں نظر آئیں گی۔ جتنے ٹکڑے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس باقی سب ٹکڑوں کی یہی کیفیت ہوگی۔ کرّوں کے ساتھ بھی اسی طرح عمل کرسکتے ہیں۔ پس اُس کو معلوم ہو جائے گا کہ سطحیں دراصل کیونکر پیدا ہوسکتی ہیں۔ اور وہ ہر ایک مجسم شکل میں آسانی سے اُن سطحوں کا تصور اپنے ذہن میں کرسکے گا۔

”پس اُس علم ہندسہ کی ابجد اور اُس کا پڑھنا تو آگیا۔ اب وہ اس کے لکھنے کی طرف توجہ کرتا ہے۔

"سب سے آسان - اور اسی لیے سب سے پہلا عمل یہی ہے کہ ان مستوی سطحوں
کو ایک کاغذ کے ٹکڑے پر رکھ کر ان کے گرد پنسل سے خط کھینچ دیا جائے - کئی مرتبہ ایسا
عمل کرنے کے بعد اس سطح ٹکڑے کو ذرا فاصلہ پر رکھ کر بچے سے کہنا چاہیئے کہ اس کی نقل
کرے - اور اسی طرح اس عمل کو جاری رکھے"۔

طریقہ مذکورہ بالا کی تشریح اور اس کے فو[ائد]

یہ طریقہ جو مسٹر وائز نے تجویز کیا ہے - جب اس قسم کے طریقے سے تصورات ہندسی
کا ذخیرہ حاصل ہو جائے - تو اس سے آگے اس طرح چلنا چاہیئے کہ طالب علم کو اس
بات کی مشق کرائی جائے کہ جو شکلیں اس نے کھینچی ہیں - اپنی نگاہ سے ان کی صحت کا
امتحان کرے - پس اس ترکیب سے اس کو صحیح شکلیں بنانے کا حوصلہ پیدا ہوگا - اور
اس حوصلہ کے پورا کرنے کی وقت ہی ہمیشہ پیش نظر رہیگی - اس بات میں شبہ نہیں ہو سکتا کہ
جیومیٹری[1] (علم ہندسہ) کی بنیاد (جیسا کہ درحقیقت اس لفظ سے ظاہر ہے) وہ قواعد
ہیں - جن کو دستکاروں اور دوسرے لوگوں نے مکانوں کی بنیادوں احاطوں
کے رقبوں - اور اسی قسم کے کاموں کی صحیح پیمائش کرنے کے لیے دریافت کیا تھا -
اور اس علم کے حقائق کا ذخیرہ - صرف اس غرض سے جمع کیا گیا تھا کہ ان سے براہ راست
مفاد حاصل ہوتا ہے - پس ضرور ہے کہ ان حقائق کو اسی قسم کے تعلقات سے طالب علم
کے سامنے پیش کیا جائے - اگر طالب علم کو کاغذ کے مکانات بنانے کے لیے
کاغذوں کے ٹکڑے کاٹنے ہیں - رنگ بھرنے کے لیے خوب صورت شکلیں کھینچنے
ہیں - اور ان مختلف قسم کے مفید مشاغل ہیں - جو ایجاد پسند معلم اس کے واسطے تجویز
کرے - کچھ عرصہ تک مصروف رکھا جائے - تو یہ بات مفید ہے - جیسا کہ ابتدائی معمار
کو کچھ عرصہ تک آزمائشی عملوں میں مصروف رکھتے ہیں - پس تجربہ کی بدولت

[1] لفظ جیومیٹری (Geometry) دو لفظوں (جی) اور (میٹریو) سے مرکب ہے - جی کے معنی ہیں
زمین اور میٹریو کے معنی پیمائش کرنا - پس جیومیٹری کے لفظی معنی ہوئے "زمین کی پیمائش کا علم" - مترجم

طالب علم اُس شکل کو محسوس کرے گا - جو اُس کو اپنے مقاصد کے حاصل کرنے میں
پیش آتی ہے - جب کہ اُس کے حواس کو کسی قسم کی مدد نہ ملے - جب اِس اثنا میں ادراک
کی تربیت عمدہ طور پر ہوجائے - اور بچہ اُس عمر کو پہنچ جائے کہ پرکار کا استعمال کر سکے - تو
وہ پرکار کی واجبی قدر کرے گا کیونکہ پرکار سے اُس کے نظری اندازہ کی تصدیق ہوتی ہے
پھر بھی تخمینی عمل کے نقص حصول مدعا میں سدراہ ہوں گے - بچہ کو کچھ اور زیادہ عرصہ تک
اسی منزل پر چھوڑ دینا چاہیئے - اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ وہ ابھی اس قدر کم سن ہے کہ کسی
بڑے کام پر اُس کو لگا نہیں سکتے - اور کچھ یہ کہ اس بات کی ضرورت ہے کہ کاموں کو باضابطہ
ہنرمندی سے پورا کرنے کی ضرورت اُس کے دل پر اور بھی زیادہ نقش ہوجائے - اگر
ہم کو یہ منظور ہے کہ تحصیل علم مسلسل دلچسپی کا باعث ہو اور اگر - نوع انسان کے ابتدائی
تمدن کی طرح بچہ کے ابتدائی تمدن میں بھی سائنس کی قدر محض اس وجہ سے کی
جاتی ہے کہ اُس سے آرٹ (فن) میں مدد ملتی ہے - تو صاف ظاہر ہے کہ علم ہندسہ کی
مناسب تمہید یہی ہے کہ طالب علم کو مدت تک اپنے ہاتھ سے شکلیں بنانے
کی مشق کرانی چاہیئے - جس سے علم ہندسہ میں سہولیت پیدا ہوجائے گی - دیکھو یہاں
بھی قدرت رستہ بتاتی ہے - بچے اس بات کی طرف قوی میلان ظاہر کرتے ہیں کہ کاغذ
کو کتر کر کچھ چیزیں بنائیں - اپنے ہاتھ سے کوئی چیز بنائیں یا تعمیر کریں - یہ ایسا میلان
ہے کہ اگر اُس کو تقویت دی جائے اور راہ راست پر ڈال دیا جائے تو اُس سے نہ
صرف علمی تصورات کا رستہ صاف ہوجائے گا - بلکہ دست کاری کی اُن قوتوں کو بھی
ترقی ہوگی - جو اکثر آدمیوں میں بہت کم پائی جاتی ہیں -

ہندسہ عملی کی تعلیم کس وقت اور کس طریقہ سے دینی چاہیئے؟

جب قواے مشاہدہ اور قواے موجدہ میں مطلوبہ قوت پیدا ہوجائے - اُس وقت
طالب علم کو ہندسہ عملی کی تعلیم شروع کرائی جاسکتی ہے - ہندسۂ عملی وہ ہے جس میں
مسائل کو عملی قواعد کے ذریعہ سے حل کرنے سے بحث ہوتی ہے - اور اُن کے عملی ثبوت

سے کچھ بحث نہیں ہوتی - جس طرح طریقہ تعلیم میں اور سب تبدیلیاں ہوتی ہیں یہ عمل بھی قصداً نہیں بلکہ بلا قصد ہونا چاہیئے - اور (بچوں کے) ہاتھ سے شکلیں بنوانے کے تعلق کو اب بھی قایم رکھنا چاہیئے - ایک مفروضہ مثلث[1] متساوی السطوح کے برابر - کاغذ کے پٹھے کو کاٹ کر دوسرا مثلث بنانا ایسا عمل ہے جس سے طالب علم کو دلچسپی پیدا ہوگی - اور ہندسۂ عملی کی تعلیم کے لیے یہ ایک آسان تمہید کا کام دیگا طالب علم کو معلوم ہو جائے گا کہ اِس شکل کے بنانے کے لیے ضرور ہے کہ چار مثلث متساوی الاضلاع کھینچے جائیں اور خاص خاص موقعوں پر اُن کو ترتیب دے کر رکھا جائے - چوں کہ اُس کو صحیح طریقہ معلوم نہیں ہے - اور وہ اُس شکل کو ٹھیک ٹھیک نہیں بنا سکتا - اِس لیے اُن مثلثوں کو اُن کی خاص جگہ پر رکھتے وقت اُس کو یہ بات معلوم ہوگی کہ اُن کے ضلع ٹھیک نہیں بیٹھتے - اور اُن کے زاویے راس پر نہیں ملتے - اب دو دائرے کھینچ کر اِن میں سے ہر ایک مثلث کو پوری صحت کے ساتھ بنانے کا طریقہ اُس کو بتا سکتے ہیں - جس میں قیاس لگانے کی ضرورت نہیں ہے .
اور اپنی ناکامی کے بعد بچہ کو اس معلومات کی قدر ہوگی - اِس ابتدائی سوال کے حل کرنے میں اس طرح مدد دینے کے بعد آیندہ کے لیے اس کو چھوڑ دیا جاتا ہے کہ یہ سوال اُس سے کیے جائیں - جس طرح ہو سکے - خود اُن کو حل کرے - تاکہ اُس کو قواعد ہندسیہ کی ماہیت واضح طور پر معلوم ہو جائے - خط کی تنصیف کرنا - عمود قایم کرنا - مربع بنانا - زاویہ کی تنصیف کرنا - ایک خط مفروض کا متوازی دوسرا خط کھینچنا - مسدس بنانا - یہ ایسے سوالات ہیں جن کو وہ تھوڑے صبر سے حل کر سکے گا - اِن ہی باتوں سے اُس کو آہستہ آہستہ مشکل سوالوں تک لے جا سکتے ہیں - اور اگر عقل مندی سے

[1] مثلث متساوی السطوح اُس شکل مجسم کو کہتے ہیں جو چار متساوی الاضلاع مثلثوں سے محدود ہو مترجم -

سے اس کا انتظام کیا جائے۔ تو وہ بغیر مدد کے ان سب سوالوں کو کسی قدر تردد کے
بعد آپ حل کرے گا۔ جن لوگوں نے پرانے دستور العمل کے موافق تربیت پائی ہے
بے شک اُن میں سے بہت سے آدمی اس بیان کو شبہ کی نظر سے دیکھیں گے۔
مگر ہمارا بیان واقعات پر مبنی ہے اور وہ واقعات نہ تو قلیل ہیں۔ اور نہ خاص ہیں۔
ہم نے لڑکوں کی ایک جماعت کو ایسے سوالات کے حل کرنے میں ایسا محو ہوتے
دیکھا ہے کہ وہ علم ہندسہ کے سبق کو ہفتہ بھر کا ایک اہم واقعہ سمجھتے ہیں۔ پچھلے مہینے
ہم نے ایک مدرسہ نسواں کا ذکر سنا تھا جہاں بعض نوجوان لڑکیاں مدرسے کے گھنٹوں کے
بعد اپنی مرضی سے علم ہندسہ کے سوالات میں مشغول رہتی ہیں۔ اور ایک دوسرے مدرسۂ
نسواں کی بابت یہ سنا تھا کہ وہاں کی لڑکیاں صرف اسی بات پر قناعت نہیں کرتیں۔
بلکہ ایک لڑکی تو تعطیل کے دنوں میں بھی حل کرنے کے لیے سوالات مانگتی ہے۔
یہ دونوں باتیں ہم اُستاد کی شہادت پر بیان کرتے ہیں۔ یہ واقعات اس امر کا قوی ثبوت
ہیں کہ خود بخود ترقی کرنا ممکن ہے۔ اور اس سے بے حد فائدہ ہوتا ہے! علم کی کوئی
سی شاخ۔ جو معمولی طور پر سکھانے کی وجہ سے خشک بلکہ ناگوار بھی معلوم ہوتی ہے
اگر اُسی شاخ کی تعلیم۔ قدرت کے طریقہ کے مطابق دی جائے۔ تو وہ نہایت دلچسپ
اور نہایت مفید ہوتی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ "نہایت مفید" ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ
ہے کہ یہ نتائج۔ مسائل ہندسیہ کے حاصل کرنے پر محدود نہیں ہیں۔ بلکہ بسا اوقات نفس
کی حالت میں انقلاب عظیم پیدا کر دیتے ہیں۔ بارہا ایسا اتفاق ہوا ہے کہ جو طالب
مدرسہ کی معمولی تربیت کی وجہ سے یعنی اُس کے عقلی صدموں۔ اُس کے ذہن کا
دینے والے کاموں۔ اور علم کو دماغ میں ٹھونس دینے کی وجہ سے۔ بدحواس اور احمق
بن گئے ہیں۔ اگر اُن کو اس طرح تعلیم دی جائے کہ علم کو کاہلوں کی طرح حاصل نہ کریں۔
بلکہ اس بات کی ترغیب دی جائے کہ مستعدی سے خود تحقیقات کرنے لگیں۔ تو اُن کی

عقلیں یکایک بیدار ہو جائیں گی ۔ جب بچوں کے ساتھ ذرا ہمدردی کی جاتی ہے ۔ تو پست ہمتی جو خراب تعلیم کا نتیجہ ہے ۔ کم ہو جاتی ہے ۔ اور ابتدائی کامیابی حاصل کرنے کے لیے کافی استقلال پیدا ہو جاتا ہے ۔ اُس وقت تاثر میں سخت تغیر واقع ہوتا ہے جس کا اثر تمام طبیعت پر پڑتا ہے ۔ اب وہ اپنے آپ کو نالایق نہیں پاتے ۔ اب وہ بھی کچھ نہ کچھ کر سکتے ہیں ۔ جب ایک کامیابی کے بعد دوسری کامیابی بتدریج حاصل ہوتی ہے ۔ تو نا امیدی کا کابوس کافور ہو جاتا ہے ۔ اور وہ اپنے دوسرے سبقوں کی مشکلات پر ایسی دلیری سے حملہ کرتے ہیں ۔ جس میں کامیابی کا یقین ہوتا ہے ۔

علم ہندسہ کی تعلیم کو دلکش بنانے کے لیے پروفیسر ٹنڈل کی رائے ۔

جس وقت مضمون مندرجہ بالا ابتداءً شایع ہوا تھا ۔ اس کے چند ہفتے بعد پروفیسر ٹنڈل نے ایک لکچر میں جو رایل انسٹیٹیوشن (شاہی مدرسہ) میں دیا گیا تھا اور جس کا عنوان تھا "علم طبعی کے مطالعہ کی عظمت اس اعتبار سے کہ وہ تعلیم کی شاخ ہے" اسی بات کا کسی قدر شافی ثبوت دیا تھا ۔ صاحب موصوف کی شہادت جو ذاتی مشاہدہ پر مبنی ہے ۔ اُس کی قدر و قیمت اس قدر زیادہ ہے کہ ہم اُس کو درج کرنے سے باز نہیں رہ سکتے ۔ وہ یہ ہے ۔

"جس زمانہ کا میں نے ذکر کیا ہے ۔ اُس زمانہ میں من جملہ اُن کاموں کے جو میرے حصہ میں آئے تھے ۔ ایک کام ایک جماعت کو ریاضی کی تعلیم دینا تھا ۔ اور میں نے عموماً یہ بات دیکھی کہ جب بچوں کو اقلیدس اور ہندسۂ قدیم کی تعلیم سمجھا کر دی جاتی تھی ۔ تو ان مضامین کا مطالعہ اُن کے لیے بالعموم بہت دلکش ہوتا تھا ۔ مگر میری عادت تھی کہ بچوں کو معمولی کتابی تعلیم سے ہٹا کر ان سوالوں کے حل کرنے کے لیے ۔ جو اُس تعلیم میں شامل نہیں ہیں ۔ ذاتی لیاقت سے کام لینے کی ہدایت کرتا تھا پرانی ڈگر کو چھوڑ کر نئی راہ پر پڑنے سے پہلے پہل طلبہ کو عموماً تھوڑی بہت نفرت ہوتی تھی ۔ اور اُن کو وہی کیفیت محسوس ہوتی تھی جو کسی بچہ کو اجنبی آدمیوں میں چھوڑ دینے سے ہوتی ہے

مگر میں نے ایک بھی ایسی مثال نہیں دیکھی کہ یہ نفرت قایم رہی ہو۔ جب کوئی لڑکا بالکل ہمت ہار دیتا تھا۔ تو میں نیوٹن[۵۱] کی حکایت سے اُن کی ڈھارس بندھاتا تھا۔ جہاں اُس نے یہ بیان کیا ہے کہ "مجھ میں اور دوسرے آدمیوں میں جو فرق ہے وہ زیادہ تر میرے اپنے صبر و استقلال کا نتیجہ ہے" یا مرابو[۵۲] کی حکایت سے اُس کی ہمت بندھاتا تھا۔ کہ جب اُس کے نوکر نے کہا کہ فلاں بات ناممکن ہے تو اُس نے حکم دیا کہ "اس احمقانہ لفظ کو پھر کبھی استعمال نہ کرنا" اِس طرح خوش ہو کر اور مسکرا کر وہ کام پر متوجہ ہو جاتا تھا۔ اس تبسم میں شاید کچھ شبہ سا پایا جاتا تھا۔ مگر پھر بھی دوبارہ کوشش کرنے کا مصمم ارادہ ظاہر ہوتا تھا۔ میں نے دیکھا ہے کہ لڑکے کی آنکھیں خوشی کے مارے چمک اُٹھی ہیں۔ اور آخر کار ایسی خوشی سے کہ ارشمیدس[۵۳] کی "حالت بیخودی" بالکل وہی خوشی ایک وسیع پیمانے پر تھی۔ اُس کو یہ کہتے سُنا ہے کہ "جناب! میں نے اس کو پالیا ہے" پس طلبہ کو اپنی ذاتی طاقت کا شعور پیدا ہو جاتا تھا۔ اور یہ نہایت ہی مفید بات تھی۔ اور اِس طرح نئی زندگی پاکر جماعت کی ترقی درحقیقت تعجب خیز ہوتی تھی۔ اکثر میرا یہ دستور تھا کہ

---

۵۱ سر آئزک نیوٹن انگلستان کا مشہور و معروف فلسفی اور ریاضی دان گزرا ہے ۱۶۴۲ء میں پیدا ہوا تھا۔ اور ۱۷۲۷ء میں انتقال کیا۔ مترجم۔

۵۲ مرابو۔ ملک فرانس کا ایک مقرر اور انقلاب سلطنت کا خواہش مند تھا ۱۷۴۹ء میں پیدا ہوا تھا۔ اور ۱۷۹۱ء میں فوت ہوا۔ مترجم۔

۵۳ ارشمیدس زمانہ قدیم میں ملک یونان میں ایک مشہور ریاضی دان گزرا ہے ۲۸۷ قبل مسیح میں پیدا ہوا تھا۔ اور ۲۱۲ قبل مسیح میں انتقال کیا۔ جس قصہ کی طرف متن میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اُس کی حقیقت یہ ہے کہ جزیرہ صقلیہ میں شہر سرقوسہ کے بادشاہ ہیرو نے ایک سونے کا تاج بنوایا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ تاج توڑا نہ جائے اور کسی تدبیر سے اُس کا کھوٹا کھرا ہونا معلوم ہو جائے۔ بادشاہ نے حکیم ارشمیدس سے کہا کہ اس کی کوئی ترکیب نکالو۔ اُس نے بہت سوچا مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ایک روز حمام میں نہا رہا تھا کہ یکایک وہ ترکیب اُس کے ذہن میں آگئی اور مارے خوشی کے ایسی بیخودی کی حالت اُس پر طاری ہو گئی کہ "میں نے پالیا پالیا" کہتا ہوا حمام سے ننگا ہی نکل بھاگا۔ مترجم۔

لڑکوں کو اختیار دے دیتا تھا - چاہے اپنی کتابی شکلیں حل کریں - چاہے دوسری شکلوں پر - جو کتاب میں نہیں ہیں - طاقت آزمائی کریں - مجھے ایک بھی ایسی مثال معلوم نہیں ہے کہ لڑکوں نے کتابی شکلوں کو پسند کیا ہو - میں ہمیشہ مدد کرنے کو تیار رہتا تھا - جب میں سمجھتا تھا کہ مدد کی ضرورت ہے - مگر میں عادۃً مدد دینے سے انکار کرتا تھا - لڑکوں کو عقلی فتح کی مٹھاس کی چاٹ لگ گئی تھی اور وہ ذاتی فتوحات کے طالب رہتے تھے - میں نے اُن شکلوں کو دیکھا ہے جو انہوں نے دیواروں پر کھرچ کر یا ورزش کے میدان میں گڑی ہوئی لکڑیوں پر کھود کر بنائی ہیں - اور جو زندہ دل چھپی بچے اس مضمون سے رکھتے ہیں اُس کی بے شمار مثالیں اور بھی دیکھی ہیں - اگر میری بابت پوچھو تو - جہاں تک تعلیم کے تجربہ کا تعلق ہے - میں تو محض اُس پرندہ کی مانند تھا - جس کے پر و بال ابھی نکلے ہوں - میں علم التعلیم کے قواعد کو مطلق نہیں جانتا تھا - مگر میں اُس نفسِ مطلب کو کبھی نہیں چھوڑتا تھا جو اس مضمون کے شروع میں بیان کیا گیا ہے - اور اس بات کی کوشش کرتا تھا کہ علم ہندسہ کو تعلیم کی شاخ نہیں - بلکہ تعلیم کا وسیلہ بنایا جائے - اس تجربہ میں مجھے کامیابی ہوئی - اور میری زندگی کے سب سے زیادہ پر لطف گھنٹوں میں سے بعض گھنٹے اس بات کے دیکھنے میں صرف ہوئے ہیں کہ بچوں کی عقلی طاقتوں میں قوی اور فرحت بخش وسعت پیدا ہو جاتی ہے - جب کہ اس طاقت سے اس طرح کام لیا جائے جیسا میں نے بیان کیا ہے -

ہندسہ عملی کی تعلیم کو مختلف صورتوں میں عرصہ تک جاری رکھنا چاہیے

یہ ہندسہ عملی جس میں سوالات کا ایک غیر محدود سلسلہ موجود ہے - دیگر مضامین کے مطالعہ کے ساتھ - اُس کی تعلیم برسوں تک جاری رکھنی چاہیے مادیات علم ہندسہ کے لیے بمنزلہ تمہید کے ہیں اور اگر ہندسہ عملی کے ساتھ ساتھ اصول ہندسیہ کو مادیات پر استعمال کرنے کا عمل برابر جاری رکھا جائے تو یہ بات مفید ہوگی - جب مکعب مثمن مجسم - اور شکلِ مخروطی اور منشور کی مختلف صورتیں بخوبی سمجھ میں آ جائیں - اُس کے

بعد اُن اجسامِ منتظم کو لے سکتے ہیں جو زیادہ مشکل ہیں۔ مثلاً ایسی شکل مجسم جس میں بارہ مخمس ہوں۔ یا ایسی شکل جس میں بیس مخروطی شکلیں ہوں۔ اِن شکلوں کو وصلی کے ٹکڑوں سے کاٹ کر بنانے میں بڑی ذہانت درکار ہے۔ اِن کے بعد۔ اجسامِ منتظم کی ایسی تبدیل شدہ شکلوں کی طرف خود بخود رجوع کر سکتے ہیں۔ جو کرسٹل (بلور نما قلم) میں دیکھی جاتی ہیں۔ یعنی مکعب مقطوع الراس۔ ایسا مکعب جس کے سطح اور نیز مجسم زاویے مقطوع الراس ہوں۔ مثمن مجسم اور مختلف قسم کی منشور جن کی شکل اسی طرح بدلتی رہتی ہے۔ اور مختلف قسم کی دھاتیں اور مختلف قسم کے نمک (ٹھوس بننے کے وقت) جن بے شمار شکلوں کو اختیار کرتے ہیں۔ اُن شکلوں کی نقل اوتارنے میں علم معدنیات سے بھی ضمناً واقفیت حاصل ہو جاتی ہے[۱]۔

هندسہ عملی کے بعد هندسہ عقلی کی تعلیم ہونی چاہیے۔

اس قسم کی مشقوں میں زیادہ عرصہ تک مصروف رہنے کے بعد ہندسہ عقلی کی تعلیم میں۔ جیسا کہ قیاس کیا جا سکتا ہے۔ کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ چونکہ طالب علم کو شکل اور مقدار کے تعلقات پر غور کرنے کی عادت ہو جاتی ہے اور جن بعض نتائج تک بعض وسائل سے رسائی ہوئی ہے۔ اُن نتائج کی ضرورت کو وقتاً فوقتاً مبہم طور پر معلوم کرتا ہے۔ اس لیے وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ جن عملی شکلوں سے اُس نے واقفیت حاصل کی ہے۔ اقلیدس کے ثبوت اُن ہی شکلوں کے گم شدہ ضمیمے ہیں۔ اُس کے قوائے عقلیہ جن کی تربیت عمدہ طور پر ہوئی ہے۔ اُس کو اس لائق بنا دیں گے کہ اشکالِ ہندسیہ پر یکے بعد دیگرے بآسانی عبور حاصل ہو سکے۔ اُن کی قدر و قیمت کو خوب سمجھ سکے۔ اور وقتاً فوقتاً یہ بات معلوم کر کے کہ اُس کے بعض قاعدے صحیح ثابت ہو گئے ہیں۔ اُس کو خوشی حاصل ہوگی۔ پس وہ اُن باتوں کا حظ اُٹھائے گا۔

[۱] جو لوگ اس طریقہ کو عمل میں لانے کے لیے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ مدد کے خواہاں ہیں۔ اُن کو ایک چھوٹی سی کتاب جس کا نام "انوینشنل جیومیٹری" (ایجادی ہندسہ) ہے اس کام میں مدد دے گی۔ اِس کتاب کو سجے اینڈ سی موزلے۔ پیٹرنا سٹر رو۔ لنڈن نے چھاپ کر مشتہر کیا ہے۔ مصنف۔

جو ایسے شخص کے لیے بے لطف ہیں۔ جو اُن کے لیے تیار نہیں ہے۔ اب ہم کو صرف اتنی بات اور بیان کرنی ہے کہ تھوڑی سی مدت میں طالب علم اُس حالت تک پہنچ جائیگا جب کہ اُس کو منجملہ تمام مشقوں کے قوائے متفکرہ کے لیے سب سے زیادہ قابل قدر مشق حاصل ہو سکے گی۔ اب طالب علم اس قسم کی نظری شکلوں کو جیسی مسٹر چیمبرز کی اقلیدس کے مختلف سقالوں کے ساتھ ملحق ہیں۔ جلد حل کر سکے گا اور اُن کے ثابت کرنے سے نفس ناطقہ کو جو ترقی ہوگی۔ وہ محض عقلی نہیں بلکہ اخلاقی بھی ہوگی۔

طریقہ تعلیم کا جو خاکہ اوپر کھینچا گیا ہے اُس کے فائدے۔

اگر ان امور کی بحث کو بہت دور تک جاری رکھا جائے تو ہم کو تعلیم پر ایک مفصل رسالہ لکھنا پڑے گا۔ اور یہ ہمارا مقصد نہیں ہے۔ بچپن کے ابتدائی زمانہ میں ادراک کی مشق کے لیے اسباق الاشیاء کا باقاعدہ انتظام کرنے کے لیے مصوری اور علم ہندسہ کی تعلیم دینے کے لیے۔ تجاویز کا جو خاکہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ اُس کو ایسا سمجھنا چاہیئے کہ وہ اس طریقہ تعلیم کی مثالیں ہیں جس کی طرف متذکرہ بالا اصول عامہ ہدایت کرتے ہیں۔ ہم کو یقین ہے کہ اگر ان اصول تعلیم کی جانچ پرتال کی جائے تو یہ بات معلوم ہوگی کہ وہ نہ صرف آسان سے مشکل تک۔ مبہم سے معین تک مادیات سے مجردات تک۔ عملی سے عقلی تک ترقی کرتے ہیں بلکہ ان مزید شرائط کو بھی پورا کرتے ہیں کہ تعلیم میں کسی قدر تمدن کا اعادہ ہو۔ تعلیم حتی الامکان ایسے طریقہ سے دی جائے کہ بچے خود بخود ترقی کر سکیں اور اُس سے مسرت حاصل ہو۔ چونکہ ایک ہی قسم کا طریقہ ان سب شرطوں کو پورا کرتا ہے۔ اس لیے ان شرطوں کی تصدیق ہو جاتی ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہی طریقہ صحیح ہے۔ اِس بات پر بھی غور کرو کہ یہ طریقہ اُس رجحان کا منطقی نتیجہ ہے جس میں تمام نئے ترقی یافتہ تعلیمی طریقوں کی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں۔

اس میں اُسی قدرتی طریقہ کو پوری طرح اختیار کیا گیا ہے۔ جس کو اُن نئے طریقوں نے جزوی طور پر اختیار کیا ہے۔ اور یہ بات کہ "قدرتی طریقہ کو کامل طور پر اختیار کیا گیا ہے" دو وجہ سے ظاہر ہے۔ اوّل اس وجہ سے کہ یہ طریقہ اصول مذکورہ بالا سے مطابقت رکھتا ہے دوم اس وجہ سے کہ وہ اِن تجاویز کی پیروی کرتا ہے جن کو نشو و نما پانے والا نفس خود سجھاتا ہے۔ اِس سے نفس کی قدرتی مستعدی میں سہولت پیدا ہوگی۔ اور اُس نشو و نما میں مدد ملے گی جس میں قدرت مصروف ہے۔ پس یہ نتیجہ نکالنے کے لیے کافی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ جس طریق عمل کی مثالیں اوپر بیان کی گئی ہیں۔ وہ سچے طریقہ تعلیم سے نہایت قریب ہے۔

تعلیم کے دو نہایت اہم اصول جن پر عموماً بہت ہی کم توجہ کی جاتی ہے

دو عام اصول ایسے ہیں۔ جو سب سے زیادہ ضروری ہیں اور جن پر سب سے کم توجہ کی جاتی ہے۔ اِن دونوں اصولوں پر زیادہ زور دینے کی غرض سے ضرور ہے کہ چند فقرے اضافہ کیے جائیں۔ ایک اصول یہ ہے کہ ابتدائے طفولیت اور زمانہ بلوغ کی طرح تمام جوانی میں بھی وہی طریقہ اختیار کرنا چاہیئے جس سے نفس کی تعلیم خود بخود ہو سکے۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ جس عقلی کام کی ترغیب دی جائے۔ وہ فی حدّ ذاتہ ہمیشہ مرغوب طبع ہونا چاہیئے۔ جو پہلے اصول میں داخل ہے۔ اگر ہم اِس بات کو سمجھ لیں کہ آسان سے مشکل تک۔ مبہم سے معین تک۔ مادیات سے مجرّدات تک۔ ترقی کرنا ایسی ضروری شرطیں ہیں جن کی طرف عقلی سائیکالوجی ہدایت کرتی ہے۔ تو یہ شرطیں کہ "علم کو از خود حاصل کرنا چاہیئے اور اس طرح حاصل کرنا چاہیئے جس سے طبیعت کو حظ حاصل ہو" ایسی کسوٹیاں بن جاتی ہیں جن سے اس بات کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ عقلی سائیکالوجی کی ہدایتوں کی تعمیل ہوتی یا نہیں۔ اگر شرائط مقدم الذکر عقلی ارتقا کے علم (سائنس) کے بڑے بڑے اصول کلیہ ہیں تو شرائط متاخر الذکر عقلی ارتقا کی تقویت کا فن (آرٹ) ہیں۔ اسکی وجہ صاف ظاہر ہے اگر ہمارے

نصاب کے سلسلہ کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ طالب علم بلا امداد یا تھوڑی سی مدد سے یہ تدریج اُس کو خود طے کر سکے۔ تو ضرور ہے کہ وہ سلسلہ قوائے عقلیہ کے مدارج ارتقا سے مطابقت رکھتا ہو۔ اور اگر اس سلسلہ کا یہ تدریج حاصل کرنا طالب علم کے لیے فی الحقیقت باعث تفریح ہے تو صریحاً یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس سلسلے کے لیے اور کسی شئے کی ضرورت نہیں۔ بجز اس کے کہ طالب علم اپنے قویٰ کو باقاعدہ استعمال کرے۔

ازخود تعلیم حاصل کرنے سے کیا کیا فائدے ہیں۔

مگر ایسے طریقہ سے تعلیم دینا۔ جس سے ازخود ترقی ہو۔ اس سے۔ علاوہ اس فائدے کے کہ ہمارے سبق باقاعدہ رہتے ہیں۔ اور بھی فائدے ہیں۔ اوّل تو یہ طریقہ اس بات کا ضامن ہے کہ خیالات کو صفائی کے ساتھ ہمیشہ کے لیے دل پر نقش کردے اور معمولی طریقوں سے یہ بات کبھی حاصل نہیں ہوسکتی۔ کوئی سا علم۔ جو طالب علم نے بطور خود حاصل کیا ہو۔ مثلاً کوئی سوال۔ جو اُس نے آپ حل کیا ہو۔ یہ نسبت کسی دوسرے طریقہ کے زیادہ کامل طور پر اُس کے قابو میں آجاتا ہے کیونکہ اُس نے اپنی قوت سے اس پر فتح حاصل کی ہے۔ نفس کی ابتدائی مستعدی۔ جس پر اُس کی کامیابی دلالت کرتی ہے۔ خیال کا ایک طرف جمانا۔ جو اُس کے لیے ضروری ہے۔ اور وہ جوش جو فتح مندی کا نتیجہ ہے۔ یہ سب چیزیں مل کر واقعات کو اُس کے حافظہ کی کتاب میں اس طرح درج کردیتی ہیں کہ جو معلومات صرف معلم سے سُن کر۔ یا مدرسہ کی کتابوں میں پڑھ کر حاصل ہوتی ہے۔ وہ ایسی محفوظ نہیں رہ سکتی۔ اگر طالب علم ناکام رہے تو بھی اُس کشش و کوشش کی وجہ سے۔ جو اُس کے قوائے عقلیہ نے کی ہے اس امر کا اطمینان ہوجاتا ہے۔ کہ جب اُس کو کوئی شے حل کرنے کے لیے دی جائے تو وہ خوب اچھی طرح اُس کو یاد رکھے گا۔ بہ نسبت اس کے کہ اُس کو چھ مرتبہ دہرائے پھر اس بات پر بھی غور کرو کہ اس تربیت کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو علم اُس نے حاصل کیا ہے۔ وہ سلسلہ وار پر منضبط رہتا ہے۔ جو واقعات اور نتائج اس باضابطہ طریقہ سے

ذہن نشین ہوتے ہیں۔ اُن کی ماہیت ہی میں یہ بات داخل ہے کہ وہ یہ تدریج مزید نتائج کی بنیاد۔ یعنی مزید سوالات حل کرنے کا وسیلہ۔ بن جاتے ہیں۔ کل کے سوال کا حل آج کے سوال کے سمجھنے میں طالب علم کو مدد دیتا ہے۔ پس علم۔ ذہن میں آتے ہی ایک ملکہ بن جاتا ہے۔ اور غور و فکر کے عام فرض کو پورا کرنے میں مدد دیتا ہے یعنی صرف اندرونی کتب خانہ (دل) کے صفحوں پر لکھا ہوا نہیں پڑا رہتا۔ جیسا کہ رٹا لینے کی حالت میں ہوتا ہے۔ اِس فائدہ کے علاوہ۔ ہمیشہ اپنی مدد آپ کرنے سے جو اخلاقی تربیت حاصل ہوتی ہے۔ اُس پر بھی غور کرو۔ دلیری سے مشکلات پر حملہ کرنا۔ توجہ کو صبر کے ساتھ ایک طرف لگانا۔ ناکامیوں میں استقلال رکھنا۔ یہ ایسی خصوصیتیں ہیں جو آیندہ زندگی میں خاص کر مطلوب ہیں۔ اور اگر نفس کو ایسی عادت ڈلوائی جائے کہ وہ اپنی خوراک کے لیے خود کام کرے۔ تو یہی خصوصیتیں اس طریقہ سے خاص طور پر حاصل ہوتی ہیں۔ ہم خود اس بات کی تصدیق کر سکتے ہیں کہ اس طریقہ سے تعلیم دینا بالکل ممکن العمل ہے۔ کیونکہ فن مصوری کے مشکل سوالات کو بچپن میں اسی طرح ہم سے حل کرایا گیا تھا۔ اور یہ بات کہ سربرآوردہ معلموں کا میلان اسی طرف رہا ہے۔ فیلین برگ کے اس قول سے ثابت ہے کہ طالب علم کی ذاتی اور آزادانہ مستعدی اُن بہت سے لوگوں کی معمولی مصروفیت اور جبارت کی نسبت زیادہ وقعت رکھتی ہے۔ جو معلمی کا پیشہ اختیار کرتے ہیں" اور ہارلس[۵] ہین کی اس رائے سے کہ "بدقسمتی سے آج کل ہم لوگوں میں تعلیم زیادہ تر اسی کا نام ہے کہ طالب علم کو بتا دیتے ہیں۔ سکھاتے نہیں" اور مسٹر مارسل کے اس مقولہ سے کہ "جو باتیں متعلم عقلی کوشش سے دریافت کرتا ہے۔ بہ نسبت اُن باتوں کے جو اُس کو بتائی جاتی ہیں۔ زیادہ عمدہ طور پر یاد رہتی ہیں"

---

[۵] ہارلس ہین۔ امریکہ کا ایک عالم تھا۔ فن تعلیم سے دلچسپی رکھتا تھا۔ ۱۷۹۶ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۸۵۹ء میں انتقال کیا۔ مترجم۔

تعلیم کو دل کش اور باعث مسرت بنانے کے فوائد

علی ہٰذا القیاس دوسری شرط جو پہلی شرط کو لازم ہے۔ اُس کی بھی یہی کیفیت ہے یعنی درس و تربیت کا جو طریقہ اختیار کیا جائے۔ وہ ایسا عمل ہونا چاہیئے۔ جو فی الواقع مسرت انگیز ہو گے یہ مسرت اُس ذاتی معاوضہ کی وجہ سے نہیں ہے۔ جو ملنے والا ہے۔ بلکہ اُس کی ذاتی سود مندی کی وجہ سے ہے۔ اِس شرط کے مطابق عمل کرنے سے ایک تو یہی فائدہ ہے کہ وہ ہم کو باقاعدہ عمل ارتقا میں مزاحمت کرنے سے باز رکھتا ہے۔ اِس کے علاوہ اور بھی مہتم بالشان قطعی فوائد ضمناً حاصل ہوتے ہیں۔ جوانی کی خوشی کا قایم رکھنا۔ بجائے خود ایک قابل قدر مقصد سمجھنا چاہیئے۔ بجز اُس صورت کے کہ ہم راہبانہ اخلاق (بلکہ یوں کہو کہ بداخلاقی) کی طرف اُلٹے ہٹ جائیں۔ مگر ہم اِس بحث کو طول نہیں دیتے اور اِس بات کو بیان کرتے ہیں کہ تاثر کی نشاط انگیز حالت بے اعتنائی یا نفرت کی حالت کی نسبت عقلی عمل میں بہت زیادہ مساعد ہوتی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ جو باتیں ذوق و شوق سے پڑھی۔ سُنی یا دیکھی جاتی ہیں۔ وہ اِن باتوں کی نسبت جو نفرت سے پڑھی سنی یا دیکھی جاتی ہیں۔ زیادہ اچھی طرح یاد رہ سکتی ہیں۔ جن قوای سے کام لیا جاتا ہے۔ وہ پہلی حالت میں تو مضمون زیر بحث میں مستعدی سے مصروف ہوتے ہیں مگر دوسری حالتمیں سستی سے مصروف ہوتے ہیں۔ اور ہمیشہ زیادہ دل کش خیالات کی طرف توجہ مبذول ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ توجہ کی زیادتی یا کمی کے اعتبار سے تاثرات قوی یا ضعیف ہوتے ہیں۔ اِس کے علاوہ کسی مطالعہ میں ذوق و شوق نہ رکھنے کی وجہ سے طالب علم میں جو عقلی سُستی پیدا ہو جاتی ہے۔ اُس پر سزا کا خوف اور زیادہ کرنا چاہیئے۔ جو قوائے عقلیہ کو بے کار اور مُردہ کر دیتا ہے۔ اِس سے توجہ پریشان ہو جاتی ہے۔ اور جن باتوں سے اُس کے قوائے عقلیہ کو نفرت ہے۔ اُن پر قوائے عقلیہ کو لگانے سے جو دقت پیش آتی ہے وہ اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ پس صاف ظاہر ہے کہ جس خوشی سے طالب علم اپنا کام پورا کرتا ہے

اُسی خوشی کی مناسبت سے تعلیم کارگر ہوتی ہے - بشرطیکہ باقی امور مساوی ہوں -

اخلاقی فائدے جو تعلیم کو دلکش بنانے سے حاصل ہوتے ہیں

یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیئے کہ سنجیدہ اخلاقی نتایج اُس خوشی یا تکلیف پر منحصر ہیں جو روزانہ سبقوں سے عادۃً حاصل ہوتی ہے کون ہے جو دو لڑکوں کے چہروں اور اطوار کا مقابلہ کرے - یعنی ایک وہ لڑکا جو دلچسپ مضامین کے ذہن نشین کرنے کی وجہ خوش و خرّم رہتا ہے - اور دوسرا وہ لڑکا جو اپنے مطالعہ سے نفرت کرنے کی وجہ سے اپنی نالیاقتی کی وجہ سے - جو اُسی نفرت کا نتیجہ ہے - نظر سرد مہری کی وجہ سے زجر و توبیخ کی وجہ سے مصیبت زدہ رہتا ہے - اور اُس کو یہ بات معلوم نہ ہو جائے کہ پہلے لڑکے کے مزاج کو فائدہ اور دوسرے کے مزاج کو نقصان پہنچ رہا ہے ہ جس شخص نے اس بات پر غور کی ہے کہ کامیابی اور ناکامیابی سے نفس پر کیا کیا اثرات ہوتے ہیں اور اس بات پر بھی کہ نفس کو جسم پر کس قسم کا اقتدار حاصل ہے - وہ دیکھ لے گا کہ پہلی حالت میں مزاج اور صحت دونوں پر عمدہ اثر پڑتا ہے - مگر دوسری حالت میں اس بات کا اندیشہ ہے کہ اُس کے مزاج میں زود رنجی - بزدلی بلکہ خلقی افسردگی بھی مستقل طور پر پیدا نہ ہو جائے - ابھی ایک بالواسطہ نتیجہ اور باقی ہے - جس کی وقعت کچھ کم نہیں ہے - جس مناسبت سے طریقہ تعلیم مسرّت یا مصیبت کا موجب ہوتا ہے اُسی مناسبت سے معلّمین اور متعلّمین کے باہمی تعلقات دوستانہ اور موثر یا مخالفانہ اور کمزور ہوتے ہیں - بشرطیکہ باقی امور مساوی ہوں - سب انسان بالکل اُن ہی خیالات کے قابو میں ہوتے ہیں - جن سے اون کا تعلق ہوتا ہے - جو شخص ہر روز تکلیف پہنچائے - ممکن نہیں کہ اُس کو پوشیدہ طور پر ناپسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھا جائے - اور اگر وہ تکلیف وہ خیالات کے سوا اور کسی قسم کے خیالات پیدا نہیں کرتا تو اوس سے یقیناً نفرت کی جائے گی - برعکس اس کے جو شخص بچوں کو اُن کے مقاصد میں ہمیشہ مدد دیتا ہے - فتح کی خوشیاں

ہر وقت اُن کے لیے مہیا کرتا ہے۔ مشکلات کے حل کرنے میں ہر وقت اُن کی ہمت بندھاتا ہے۔ اور اُن کی کامیابی میں ہم دردی ظاہر کرتا ہے۔ ایسے شخص کو بچے پسند کریں گے۔ نہیں۔ اگر اُس کا برتاؤ ہمیشہ یکساں ہو۔ تو ضرور اُس سے محبت کریں گے۔ اور جب ہم اِس بات کو یاد رکھیں کہ جس اوستاد کو شاگرد دوست سمجھتے ہیں اُس کا دباؤ بمقابلہ اُس اُستاد کے جس کو نفرت۔ یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ بے اعتنائی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ کیسا موثر اور نرم ہوتا ہے تو ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں۔ کہ تعلیم کو مسرت کے اصول پر جاری رکھنے سے جو بالواسطہ فوائد حاصل ہوتے ہیں وہ بلاواسطہ فوائد سے کچھ کم نہیں ہیں جس طریقہ تعلیم کی ہم نے یہاں حمایت کی ہے۔ اگر لوگ یہ اعتراض کریں کہ اُس پر عمل درآمد ممکن نہیں ہے۔ تو ہم حسب سابق اُن کو یہ جواب دیتے ہیں کہ نہ صرف خیال ہم کو اِس طریقہ کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ بلکہ تجربہ بھی اِس کی سفارش کرتا ہے۔

پستالوتزی کے زمانہ سے لے کر اِس وقت تک جن ممتاز معلموں نے اِس طریقہ تعلیم کی تصدیق کی ہے۔ اُن کی بہت سی رایوں کے ساتھ ہم پروفیسر پلنیز[51] کی رائے کو یہاں شامل کر سکتے ہیں۔ جن کا یہ قول ہے:۔

دل کش طریقے سے تعلیم دینے کے متعلق پروفیسر پلنیز کی شہادت۔

"جہاں چھوٹے بچوں کو اس طرح تعلیم دی جاتی ہے۔ جس طرح کہ دینی چاہیئے۔ وہاں وہ مدرسے میں بالکل ایسے ہی خوش رہتے ہیں جیسے کھیل میں۔ اور شاذو نادر ہی اُس کی نسبت کم خوش رہتے ہوں گے۔ نہیں۔ بلکہ اکثر اوقات جسمانی طاقتوں کی مشق کی نسبت عقلی قوتوں کی باقاعدہ مشق سے زیادہ خوش ہوتے ہیں[52]"

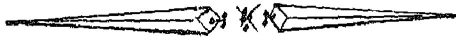
[51] جیمز پلینز۔ اڈنبرگ یونی ورسٹی کا پروفیسر اور فن تعلیم کا عالم تھا۔ ۱۷۷۸ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۸۶۴ء میں انتقال کیا۔ مترجم

[52] اس مطلب کو نظیری نیشاپوری نے اس طرح ادا کیا ہے ؎

در دبستان ادب اگر بود زمزمہ محبتے	جمعہ بہ مکتب آورد طفل گریز پائے را	مترجم

ب اور وجہ جس سے تعلیم ہر دو اصول مذکورہ بالا ... معلوم ہوتی ہے

اسیسے طریقہ سے تعلیم دینا جس سے از خود علم حاصل ہو سکے ۔ جس کا یہی نتیجہ ہے کہ تعلیم ایک عمل نشاط انگیز ہو ۔ اس کی آخری وجہ پیش کرنے کے لیے ہم اس بات پر غور کر سکتے ہیں کہ تعلیم جس قدر اس طریقہ کے مطابق ہوگی ۔ اُسی قدر ظن غالب ہے کہ وہ اختتام زمانۂ تعلیم کے بعد ختم نہ ہوگی ۔ جب تک بچے تحصیل علم سے عادۃً نفرت کرتے رہیں گے ۔ اُس وقت تک یہی میلان غالب رہے گا کہ والدین اور اُستادوں کے دباؤ سے آزاد ہوتے ہی علم کو خیرباد کہیں ۔ اور جب تحصیل علم عادۃً باعث مسرت ہوتی ہے ۔ اُس وقت بغیر نگرانی کے بھی اپنے نفس کو آپ تعلیم دینے کا میلان جاری رہتا ہے ۔ جو پیشتر زیر نگرانی جاری تھا ۔ یہ نتائج اٹل ہیں ۔ جب کہ روحانی تعلق کے قوانین صحیح ہیں ۔ یا بہ عبارت دیگر جب کہ لوگ اُن چیزوں اور اُن مقاموں کو ناپسند کرتے ہیں ۔ جن سے دردانگیز باتیں یاد آتی ہیں ۔ اور اُن چیزوں اور اُن مقاموں کو پسند کرتے ہیں ۔ جن سے گزری ہوئی خوشیاں یاد آتی ہیں ۔ تو اسی طرح دردانگیز سبق علم کو ناگوار ۔ اور نشاط انگیز سبق اُس کو دل کش بناتے ہیں ۔ جن لوگوں نے طفولیت میں بے لطف سبقوں کے ذریعہ سے معلومات حاصل کی ہے ۔ جس کے ساتھ سزا کی دھمکی بھی شامل تھی ۔ اور جن کو آزادانہ تحقیقات کی عادت کبھی نہیں ڈلوائی گئی ۔ ایسے لوگ آیندہ عمر میں غالباً مطالعہ جاری نہیں رکھینگے مگر جن لوگوں نے قدرتی شکلوں میں ۔ اور مناسب وقتوں پر اُس معلومات کو حاصل کیا ہے ۔ اور جو اُن واقعات کو نہ صرف اس حیثیت سے یاد رکھتے ہیں کہ وہ بذات خود دلچسپ ہیں ۔ بلکہ اس حیثیت سے بھی ۔ کہ وہ نشاط انگیز کامیابیوں کے ایک دراز سلسلہ کی یادگاریں ہیں ۔ ایسے لوگ اپنے نفس کو آپ تعلیم دینا جاری رکھیں گے ۔ جس کا آغاز طفولیت میں ہوا تھا ۔



باب سوم

تعلیم اخلاقی

موجودہ نصاب تعلیم کا سب سے بڑا نقص جو عموماً نظر انداز کر دیا ہے

ہمارے نصاب تعلیم میں جو نقص سب سے بڑا ہے اس کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ ہمارے طرق تعلیم کی تفصیلی ترقی کے لیے مضمون اور طریقہ دونوں کے اعتبار سے بہت کچھ کوشش ہو رہی ہے۔ مگر جو ضرورت نہایت سخت ہے اُس کو اب تک بہ حیثیت ضرورت تسلیم ہی نہیں کیا گیا۔ اس بات کو چپ چاپ تسلیم کیا جاتا ہے کہ "نوجوانوں کو فرائض زندگی کے لیے تیار کرنا" ایسا مقصد ہے جو والدین اور معلموں کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ اور خوش قسمتی سے جو چیزیں پڑھائی جاتی ہیں اُن کی قدر و قیمت کا اور اُن چیزوں کی تعلیم میں جو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں اُن کی عمدگی کا اندازہ آج کل صریحاً اس بات سے کیا جاتا ہے کہ آیا وہ چیزیں اور وہ طریقے اِس مقصد کے واسطے مناسب ہیں یا نہیں۔ محض السنہ قدیمہ کی تعلیم کی بجائے ایسی تعلیم کو رکھنا جس میں زمانۂ حال کی زبانیں بھی شامل ہوں۔ اس تعلیم کی خوبی کو اسی دلیل سے ثابت کیا جاتا ہے۔ نصاب تعلیم میں سائنس کی مقدار بڑھانے کی ضرورت پر اسی قسم کی وجوہ سے زور دیا جاتا ہے۔ لیکن اگرچہ لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو آداب مجلس اور اُن فرائض کے لائق بنانے کے لیے جو بہ حیثیت

باشندہ شہر عائد ہوتے ہیں۔ کچھ نہ کچھ احتیاط کی جاتی ہے۔ تاہم اُن کو منصب والدین کے لایق بنانے کے لیے کچھ بھی احتیاط نہیں کی جاتی۔ یہ بات دیکھی جاتی ہے کہ حصول معاش کی غرض سے پوری پوری تیاری کی ضرورت ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ تربیت اطفال کے لیے کسی قسم کی تیاری ضرور نہیں سمجھی جاتی۔ ایک لڑکے کے بہت سے سال اُس علم کے حاصل کرنے میں صرف ہو جاتے ہیں۔ جس کی بڑی قیمت یہ ہے کہ وہ ”ایک شریف آدمی کی تعلیم“ کے لیے مخصوص ہے۔ اور ایک لڑکی کے بہت سے سال اُن آرایشی فنون کی تحصیل میں صرف ہو جاتے ہیں۔ جو اُس کو شبانہ جلسوں میں شامل ہونے کے لایق بناتے ہیں۔ مگر سب سے بھاری ذمہ داری یعنی انتظام عیال کی تیاری میں کسی لڑکے یا لڑکی کا ایک گھنٹہ بھی صرف نہیں ہوتا۔ کیا یہ ذمہ داری ایسی ہے جس کے عائد ہونے کا ایک بعید احتمال ہے؟ برعکس اس کے دس میں سے نو پر یہ ذمہ داری یقیناً عاید ہوگی۔ کیا یہ بات ہے کہ اس ذمہ داری کا پورا کرنا آسان ہے؟ یقیناً نہیں۔ جو فرائض جوان آدمی کو ادا کرنے پڑتے ہیں اُن میں سب سے زیادہ مشکل یہی ہے۔ کیا یہ بات ہے کہ ہم ہر ایک لڑکے یا لڑکی پر بھروسہ کر سکتے ہیں کہ وہ ازخود تعلیم حاصل کر کے اپنے آپ کو باپ یا ماں کا فرض ادا کرنے کے لایق بنا سکتا یا بنا سکتی ہے؟ نہیں۔ صرف یہی بات نہیں کہ اس طرح ازخود تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت کو کسی نے تسلیم نہیں کیا۔ بلکہ یہ مضمون اپنی پیچیدگی کی وجہ سے من جملہ دیگر مضامین کے۔ ایسا بن گیا ہے جن میں ازخود تعلیم حاصل کرنے سے کامیابی کا احتمال بہت ہی کم ہے۔ فن تعلیم و تربیت کو نصاب سے خارج رکھنے کے لیے کوئی معقول عذر پیش نہیں کیا جا سکتا ہم کو یہ بات تسلیم کرنی چاہیئے کہ بچوں کی جسمانی۔ عقلی اور اخلاقی تربیت کے صحیح طریقوں کا علم نہایت ہی مہتم بالشان علم ہے۔ خواہ اس حیثیت سے کہ خود

والدین کی خوشی پر اُس کا اثر پڑتا ہے اور خواہ اس حیثیت سے کہ وہ اُن کی اولاد اور بعید نسلوں کی خصلت اور زندگی پر مؤثر ہوتا ہے۔ یہ مضمون اُس نصاب تعلیم کا آخری مضمون ہونا چاہیئے۔ جو ہر مرد و زن کو طے کرنا پڑتا ہے۔ جس طرح جسمانی پختگی اولاد پیدا کرنے کی قابلیت سے پہچانی جاتی ہے۔ اسی طرح روحانی پختگی اُس اولاد کو تربیت کرنے کی قابلیت سے پہچانی جاتی ہے۔ وہ مضمون جو سب مضمونوں پر حاوی ہے۔ اور اسی لیے وہ مضمون جس سے تعلیم معراج کمال پر پہنچنی چاہیئے۔ تعلیم کا خیال اور عمل ہے۔

اخلاقی تعلیم کے انتظام کی خرابی اور اُس کی وجہ

چونکہ اس تعلیم کے لیے تیاری نہیں ہوتی اِس لیے بچوں کا انتظام اور بالخصوص اخلاقی انتظام ایسا خراب ہے جس سے افسوس ہوتا ہے۔ والدین یا تو اِس معاملہ پر کبھی غور نہیں کرتے یا اُن کے نکالے ہوئے نتیجے نامکمل اور تناقض ہوتے ہیں۔ اکثر حالتوں میں۔ اور خاص کر ماؤں کی طرف سے جو برتاؤ ہر موقع پر اختیار کیا جاتا ہے۔ وہی ہوتا ہے جو بروقت سوجھ جائے۔ یہ برتاؤ کسی ایسے یقین پر مبنی نہیں ہوتا جو بحث و دلیل سے حاصل ہو۔ کہ بچہ کو سب سے زیادہ فایدہ کس چیز سے پہنچے گا۔ بلکہ اِس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ والدین کے خیالات کا رجحان کس طرف ہے۔ اور جوں جوں یہ خیالات بدلتے رہتے ہیں۔ وہ برتاؤ بھی گھڑی گھڑی بدلتا رہتا ہے یا اگر جذبات کی ہدایتوں کے ساتھ بعض قطعی اصول و طرق کو بھی بطور ضمیمہ شامل کرلیا جاتا ہے۔ تو یہ اصول و طرق وہی ہوتے ہیں۔ جو سلف سے سینہ بسینہ پہنچے ہیں۔ یا بچپن کی یاد کی ہوئی باتوں سے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ یا اناؤں اور نوکروں سے حاصل ہوتے ہیں۔ یہ ایسے طریقے ہیں جو زمانہ کی روشنی نے نہیں بلکہ جہالت نے تجویز کیے ہیں۔ ضبط نفس کے متعلق لوگوں کی رائے اور اُن کے عمل میں جو ابتری ہے۔ اِس پر بحث کرتے ہوئے رکٹر[1] نے یہ لکھا ہے:-

[1] رکٹر ملک جرمنی کا ایک مصنف ہے ۱۷۶۳ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۲۷ء میں فوت ہوا۔ مترجم۔

اخلاقی تعلیم کی ابتر حالت کے متعلق ر کرصاحب کا بیان۔

"اگر بہت سے معمولی باپوں کے پوشیدہ تلونات کو ظاہر کیا جائے۔ اور اخلاقی تعلیم کے لیے ان کو مرتب کر کے مطالعہ اور خواندگی کا دستور العمل بنا کر پیش کیا جائے تو اُن تلونات کی صورت کچھ اس طرح ہوگی :- پہلے گھنٹہ میں خالص اخلاقی اصول بچہ کو پڑھ کر سنائے جائیں - خواہ میں خود سناؤں - خواہ اتالیق سنائے دوسرے گھنٹہ میں مخلوط اخلاقی اصول - یعنی وہ اُصول جو کسی کے ذاتی فائدے کے متعلق ہوں تیسرے گھنٹہ میں - کیا تم نہیں دیکھتے کہ تمہارا باپ فلاں فلاں کام کرتا ہے ؟ چوتھے گھنٹہ میں - تم چھوٹے بچے ہو اور یہ کام صرف بڑے آدمیوں کے لایق ہے - پانچویں گھنٹہ میں - بڑی بات یہ ہے کہ تم کو دنیا میں کامیاب ہونا چاہیے اور سلطنت میں کچھ نہ کچھ بن جانا چاہیے - چھٹے گھنٹہ میں - آدمی کی قدر کا فیصلہ عالم فانی میں نہیں - بلکہ عالم جاودانی میں ہوتا ہے - ساتویں گھنٹہ میں اس سے زیادہ ظلم کی برداشت کرو اور مہربانی کرو - آٹھویں گھنٹہ میں - اگر کوئی تم پر حملہ کرے - تو بہادری سے اپنے آپ کو بچاؤ - نویں گھنٹہ میں - پیارے بچہ! غل نہ کرو - دسویں گھنٹہ میں - بچے کو ایسا چپ چاپ نہیں بیٹھنا چاہیے - گیارھویں گھنٹہ میں - تم کو زیادہ اچھی طرح اپنے ماں باپ کے حکموں کو ماننا چاہیے بارھویں گھنٹہ میں اور اپنے آپ کو تعلیم دو - اس طرح اپنے اصول کو گھڑی گھڑی بدلنے سے - باپ انکی نا استواری اور یک رخی کو چھپاتا ہے - اب رہی اُسکی بیوی وہ نہ تو شوہر خاوند کی مانند ہے - اور نہ ایک اس نقال ہی کی مانند ہے - جو دونوں بغلوں میں کاغذات کا بستہ لیے ہوئے سٹیج (تماشہ گاہ) پر آموجود ہوا تھا - اور اس سوال کے جواب میں کہ "تمہاری دائیں بغل میں کیا ہے ؟ اُس نے کہا - احکام ' اور اس سوال کے جواب میں کہ تمہاری بائیں بغل میں کیا ہے ؟ اُس نے کہا مخالف احکام " - مگر بچہ کی ماں کا مقابلہ بریاروس[۵۱]

[۵۱] قدیم یونانیوں کے قصہ کہانیوں میں بریاروس ایک دیو کا نام ہے جس کے پچاس سر اور سو ہاتھ تھے - مترجم -

دیو سے کیا جائے تو بہت بہتر ہے جس کے نشوباز و تھے - ہر بازو میں کا غلاظت کا ایک لبتہ تھا"

یہ حالت جلد تبدیل نہیں ہو سکتی - قبل اس کے کہ اس حالت میں کسی طرح کی اصلاح کی توقع کی جاسکے - کئی پشتوں کا گذرجانا ضروری ہے - ملکی قوانین کی طرح تعلیمی اُصول بھی بنائے نہیں جاتے بلکہ آہستہ آہستہ نشوونما پاتے ہیں - اور تھوڑے تھوڑے عرصہ میں نشوونما محسوس نہیں ہو سکتا - ہر ایک ترقی آہستہ آہستہ تو ہوا ہی کرتی ہے - تاہم یہی ترقی استعمال وسائل پر دلالت کرتی ہے اور من جملہ دیگر وسائل کے ایک وسیلہ مباحثہ بھی ہے -

کسی امر میں اصلاح کی توقع جلد نہیں کرنی چاہیے

ہم اُن لوگوں میں نہیں ہیں - جو لارڈ پامرسٹن[۵۱] کے اس اصول کے معتقد ہیں کہ "تمام بچے نیک پیدا ہوتے ہیں" - بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مخالف اُصول بہ حیثیت مجموعی راستی سے اس قدر دور نہیں ہے - اگرچہ مستحکم وہ بھی نہیں ہے ہم اُن لوگوں سے بھی متفق نہیں ہیں جو یہ خیال کرتے ہیں کہ عاقلانہ تربیت سے بچوں کو بالکل ایسا ہی بنا سکتے ہیں - جیسا اُن کو ہونا چاہیے - برخلاف اس کے ہم کو اطمینان ہے کہ اگرچہ فطرت کے عیوب عاقلانہ انتظام سے کم ہو سکتے ہیں - مگر دور نہیں ہو سکتے - یہ خیال کہ "کامل طریقہ تعلیم سے - انسان کامل فوراً پیدا ہو سکتا ہے" قریب قریب اسی خیال کے موافق ہے جو شیلی[۵۲] کی نظموں میں کنایۃً ظاہر کیا گیا ہے کہ "اگر نوع انسانی اپنے قدیمی آئین اور تعصبات کو ترک کر دے - تو دنیا کی تمام بُرائیاں فی الفور کافور ہو جائیں - جن لوگوں نے انسانی معاملات کا مطالعہ بے تعصبانہ طریق سے کیا ہے - وہ ان دونوں خیالوں میں سے کسی ایک خیال کو بھی قبول نہیں

فطرت انسانی کی بابت لارڈ پامرسٹن کی رائے اور اس بارہ میں ہمارا اختلاف -

۵۱ لارڈ پامرسٹن - انگلستان کا ایک سربرآوردہ امیر اور وزیر اعظم تھا - سنہ ۱۷۸۴ء میں پیدا ہوا اور سنہ ۱۸۶۵ء میں انتقال کیا - مترجم -

۵۲ شیلی انگلستان کا ایک مشہور شاعر تھا - سنہ ۱۷۹۲ء میں پیدا ہوا اور سنہ ۱۸۲۲ء میں انتقال کیا - مترجم -

کر سکتے[۱۱]۔

تاہم جو لوگ اس قسم کی نہایت پرجوش امیدیں رکھتے ہیں - ہم کو اُن کے ساتھ ہمدردی کرنی مناسب ہے سخت جوش اگر دیوانگی کی حد کو پہنچ جائے - تو بھی وہ ایک مفید بلکہ شاید نہایت ضروری قوت محرکہ ہے - یہ بات ظاہر ہے کہ مدبر سلطنت کبھی اُن مشقتوں کو نہ جھیلتا - اور اُن نقصانات کو گوارا نہ کرتا جو کہ وہ جھیلتا اور گوارا کرتا ہے اگر اُس کو یقین نہ ہوتا کہ جس بات کی اصلاح کیلئے وہ لڑ رہا ہے وہ ہی ایک شئے ضروری ہے جو شخص مسکرات سے قطعًا پرہیز کرتا ہے - اگر اُس کو اس بات کا یقین نہ ہوتا کہ نشہ بازی تمام قومی برائیوں کی جڑ ہے تو وہ اس قدر زور و شور سے ترکِ مسکرات کی تحریک نہ کر سکتا مثل دوسرے کاموں کے "حب انسانی" کے کاموں میں بھی تقسیم محنت سے بڑا نفع حاصل ہوتا ہے اور محنت کی تقسیم جب ہی ہو سکتی ہے کہ "محبان انسانی" کی ہر ایک جماعت اپنے فرض کی کم و بیش تابع ہو جائے - یعنی اُس جماعت کو اپنے کام کا بہت ہی زیادہ اعتقاد ہو - پس جو لوگ عقلی یا اخلاقی تعلیم کو ایسا سمجھتے ہیں کہ یہی تعلیم ہر مرض کی دوا ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُن کی ناواجب توقعات "بے فائدہ نہیں ہیں - اور شاید خدا تعالےٰ کے رحیمانہ نظام کائنات کا ایک جزیہ بھی ہے کہ ان لوگوں کے اعتقاد میں تزلزل واقع نہیں ہو سکتا[۱۲]-

کسی مفید کام کی دُھن اگر دیوانگی تک پہونچ جائے تو بھی مفید ہے

---

[۱۱] یہ مسئلہ فلسفۂ اخلاق کے نہایت اہم مسائل میں سے ہے اور تمام فلسفۂ اخلاق کی بنیاد ہے - ہم بخوف طوالت یہاں اس مسئلہ پر بحث نہیں کر سکتے - اخلاق ناصری اور اخلاق جلالی میں بڑی تفصیل سے اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے - اور نہایت قابلیت کے ساتھ حکما کے اقوال اور اُن کے دلائل کو بیان کر کے یہی قول مفصل لکھا ہے - ناظرین بطور خود ان کتابوں میں اس مسئلہ کا مطالعہ کر سکتے ہیں - مترجم

[۱۲] مولانا روم نے اسی مضمون کی طرف اس شعر میں اشارہ کیا ہے ؎

ہر کسے را بہر کارے ساختند		میل او را در دلش انداختند	مترجم

والدین کا عام رویہ اولاد کے ساتھ اُن کے سخت برتاؤ کی چند مثالیں

اگر یہ بات سچ ہو کہ "اخلاقی انتظام کے کسی ممکن طریقے سے بچوں کو جس قالب میں چاہیں ڈھال سکیں" اور یہ طریقہ ہر ایک ماں باپ کے ذہن نشین کر دیا جائے۔ تو بھی جو مقصد مد نظر ہے ہم اس کے حاصل کرنے سے دور دور رہیں گے۔ لوگ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ اس قسم کے کسی طریقہ کا عمل میں لانا۔ گویا پہلے سے اس بات کا فرض کر لینا ہے کہ بالغوں میں عقل۔ نیکی۔ اور ضبط النفس بدرجہ کمال موجود ہیں۔ حال آنکہ وہ کسی میں نہیں ہوتیں۔ جو لوگ خانگی تربیت کے مسائل پر بحث کرتے ہیں۔ ان کی غلطی یہ ہے کہ وہ جملہ عیوب و مشکلات کو بچوں کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اور والدین کی طرف ایک کو بھی منسوب نہیں کرتے انتظام عیال کی بابت جیساکہ قومی گورنمنٹ کے متعلق خیال کیا جاتا ہے۔ یہ بات عموماً فرض کر لی جاتی ہے کہ خوبیاں تو حاکم میں ہیں۔ اور برائیاں برائیاں محکوم میں ہیں۔ اگر تعلیمی خیال سے اندازہ کیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ مردوں اور عورتوں کو جو تعلقات اپنی اولاد کے ساتھ ہیں۔ ان کی شکل بالکل بدل گئی ہے۔ جن باشندگان شہر سے ہم معاملہ کرتے ہیں۔ جن لوگوں سے ہم دنیا میں ملتے جلتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ بہت ناقص مخلوق ہیں۔ آئے دن کی تھکا فضیحت سے۔ دوستوں کے جھگڑوں قصوں سے دیوالا نکالنے کی حقیقت کھل جانے سے مقدمہ بازی سے پولیس کی رپوٹوں سے۔ لوگوں کی خود غرضی۔ بددیانتی۔ اور بے رحمی۔ جو چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ ہمیشہ ہمارے مشاہدہ میں آتی رہتی ہے۔ مگر جب ہم انتظام تربیت اطفال پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ اور بچوں کی بدراہی پر بحث کرتے ہیں۔ تو ہم عادۃً یہ بات تسلیم کر لیتے ہیں کہ یہ مجرم اشخاص اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ برتاؤ کرنے میں اخلاقی جرم سے بری ہیں! یہ بات راستی سے اس قدر بعید ہے کہ خانگی ابتری کے ایک بڑے حصہ کی بابت جس کو

عموماً بچوں کی کج روی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ہم والدین کی بدعملی پر الزام لگانے میں پس وپیش نہیں کرتے۔ ہم یہ بات اُن لوگوں کی نسبت نہیں کہتے جو بچوں کے ساتھ زیادہ ہمدردی کرنے والے اور اپنے نفس پر زیادہ قابو رکھنے والے ہیں۔ اور ہم کو امید ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے والوں میں سے اکثر آدمی اس جماعت میں داخل ہوں گے۔ بلکہ ہم عوام الناس کی بابت ایسا کہتے ہیں۔ جو ماں اپنے ننھے بچے کو گھڑی گھڑی اِس وجہ سے خفا ہوکر جھنجھوڑتی ہے کہ وہ دودھ نہیں پیتا۔ اُس سے کس قسم کی اخلاقی تربیت کی توقع کی جاسکتی ہے؟ اور ہم نے ایک ماں کو ایسا کرتے دیکھا ہے۔ جس باپ کی توجہ بچہ کی چیخ سے اس امر کی طرف مائل ہوئی ہے کہ بچہ کی اُنگلی کھڑکی کے کواڑ اور چوکھٹ کے بیچ آکر کُچلی گئی ہے۔ اور وہ بچہ کو۔ اِس مصیبت سے رہائی دینے کے بجائے پیٹنا شروع کرے۔ بھلا ایسا باپ انصاف کا احساس غالباً کس قدر اپنے بچہ کے دل میں ڈال سکتا ہے؟ تاہم اِس بات کی تصدیق کہ ایسے باپ موجود ہیں۔ ہم کو ایک عینی گواہ سے ہوئی ہے۔ یا اس سے بھی زیادہ سخت حالت لو۔ اور اس کی تصدیق بھی بلاواسطہ شہادت سے ہوچکی ہے۔ وہ یہ ہے کہ جس لڑکے کی ران کی ہڈی اُتر گئی ہو۔ اور اُس کو اُٹھاکر گھر میں لائیں تو بید سے اُس کی مزاج پرسی کی جائے۔ اُس کی تربیت کی کیا خاک امید ہوسکتی ہے؟ یہ سچ ہے کہ یہ حد درجے کی مثالیں ہیں۔ یعنی ایسی مثالیں۔ جو نوع انسان میں اُس کو وراثۃً طبیعی میلان کو ظاہر کرتی ہیں۔ جو حیوانات کو اپنی ہی نسل کے کمزوروں اور صدمہ رسیدوں کو ضائع کرنے کی طرف راغب کرتا ہے۔ لیکن یہ مثالیں حد درجے سہی۔ پھر بھی اُن خیالات اور اُس چال چلن کا نمونہ ہیں۔ جو بہت سے گھرانوں میں دیکھا جاتا ہے۔ کون ہے جس نے انّا یا ماں کے ہاتھ سے بچہ کو۔ دق کرنے کی وجہ سے۔ جو غالباً کسی جسمانی تکلیف کا نتیجہ ہے طمانچہ کھاتے ہوئے بارہا نہیں

دیکھا ہے ؟ جب ننھا بچہ گر پڑا ہو - اور ماں اُس کو اٹھاتے وقت سخت طریقہ اور
درشت الفاظ میں یکایک یہ کلمہ زبان پر لائے کہ "ارے احمق - چھوٹے بچے"!
تو کون ہے جس نے اِس بات سے اکثر اوقات اُس زود رنجی کا پتا نہ لگایا ہو - جو آئندہ
کی بے انتہا کِل کِل جھک جھک کی پیشین گوئی کرتی ہے ؟ جس کرخت لہجہ میں باپ
بچوں کو خاموش رہنے کا حکم دیتا ہے - کیا وہ لہجہ اس بات کا ثبوت نہیں - کہ وہ بچوں
کے ساتھ کم ہمدردی رکھتا ہے ؟ کیا دائمی اور لبا اوقات بالکل غیر ضروری روک
ٹوک جو بچوں پر کی جاتی ہے - مثلاً نچلے بیٹھے رہنے کا حکم جس کی تعمیل سخت
اعصابی تکلیف اٹھائے بغیر چونچال بچہ کر نہیں سکتا - یا مثلاً یہ حکم کہ ریل کے
سفر کے وقت کھڑکی سے باہر منہ نکال کر نہ دیکھو - جس کو ذرا سی سمجھ والا بچہ بھی سخت
محرومی سمجھتا ہے - ہم پوچھتے ہیں کیا یہ روک ٹوک اس بات کی علامت نہیں ہے
کہ بچوں کے ساتھ بہت ہی کم ہمدردی برتی جاتی ہے -

بزرگوں کے خصائل اُن کی نسلوں کو وراثۃً پہنچتے ہیں -

سچ یہ ہے کہ اخلاقی تعلیم کی دقتوں کی بنیاد دراصل دو چیزیں ہیں
یعنی یہ دقتیں والدین اور اولاد دونوں کے مشترک عیبوں سے
پیدا ہوتی ہیں - اگر عادات و خصائل کا اباً عن جدٍّ اولاد تک وراثۃً پہنچنا
قدرت کا قانون ہے - جیسا کہ علم حیوانات کے ہر ایک عالم کو معلوم ہے
اور جس کو ہماری روزمرہ کی گفت و گو اور مروجہ ضرب المثلیں[1] تسلیم کرتی ہیں - تو
علی العموم بچوں کے عیب اُن کے والدین کے عیبوں کا آئینہ ہیں -
ہم نے لفظ "علی العموم" کہا ہے - اِس کا سبب یہ ہے کہ بعید اسورتوں کے خط و
خال - جو اولاد تک پہنچتے ہیں - اُن کی وجہ سے نتائج پیچیدہ ہو جاتے ہیں - اسلئے

[1] اُردو میں ایسے موقع پر یہ مثل بولی جاتی ہے - "باپ پر پوت پتا پر گھوڑا - بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا" -
اور عربی میں کہتے ہیں - "الولد سِرٌّ لابیہ" (بیٹا باپ کا بھید ہے) مترجم -

یہ مطابقت خاص امور میں نہیں بلکہ صرف عام امور میں ہوتی ہے۔ اور اگر یہ موروثی
عیب علی العموم موجود رہتے ہیں۔ تو وہ خراب جذبات جن کی روک ٹوک والدین کو
اپنی اولاد میں کرنی پڑتی ہے۔ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ویسے ہی خراب جذبات
خود والدین میں موجود ہیں۔ گو ممکن ہے کہ عوام الناس کی نظروں سے چھپے ہوئے۔
یا شاید دیگر خیالات میں دبے ہوئے ہوں۔ مگر پھر بھی ہوتے ضرور ہیں۔ پس صاف
ظاہر ہے کہ کسی کامل طریقہ تربیت کے عام طور پر رواج پانے کی
امید نہیں ہے۔ کیونکہ والدین ایسے نیک نہیں ہیں جیسے ہونے چاہییں۔
علاوہ بریں۔ اگر ایسے طریقوں کا کہیں وجود ہوتا۔ جن کے ذریعے سے مقصد
مطلوب فوراً پورا ہو سکتا۔ اور ماں باپ میں اس قدر بصیرت۔ ہمدردی اور
تحمل ہوتا کہ وہ ان طریقوں کو معقول طور پر کام میں لا سکتے۔ تو بھی یہ بحث کی جا سکتی ہے
کہ جتنی مدت میں دیگر امور کی اصلاح ہوتی ہے اُس سے جلد انتظام عیال کی
اصلاح کرنے سے کچھ فائدہ نہیں ہے۔ غور تو کرو کہ ہمارا مقصد کیا ہے؟ کیا تعلیم کا
بلا واسطہ مقصد یہی نہیں ہے کہ "بچہ کو زندگی کے کاروبار کے لیے تیار کیا جائے"
یا یوں کہو کہ ایک ایسا باشندۂ شہر پیدا کیا جائے۔ جو نیک چلن بھی ہو۔ اور
دنیا میں اپنے گزارہ کی سبیل بھی نکال سکے۔ اور کیا دنیا میں گزارہ کی سبیل نکالنا (جس
سے ہماری مراد دولت کا حاصل کرنا نہیں۔ بلکہ اُس سرمایہ کا حاصل کرنا ہے جو خاندان
کی پرورش کے لیے ضروری ہے) اس امر پر دلالت نہیں کرتا کہ دنیاوی معاشرت
کے لیے۔ جیسی کہ دنیا کی موجودہ حالت ہے۔ ایک خاص طرح کی قابلیت
پیدا کی جائے؟ اور اگر تعلیم و تربیت کے کسی طریقہ سے "انسانِ کامل" کا نمونہ
پیدا ہو سکتا۔ تو کیا یہ بات مشتبہ نہیں ہے کہ وہ۔ حالت موجودہ کے اعتبار سے
دنیا کے قابل ہوتا یا نہیں؟ برعکس اس کے کیا ہم یہ گمان نہیں کر سکتے کہ ضرورت سے زیادہ

لائق تعلیم۔ قوم کی عام
صلت اور انسانی
رت کی عام حالت کے
افق ہوتی ہے۔

راستی کا احساس اور اعلیٰ چال چلن کا معیار زندگی کو وبال بلکہ محال نہ بنا دیتا؟ اگر شخصی حیثیت سے غور کی جائے۔ تو اس کا نتیجہ خواہ کیسا ہی قابلِ تعریف ہوتا۔ مگر جہاں تک کہ قوم اور نسل کا تعلق ہے۔ کیا وہ نتیجہ آپ اپنی ناکامی کا باعث نہ ہوتا؟ اس خیال کی کافی وجہ موجود ہے کہ قوم میں کیا۔ اور خاندان میں کیا۔ حکومت کی نوعیت بہ حیثیت مجموعی اتنی ہی عمدہ ہوتی ہے جتنی کہ فطرت انسانی کی عام حالت اُس کو عمدہ ہونے کی اجازت دیتی ہے۔ ہم دلیل سے ثابت کر سکتے ہیں کہ پہلی صورت میں اور ایسا ہی دوسری صورت میں۔ لوگوں کی عام خصلت ہی اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ اُن پر کس قسم کی حکومت کی جائے۔ دونوں صورتوں میں یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ "عام خصلت کی اصلاح۔ طریقہ کی اصلاح کی طرف ہدایت کرتی ہے۔ اِس کے علاوہ اگر طریقہ کی اصلاح اُس وقت تک محال ہوتی۔ جب تک کہ پہلے عام خصلت کی اصلاح نہ ہو جائے۔ تو اس سے خرابی پیدا ہوتی نہ کہ بھلائی۔ جس درجہ کی سختی والدین اور معلموں کے ہاتھوں بچے آجکل جھیلتے ہیں ہم خیال کر سکتے ہیں کہ وہ صرف اُس بڑی سختی کے لیے تیاری ہے۔ جس سے اونکو دنیا میں رہتے وقت دوچار ہونا پڑے گا۔ اور اس بات پر بھی زور دیا جا سکتا ہے کہ اگر والدین اور معلموں کے لیے یہ بات ممکن ہوتی کہ وہ کامل انصاف اور پوری ہمدردی سے بچوں کے ساتھ سلوک کریں۔ تو اس سے وہ تکلیفیں اور بھی سخت ہو جاتیں۔ جو آیندہ زندگی میں لوگوں کی خود غرضی کی وجہ سے اُن کو ضرور جھیلنی پڑتی ہیں[۱۵]۔

---

[۱۵] عام مدارس میں لڑکوں کے ساتھ جو سخت برتاؤ کیا جاتا ہے۔ بعض آدمی اس کی تائید میں اسی قسم کا عذر پیش کرتے ہیں۔ اور یہ کہتے ہیں کہ لڑکے مدرسہ میں داخل ہو کر گویا ایک چھوٹی دنیا میں داخل ہوتے ہیں اور اس دنیا کی سختیاں اُن کو اصلی دنیا کی سختیوں کے لیے تیار کرتی ہیں۔ یہ بات ضرور ماننی چاہیے کہ یہ عذر کسی قدر قوت رکھتا ہے۔ مگر یہ بہت ناکافی عذر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ خانگی تعلیم اور مدرسہ کی تعلیم زمانہ بلوغ کی تعلیم

ان مذکورہ بالا پر ایک اعتراض اور اس کا جواب۔

مگر کوئی شخص یہ سوال کر سکتا ہے کہ مرد کیا اس بیان سے ایسی باتیں ثابت نہیں ہوتیں۔ جن کی ضرورت نہیں ہے ؟ اگر اخلاقی تعلیم کا کوئی طریقہ بچوں کو ایسا نہیں بنا سکتا جیسا کہ اُن کو ہونا چاہیے۔ اگر کوئی ایسا طریقہ موجود ہو۔ جو اُن کو ایسا بنا سکے تو بھی موجودہ والدین اس قدر ناقص ہیں کہ اُس کو عمل میں نہیں لا سکتے۔ اور اگر ایسے طریقہ کو کامیابی کے ساتھ عمل میں لا سکیں۔ تو بھی اُس کے نتائج قوم کی موجودہ حالت سے سخت ناموافق ہوں گے تو کیا اس کا یہی نتیجہ نہیں ہے کہ طریقہ مروجہ کی اصلاح نہ تو ممکن ہے اور نہ ضروری ؟ نہیں۔ بلکہ صرف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خانگی انتظام کی اصلاح دوسری اصلاحوں کے قدم بہ قدم چلنی چاہیے۔ صرف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تربیت کے طریقوں میں۔ بجز اس کے کہ اصلاح بہ تدریج کی جاوے۔ نہ تو اصلاح ہو سکتی ہے اور نہ ہونی چاہیے۔ صرف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بجز دراستی۔ عملی حیثیت سے فطرت انسانی کی موجودہ حالت۔ یعنی اولاد و والدین اور تمام قوم کے عیوب کی یقیناً تابع رہے گی اور زیادہ عمدہ طور پر صرف اُس وقت پوری ہو سکے گی۔ جب کہ عام خصلت بہتر ہو جائے۔

اُسی بیان پر ایک اور اعتراض اور اُس کا جواب

ہمارا معترض یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ دو پھر کم از کم یہ تو صاف ظاہر ہے کہ تربیت خاندان

بقیہ نوٹ صفحہ ۱۷۳۔ کی نسبت اگرچہ بہت بہتر نہیں ہونی چاہیئے۔ پھر بھی کسی قدر بہتر تو ہونی چاہیئے۔ مگر اطن۔ وون چیسٹر ہیرو وغیرہ مدرسوں میں جس تعلیم سے لڑکوں کو پالا پڑتا ہے۔ وہ تعلیم زمانہ جوانی کی نسبت زیادہ خراب ہے۔ بلکہ زیادہ نامصدقانہ اور بے دردانہ ہے۔ ہمارے عام مدارس کی تعلیم انسانی ترقی میں ممد و معاون ہونے کے بجائے۔ جیسا کہ ہر قسم کی تعلیم کو ہونا چاہیئے۔ لڑکوں کی ظالمانہ طرز حکومت آزادانہ تعلقات کا عادی بنا دیتی ہے جو وحشیانہ طاقت سے منضبط رہتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے اُس تعلیم کا میلان اس امر کی طرف ہے کہ قوم کی جو حالت موجودہ ہے۔ اُس سے ادنیٰ درجہ کی حالت کے لیے لڑکوں کو تیار کیا جائے۔ اور چونکہ ہمارے واضعان قوانین کی جماعت خاص کر اُن لوگوں میں سے بھرتی کی جاتی ہے۔ جنھوں نے ایسے ہی مدرسوں میں تعلیم پائی ہے۔ اس لیے یہ وحشیانہ اثر قومی ترقی میں سد راہ ہوتا ہے۔ مصنف۔

کا کوئی کامل معیار قایم کرنا صریحاً بے فائدہ ہے۔ جو طریقے زمانہ کی رفتار سے آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ محنت اُٹھا کر اُن کی تکمیل کرنے اور لوگوں کو اُن کی طرف رغبت دلانے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا" ہم اس اعتراض کی بھی مخالفت کرتے ہیں۔ جس طرح ملکی حکومتیں۔ گو خالص راستی۔ سرِ دست نا ممکن العمل ہو۔ اس بات کا جاننا کہ "حق کیا ہے" ؟ اس لیے ضروری ہے کہ جو تغیرات واقع ہوں وہ حق کی طرف مائل ہوں نہ کہ حق سے منحرف ہوں۔ اسی طرح خانگی حکومت میں کامل نمونہ قائم کرنا چاہیے تاکہ رفتہ رفتہ اِس نمونہ کے قریب قریب پہنچ سکیں۔ ہم کو ایسے کامل نمونہ کے قایم کرنے سے خراب نتائج کا اندیشہ نہیں کرنا چاہیے۔ قدیم رسوم و آئین کو برقرار رکھنے کا طبعی میلان نسل انسانی میں اس قدر قوی ہے کہ کسی شئے میں بہت جلد تغیر واقع ہونے کو روکتا ہے۔ سب کاموں کا انتظام کچھ اسی قسم کا ہے کہ جب تک لوگ آہستہ آہستہ اعلیٰ اعتقاد کی سطح تک نہ پہنچ جائیں۔ وہ اُس کو قبول نہیں کر سکتے۔ گو یہ ممکن ہے کہ برائے نام اُس کو تسلیم کر لیں مگر حقیقتاً تسلیم نہیں کر سکتے۔ اور جب کوئی حقیقت مسلم قرار پا جاتی ہے۔ تو بھی اُس پر عمل کرنے کی مزاحمتیں اس قدر سخت ہوتی ہیں کہ وہ معیان نوع انسانی بلکہ حکما کے صبر سے بھی تجاوز کر جاتی ہیں۔ پس ہم کو یقین ہے کہ اولاد کے باقاعدہ انتظام کی راہ میں جو دقتیں حائل ہیں۔ اُن کی وجہ سے اس پر عمل کرنے میں ہمیشہ پوری رکاوٹ پیدا ہوگی۔

اس باب میں اخلاقی تعلیم کے عام اصول اور تربیت اولاد کے صحیح طریقے بیان کیے جائیں گے۔

اِن تمہیدی بیانات کے بعد اب ہم کو اخلاقی تعلیم کے صحیح مقاصد و طرق پر غور کرنی چاہیے۔ ہم اصول عامہ کے تصفیہ کے لیے چند صفحے مخصوص کریں گے اور ناظرین سے التماس ہے کہ صبر و تحمل سے اُن کا ملاحظہ کریں۔ اس کے بعد ہمارا مقصد یہ ہوگا کہ تمثیلوں سے اس امر کی توضیح کریں کہ انتظام اولاد میں جو مشکلیں ہر گھڑی پیش آتی ہیں ان میں والدین کے برتاؤ کے صحیح طریقے کیا ہونے چاہئیں۔

قدرتی طریقہ تربیت کی چند مثالیں

جب کوئی بچہ گر پڑتا ہے۔ یا میز سے سر ٹکرا لیتا ہے۔ تو اُس کو تکلیف ہوتی ہے جس کو یاد کر کے وہ اور زیادہ محتاط رہنا چاہتا ہے۔ اور بار بار ایسے تجربہ کرنے سے آخر کار اس کو ایسی تربیت ہوتی ہے کہ اپنی حرکتوں کو مناسب طور پر قابو میں رکھے۔ اگر وہ آتش دان کی گرم سیلاخوں کو پکڑے یا شمع کے شعلہ میں اپنا ہاتھ گھسا دے یا اپنی جلد کے کسی حصے پر کھولتا پانی گرا دے۔ تو جلن یا آبلہ جو اس سے پیدا ہوتا ہے ایسا سبق ہے۔ جس کو وہ آسانی سے نہیں بھول سکتا۔ اسی قسم کے ایک دو حادثوں کا ایسا گہرا اثر ہوتا ہے۔ کہ پھر کوئی ترغیب اُس کو اس طرف مائل نہیں کر سکتی کہ اپنی جسمانی ساخت کے قوانین سے اس طرح غفلت کرے۔

اب دیکھو۔ ان صورتوں میں اخلاقی تربیت کے سچے خیال اور عمل کو نہایت آسان طریق سے قدرت نے ہمارے سامنے واضح طور پر بیان کر دیا ہے۔ یہ ایسا خیال اور عمل ہے۔ جو سرسری نظر میں اُس خیال اور عمل سے جس کو عام لوگوں نے قبول کیا ہے خواہ کیسا ہی مشابہ معلوم ہو۔ مگر عندالامتحان ہم کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ معمولی خیال و عمل سے بہت کچھ مختلف ہے۔

جسمانی حرکتوں کو بھی حق یا ناحق کی ذیل میں داخل کر سکتے ہیں۔ اور اس بات کی دلیل۔

سب سے پہلے اس بات پر غور کرو کہ جسمانی صدمے اور اُن کی سزائیں کیا ہیں۔ وہی بداعمالی اور اُس کے نتائج تو ہیں جن کو نہایت ہی سیدھی سادی صورتوں میں ظاہر کیا گیا ہے۔ اگرچہ حق اور ناحق ایسے الفاظ ہیں جن کا اطلاق۔ عام معنوں کے لحاظ سے شاذ و نادر ہی ایسے افعال پر ہوتا ہے۔ جن سے صرف جسمانی اثرات براہ راست پیدا ہوتے ہیں۔ تاہم جو شخص اس معاملہ پر غور کرے گا۔ اُس کو معلوم ہو جائیگا کہ جس طرح دیگر افعال کو ان دونوں حدوں میں داخل کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے افعال کو بھی ضرور داخل کرنا چاہیئے۔ علم اخلاق کے تمام خیالی منصوبے۔ خواہ کسی تقدیر پر قدم آگے بڑھائیں۔ اس بات پر متفق ہیں کہ وہ جس چال چلن کے

مجموعی نتائج - قریب و بعید - مفید ہوں - وہ چال چلن اچھا ہے - اور جس چال چلن کے مجموعی نتائج - قریب و بعید مضر ہوں وہ چال چلن بُرا ہے " جس آخری معیار پر سب لوگ چال چلن کو پرکھتے ہیں - وہ یہی خوشی یا غم ہے - جو اُس سے حاصل ہوتا ہے - ہم شراب خواری کو اس وجہ سے "ناحق" کہتے ہیں کہ اِس سے جسمانی انحطاط ہوتا ہے اور اخلاقی خرابیاں بھی ساتھ لگی ہوئی ہیں جو شراب خوار اور اس کے متعلقین کو پیش آتی ہیں - اگر سرقہ - مال چرانے والے اور کھونے والے دونوں کی خوشی کا باعث ہوتا تو ہم اُس کو گناہوں کی فہرست میں نہ پاتے اگر یہ بات ہماری سمجھ میں آسکتی کہ مہربانی کے کاموں سے لوگوں کی تکلیفیں بڑھتی ہیں تو ہم اُن کاموں کو قابل الزام ٹھیراتے - یعنی اُن کو مہربانی کے کام نہ سمجھتے - جس طرح افراد کے کاموں کی بابت پہلے سے یہ سوچ کر رائے قایم کی جاتی ہے - کہ اُن کا نتیجہ کیا ہوگا - آیا اُن سے لوگوں کی خوشی کو ترقی ہوگی یا رنج کو - اسی طرح قوانین پارلیمنٹ ملکی تحریکات - اور حُب انسانی کے متعلق جوش پھیلانے کی بابت بھی رائے قایم کی جاتی ہے - اور یہ بات صرف کسی اخبار کے پہلے لیڈر (مضمون) کے پڑھنے یا مجلسی معاملات پر کسی گفت و گو کے سننے سے معلوم ہو سکتی ہے - اور اگر اُن تمام خیالات کی چھان بین کرنے سے - جو دوم درجے کے ہیں اور جن پر کچھ اضافہ کیا گیا ہے - ہم کو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہی خوشی اور رنج حق اور ناحق کے معیار ہیں - تو جسمانی حرکتوں کو بھی - مفید یا مضر نتائج کے اعتبار سے - جو اُن سے پیدا ہوتے ہیں حق یا ناحق کی ذیل میں شامل کرنے سے انکار نہیں کر سکتے -

جسمانی خطاؤں پر قدرتی سزا ضرور ملتی ہے -

دوسرے اِس بات پر غور کرو کہ وہ کس قسم کی سزائیں ہیں جو اِن جسمانی گناہوں کو روکتی ہیں - ہم کسی بہتر لفظ کے نہ ملنے کی وجہ سے اُن کو سزائیں کہتے ہیں - کیوں کہ لفظی معنی کے اعتبار سے وہ سزائیں نہیں ہیں - یہ مصنوعی اور غیر ضروری ایذا رسانی

نہیں ہے بلکہ اُن افعال کی محض خیر خواہانہ روک ٹوک ہے - جو فی الحقیقت جسمانی آرام و آسایش کے مخالف ہیں - ایسی روک ٹوک کہ اگر وہ نہ ہو تو جسمانی صدمے جلد زندگی کا خاتمہ کر دیں - اِن سزاؤں کی خصوصیت - اگر اُن کو سزائیں کہنا ضروری ہی یہی ہے کہ وہ صرف اٹل نتیجے اُن کاموں کے ہیں - جن کے بعد وہ واقع ہوتی ہیں یہ سزائیں اور کچھ نہیں - وہی ناگزیر فراحمتیں ہیں جو بچے کے افعال کا نتیجہ ہیں -

قدرتی سزا ہمیشہ جرم کے متناسب ہوتی ہے

علاوہ بریں یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ یہ تکلیف وہ مزاحمتیں جرم کے متناسب ہوتی ہیں - خفیف حادثہ سے خفیف اور سخت حادثہ سے سخت تکلیف ہوتی ہے - یہ قانون نہیں ہے - کہ مثلاً جو لڑکا دروازہ کی سیڑھی پر سے گر جائے - اُس کو ضروری مقدار سے زیادہ تکلیف - اِس لیے اُٹھانی پڑی کہ ضروری تکلیف جس قدر محتاط بنا سکتی ہے - وہ اُس سے زیادہ محتاط ہو جائے بلکہ اُس کو اس بات کا علم حاصل کرنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے کہ اپنے روزانہ تجربے سے چھوٹی بڑی غلطیوں کو معلوم کر کے اُن کے موافق اپنا برتاؤ اختیار کرے -

قدرتی سزاؤں کی بعض اور خصوصیتیں

پھر آخر میں اِس بات پر بھی غور کرو کہ - یہ قدرتی سزائیں جو بچہ کے بیجا کاموں کا نتیجہ ہیں - مستقل - بلا واسطہ اور یقینی ہیں - اور اُن سے چھٹکارا نہیں ہو سکتا - یہاں زجر و توبیخ کا کچھ کام نہیں - بلکہ چپ چاپ سختی سے کام پورا کیا جاتا ہے اگر بچہ اپنی اُنگلی میں سوئی چبھوئے تو نتیجہ یہ ہے اُس کو تکلیف ہوتی ہے اگر دوبارہ ایسا کرتا ہے تو پھر وہی نتیجہ ہوتا ہے - اور اسی طرح ہمیشہ ہوتا رہتا ہے - بچہ موجودات غیر ذی روح کے ساتھ اپنے تمام معاملات میں یہ بات معلوم کرتا ہے کہ وہ اپنی خاصیت سے منحرف نہیں ہوتے - کوئی عذر نہیں سنتے - اور اُن کی داد ہے نہ فریاد - اِس سخت - مگر فیضانہ - تربیت کو پہچان کر بچہ نہایت ہی ہوشیار ہو جاتا ہے کہ آئندہ خلاف ورزی نہ کرے -

قدرت کا طریقہ تربیت بچوں اور بڑوں سب کے ساتھ ایکساں ہے

جب ہم اس بات کو یاد کرتے ہیں کہ یہ عام اصول اسی طرح عمر بھر قایم رہتے ہیں۔ جس طرح تمام بچپن کے زمانہ میں۔ تو اُن کی وقعت اور بھی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ قدرتی نتایج کا علم جو تجربہ سے حاصل ہوتا ہے۔ یہی وہ علم ہے جو مردوں اور عورتوں کو کجروی سے باز رکھتا ہے۔ خانگی تعلیم ختم ہونے کے بعد جب والدین اور معلم روک ٹوک کرنے کے لیے نہیں ہوتے کہ "یہ کام نہ کرو۔ وہ کام نہ کرو" اُس وقت وہی تربیت کام دیتی ہے جس سے کم سن بچوں کو اپنے نفس کی آپ ہدایت کرنا سکھایا جاتا ہے۔ اگر وہ نوجوان جو زندگی کے کاروبار میں قدم رکھتا ہے۔ اپنے وقت کو سستی میں گنوائے اور فرایض مفوضہ کو کاہلی یا بے ہنری سے انجام دے۔ تو رفتہ رفتہ قدرتی سزا مل جاتی ہے۔ یعنی اُس کو آزاد کر دیا جاتا ہے۔ اور نسبتہً مفلسی کی مصیبتیں کچھ عرصہ تک جھیلنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جو شخص وقت کا پابند نہیں ہوتا اور اپنے کاروبار اور تفریح کے مقررہ وقت ہمیشہ گنواتا ہے۔ تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو بے آرامی۔ نقصان اور ناکامی ہمیشہ نصیب ہوتی ہے۔ جو سوداگر منافع کی شرح بہت زیادہ لگاتا ہے وہ اپنے گاہکوں کو کھوتا ہے اور اس کا کام اس طرح میں رُک جاتا ہے۔ طبابت کی کساد بازاری غافل ڈاکٹر کو سکھاتی ہے کہ اپنے مریضوں کے علاج میں زیادہ محنت اُٹھائے۔ جو لین دین کرنے والا جھٹ پٹ لوگوں کا اعتبار کر لیتا ہے اور جو سوداگر بہت زیادہ نفع کی پوری امید میں روپیہ لگاتا ہے۔ یہ دونوں اُن دقتوں کی وجہ سے جو شتاب زدگی کا نتیجہ ہیں۔ اس امر کی ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ اپنے کاروبار میں زیادہ محتاط رہیں۔ ہر ایک باشندۂ شہر کو زندگی بھر میں ایسے ہی واقعات پیش آتے ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ "دودھ کا جلا چھاچھ کو پھونک پھونک پیتا ہے" اس مثل سے جو بسا اوقات ایسی حالتوں میں خوب چسپاں ہوتی ہے صرف اتنی ہی بات معلوم نہیں ہوتی کہ یہ معاشرتی تربیت۔ اور بچوں کی ابتدائی

تربیت جو قدرت کرتی ہے۔ اِن دونوں تربیتوں کی باہمی مشابہت کو سب نے تسلیم کرلیا ہے۔ بلکہ کنایتہً اِس بات کا بھی یقین حاصل ہوتا ہے کہ یہی تربیت سب سے زیادہ موثر ہے۔ نہیں۔ حقیقت میں یہ یقین کنایتہً نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر ہے یہ تو صراحتہً بیان کردیا گیا ہے۔ ہر شخص نے لوگوں کو یہ کہتے سنا ہوگا کہ فلاں خراب یا احمقانہ طریق عمل۔ جس کو پہلے سے ہم نے اختیار کر رکھا تھا۔ بہت کچھ نقصان اُٹھانے کے بعد ہم کو اُس کے ترک کرنے کی ترغیب ہوئی تھی۔ کسی مسرف یا منصوبہ باز کے افعال پر نکتہ چینی کرتے وقت ہر شخص نے یہ بات سنی ہوگی کہ " ابھی اس کو نصیحت کرنی فضول ہے۔ خود ٹھوکریں کھاکر سنبھل جائے گا۔ کوئی دوسری تدبیر اس پر کارگر نہ ہوگی یعنی ناگوار سزاؤں کی تکلیف بھگتنے کے سوا دوسری تدبیر کام نہیں دے گی" اور اس بات کا مزید ثبوت درکار ہو کہ ' قدرتی مزاحمت نہ صرف سب سے زیادہ کارگر سزا ہے۔ بلکہ انسان کی تجویز کردہ سزا اُس کی جگہہ کام ہی نہیں دے سکتی' تو یہ مزید ثبوت ہمارے سزا کے مختلف طریقوں کی مشہور ناکامیابی سے مل سکتا ہے مجرموں کی اصلاح کے بہت سے جرایم طریقے تجویز کیے گیے ہیں اور قانوناً اُن کی تعمیل کرائی جاتی ہے۔ ان میں سے کسی طریقہ نے اپنے حامیوں کی توقعات کو پورا نہیں کیا۔ مصنوعی سزائیں اصلاح میں قاصر رہی ہیں۔ بلکہ بہت سی حالتوں میں ان سزاؤں سے جرایم میں اور زیادتی ہوگئی ہے۔ مجرموں کی اصلاح کامیابی کے ساتھ صرف اُن ہی تادیب خانوں میں ہوسکتی ہے جو بنج کے طور پر قایم کیے گیے ہیں اور جن کا دستورالعمل قدرت کے طریقہ کے قریب قریب پہنچتا ہے۔ جہاں جرم کی قدرتی سزا دی جاتی ہے۔ اور اس سے زیادہ کچھہ نہیں کیا جاتا۔ وہ سزا یہی ہے کہ مجرم کے فعل کی آزادی کو۔ جہاں تک کہ نوع انسان کی حفاظت کے لیے ضروری ہو۔ کم کیا جائے۔ اور جب تک وہ قید میں

رہے۔ ایسا بندوبست کیا جائے کہ وہ اپنی کمائی سے گزارہ کرے

پس دو باتیں ہم کو معلوم ہوئیں ایک یہ کہ جس تربیت سے چھوٹے بچوں کو اپنی حرکتوں کا باقاعدہ رکھنا سکھایا جاتا ہے۔ یہ وہی تربیت تو ہے جس سے بڑے آدمیوں کو قابو میں رکھا جاتا۔ اور کم وبیش اُن کی اصلاح کی جاتی ہے۔ اور دوسری یہ کہ بدترین نوجوانوں کی اصلاح کے لیے انسانی مجوزہ تربیت۔ جب کبھی خدائی قانون سے منحرف ہوتی ہے۔ ناکام یاب رہتی ہے۔ اور جوں جوں اس کے قریب پہنچتی جاتی ہے۔ کام یاب ہونے لگتی ہے۔

اخلاقی تعلیم کا گرہی ہے کہ قدرتی طریقہ کی پیروی کی جائے۔

کیا اخلاقی تعلیم کا ہدایتی اصول ہم کو یہاں نہیں مل گیا ہے؟ کیا ہم کو یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیئے؟ کہ جو طریقہ۔ اپنے نتائج کے اعتبار سے۔ شیرخواری اور بلوغ کے زمانہ میں بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ وہ تمام زمانہ طفولیت میں بھی اسی قدر مفید ہوگا؟ کیا کوئی شخص یقین کرسکتا ہے کہ جس طریقہ سے زندگی کے پہلے اور پچھلے حصہ میں بہت عمدگی سے کام نکلتا ہے۔ زندگی کے درمیانی حصہ میں اس سے کام نہیں چلے گا؟ کیا یہ بات صاف ظاہر نہیں ہے کہ "قدرت کے کارکن اور ترجمان" ہونے کی حیثیت سے اس امر کا دیکھنا والدین کا فرض ہے کہ اُن کے بچے عادۃً اپنے چال چلن کے حقیقی نتائج۔ یعنی قدرتی سزاؤں کا تجربہ حاصل کریں۔ اور والدین نہ تو ان سزاؤں کو ٹالیں۔ اور نہ اُن کو سخت بنائیں۔ اور نہ مصنوعی سزاؤں کو ان کی جگہ رکھیں؟ کوئی غیر متعصب پڑھنے والا اس بات سے اتفاق کرنے میں پس وپیش نہیں کرے گا۔

بیان مذکورہ بالا پر ایک اعتراض اور اُس کا جواب

مگر غالباً بہت سے آدمی یہ حجت پیش کریں گے کہ۔ اکثر والدین پہلے ہی سے ایسا کرتے ہیں یعنی جو سزائیں وہ دیتے ہیں۔ اکثر حالتوں میں وہ سزائیں بدچلنی کے سچے نتیجے ہوتے ہیں۔ مثلاً والدین کا غصہ جو درشت الفاظ وافعال میں ظاہر ہوتا ہے

بچہ کے قصور کا نتیجہ ہے - اور اُس جسمانی یا اخلاقی تکلیف سے - جو بچہ کو جھیلنی پڑتی
ہے - وہ اپنی بدچلنی کی قدرتی سزا بھگت لیتا ہے" اِس بیان میں جہاں بہت
کچھ غلطی ہے - کسی قدر سچ بھی ہے - اِس میں کلام نہیں کہ ماں باپ کی ناراضی بچوں
کے قصور کا سچا نتیجہ ہے - اور یہ کہ اُن کی ناراضی کا اظہار اُس قصور کی باضابطہ روک
ہے - بچوں کے ستانے سے جب ماں باپ کو غصہ آتا ہے - تو وہ اُن کو گھُڑکتے ہیں
دھمکاتے ہیں - اور پیٹتے ہیں - بے شک یہ ایسی سزائیں ہیں جو بچوں کے قصوروں پر
ماں باپ کو دینی پڑتی ہیں - اور اسی وجہ سے اُن سزاؤں کو بچوں کی بداعمالیوں کی
قدرتی روک ٹوک سمجھنا چاہیے - ہم یہ بھی نہیں کہ سکتے کہ برتاؤ کے یہ طریقے نسبتہً
صحیح نہیں ہیں - صحیح اِس معنی میں کہ وہ طریقے اُن لوگوں کے بچوں سے
متعلق ہیں - جو اپنے نفس پر اچھی طرح قابو نہیں رکھتے - اور جن کے بچے خودسر ہیں
اور صحیح اس معنی میں بھی - کہ وہ اُس قوم کی حالت سے متعلق ہیں جس میں
زیادہ تر ایسے بڑے بوڑھے شامل ہیں - جو اپنے نفس پر اچھی طرح قابو نہیں رکھ سکتے -
تعلیمی طریقے - جیسا کہ پہلے اشارۃً بیان ہو چکا ہے - ملکی اور دیگر قوانین کی طرح بالعموم
اسی قدر عمدہ ہوتے ہیں جس قدر کہ فطرت انسانی اُن کو عمدہ ہونے کی اجازت دیتی
ہے - وحشی والدین کے وحشی بچوں کی روک تھام - غالباً وحشیانہ طریقوں ہی سے
ہوسکتی ہے جو اُن کے والدین فطرۃً استعمال کرتے ہیں - اور اُس وحشی قوم سے
معاشرت کرنے کے لیے جس سے عن قریب بچوں کو سابقہ پڑنے والا ہے -
شاید سب سے بہتر تیاری یہی ہے کہ وہ اِن وحشیانہ طریقوں (والدین کی سخت گیری) کی
برداشت کریں - برعکس اس کے شائستہ قوم کے شائستہ آدمی - اپنی ناراضی کا اظہار
فطرۃً ایسے طریقوں سے کریں گے - جو نسبتہً کم سخت ہیں - یعنی فطرۃً زیادہ نرم
تدبیروں سے کام لیں گے - ایسی تدبیریں جو اُن کے نیک طینت بچوں کیلیے کافی ہیں - پس

یہ بات صحیح ہے کہ جہاں تک والدین کے اظہار تاثر کا تعلق ہے۔ قدرتی سزا کے اصول کی پیروی ہمیشہ کم و بیش کی جاتی ہے۔ خانگی انتظام کا طریقہ اپنی صحیح شکل کی طرف مایل ہوتا جاتا ہے۔

اخلاقی تربیت کے متعلق دو ضروری باتیں۔

مگر اب دو ضروری باتوں پر غور کرو۔ پہلی بات یہ ہے کہ جب فوری انقلاب ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہماری تعلیمی حالت میں ہو رہا ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ قدیم و جدید خیالوں اور قدیم و جدید عملوں میں برابر جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ تو یہ بات قرین قیاس ہے کہ مروجہ تعلیمی طریقے۔ مقتضائے وقت سے بہت کچھ ناموافق ہوں۔ بہتیرے ماں باپ تو۔ اُن اصول کی پیروی کر کے۔ جو اسی زمانہ کے لیے موزون تھے۔ جب کہ وہ تجویز کیے گیے تھے۔ بچوں کو ایسی سزائیں دیتے ہیں۔ جن سے خود ماں باپ کے دل کو تکلیف پہنچتی ہے اور اُن کی روک ٹوک ایسے طریقے سے کرتے ہیں جو فطرت کے خلاف ہے۔ اور بعض والدین اس امید میں کہ اصلاح فوراً ہو جائے مقابل کی انتہائی حد کی طرف دوڑ جاتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جو تربیت خاص کر قابل قدر ہے۔ وہ یہ نہیں ہے کہ "بچے والدین کی رضامندی یا نارضامندی کا تجربہ حاصل کریں"، بلکہ یہ ہے کہ "والدین کی رائے یا مداخلت کی عدم موجودگی میں چال چلن کے جو نتیجے آخرکار پیدا ہوں گے۔ اُن کا تجربہ حاصل کریں" درحقیقت مفید اور بکارآمد سزائیں وہ نہیں ہیں۔ جو والدین بچوں کو دیتے ہیں۔ جب کہ وہ قدرت کے کارکن بن کر اس کام کو اپنے ذمہ لیتے ہیں۔ بلکہ وہی سزائیں حقیقتہً مفید اور بکارآمد ہیں جو قدرت خود دیتی ہے۔ ہم اس فرق کو چند تمثیلوں سے واضح کرنے کی کوشش کریں گے اور ان تمثیلوں سے۔ جہاں یہ ظاہر ہوگا۔ کہ لفظ "قدرتی سزا" سے جو مصنوعی سزا کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے۔ ہماری کیا مراد ہے۔ چند عملی ہدایتیں بھی حاصل ہو جائیں گی۔

اخلاقی تربیت کی چند عام مثالیں۔

(۱) پہلی مثال۔

ہر ایک خاندان میں جہاں چھوٹے بچے ہوتے ہیں۔ روزمرہ ایسی حالتیں پیش آتی ہیں۔ جن کو مائیں اور لوگ "چیزیں بکھیرنا" کہتے ہیں۔ بچہ اپنے کھلونوں کے صندوق میں سے کھلونے باہر نکال کر فرش پر چاروں طرف پھیلا دیتا ہے۔ یا مٹھی بھر پھول جو صبح کی ہواخوری کے وقت جمع کر کے بچہ گھر لاتا ہے۔ تھوڑی دیر میں وہی پھول۔ میزوں اور کرسیوں پر بکھرے ہوئے دیکھے جاتے ہیں۔ یا ایک چھوٹی لڑکی۔ گڑیا کے کپڑے بناتے وقت دھجیاں بکھیر کر کمرہ کو بدنما بنا دیتی ہے۔ اکثر حالتوں میں اس بے ترتیبی کو درست کرنے کی مصیبت جس شخص کو اُٹھانی چاہیئے۔ اُس کے سوا کسی دوسرے شخص کو اُٹھانی پڑتی ہے۔ اگر دایہ خانہ میں یہ صورت پیش آئی ہے تو خود اناگری پڑی چیزوں کو سمیٹتی ہے اور "چھوٹے موذیوں" پر بڑبڑاتی جاتی ہے۔ اور اگر مکان کے نیچے کے حصہ میں ایسا ہوا ہے۔ تو یہ کام عموماً یا تو کسی بڑے بھائی بہن کے سر پڑتا ہے۔ یا گھر کی ماما کے۔ اور قصور وار کو دھمکی کے سوا اور کوئی سزا نہیں دی جاتی۔ مگر بہت سے والدین ایسے عقلمند ہیں کہ ایسی سیدھی سادی حالت میں تھوڑی بہت معقولیت سے باقاعدہ طریقہ کی پیروی کرتے ہیں۔ یعنی اُن کھلونوں یا دھجیوں کو بچوں ہی سے جمع کراتے ہیں چیزوں کو ترتیب وار رکھنے کی محنت۔ اُن کو "تتر بتر" کرنے کی سزا ہے۔ ہر ایک سوداگر کو اپنے دفتر میں۔ ہر ایک بیوی کو اپنے گھرانے میں۔ روزمرہ اس بات کا تجربہ ہوتا ہے۔ اگر تعلیم کا مقصد "زندگی کے کاروبار کے لیے تیار کرنا" ہے۔ تو ہر ایک بچہ کو بھی شروع سے روزمرہ اس بات کا تجربہ حاصل کرنا چاہیے۔ اگر قدرتی سزا پر بچہ سرکشی سے پیش آئے (یہ صورت شاید ایسی جگہ ظہور میں آئے۔ جہاں پہلے سے اخلاقی تعلیم کا خراب نتیجہ اختیار کیا گیا ہو) تو مناسب طریقہ یہ ہے کہ بچہ کو انتہائی سزا بھگتنے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ جو اُس کی نافرمانی کا نتیجہ ہے۔ جن چیزوں کو بچہ نے تتر بتر کیا ہے۔ اگر وہ اُن کے اُٹھانے یا ترتیب وار رکھنے سے انکار یا غفلت کرے۔ اور اس وجہ سے اُس کام کی محنت

کسی دوسرے شخص کو اُٹھانی پڑے۔ تو آئندہ موقعوں پر بچہ کو اس تکلیف دینے کے وسیلہ ہی سے محروم کر دینا چاہیے۔ جب وہ دوبارہ کھلونوں کا صندوق مانگے تو ماں کو یہ جواب دینا چاہیے کہ "پچھلی مرتبہ تم کو کھلونے دیئے گئے تھے تو تم نے اُن کو فرش پر چھوڑ دیا تھا۔ اور جین کو وہ کھلونے اُٹھانے پڑے تھے۔ جین کو بہت کام ہیں وہ روز روز ان چیزوں کو نہیں اُٹھا سکتی جن کو تم اِدھر اُدھر ڈال دیتے ہو۔ اور میں خود یہ کام نہیں کر سکتی۔ پس چونکہ تم اپنے کھلونوں سے کام لینے کے بعد اُن کو اُٹھا کر نہیں رکھتے ہو۔ اس لیے میں تم کو کھلونے نہیں دے سکتی" یہ صریحاً قدرتی سزا ہے۔ نہ کم نہ زیادہ۔ اور بچہ بھی اس کو ایسا ہی سمجھے گا۔ سزا بھی ایسے وقت پر دی گئی ہے جب کہ اُس کا اثر بہت زیادہ ہو گا۔ ایک نئی خواہش جو بچہ کے دل میں پیدا ہوئی تھی۔ اُس سے ایسے وقت مایوسی ہو گئی۔ جب کہ اُس کے پورے ہونے کی توقع تھی۔ اور اس طرح جو گہرا نقش دل پر پیدا ہو گا۔ بچہ کے آئندہ چال چلن پر اس کا اثر ہوئے بغیر نہ رہے گا۔ اور اگر استقلال کے ساتھ بار بار ایسا ہی کیا جائے تو اس سے حتی الامکان قصور کی اصلاح ضرور ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ یہ فائدہ ہو گا کہ اس طریقہ سے بچہ کو بچپن ہی میں یہ سبق مل جائے گا کہ " اس دنیا کی خوشیاں محنت ہی سے ٹھیک ٹھیک حاصل ہوتی ہیں " اور یہ سبق جتنا جلد سیکھا جائے اتنا ہی بہتر ہے۔

(۲) دوسری مثال

ایک اور مثال لو۔ چند ہی روز کا ذکر ہے کہ ایک لڑکی کی ماں اس کو ہمیشہ زجر و ملامت کیا کرتی تھی۔ اور ہم کو بارہا اُس کے سننے کا اتفاق ہوتا تھا۔ یہ لڑکی جس کا نام کانسٹنس تھا۔ روزانہ ہوا خوری کے لیے شاید ہی کبھی وقت پر تیار ہوئی ہو۔ چونکہ کانسٹنس کے مزاج میں سرگرمی تھی اور جو کام اُس کے آگے ہوتا تھا۔ اُس میں ہمہ تن مصروف ہو جاتی تھی۔ اس لیے اُس کو یہ خیال نہیں آتا تھا کہ اپنی چیزوں کو سمیٹ کر کے یہاں تک کہ اور بچے ہوا خوری کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ اُستانی اور دوسرے

بچوں کو تقریباً ہمیشہ انتظار کرنا پڑتا تھا - اور ماں تقریباً ہمیشہ اُس کو زجر و ملامت کیا کرتی تھی
اگرچہ اس طریقہ میں ہمیشہ ناکامیابی ہوئی تھی - مگر ماں کو یہ خیال کبھی نہیں آتا تھا - کہ
کانسٹنس کو قدرتی سزا کا تجربہ کرائے - بلکہ درحقیقت جب کبھی اُس کو یہ بات
سمجھائی جاتی تھی - تو بھی اِس سزا کا امتحان کرنا نہیں چاہتی تھی - وقت پر تیار نہ ہونے
سے دنیا میں کوئی نہ کوئی فائدہ ہاتھ سے جاتا رہتا ہے - جو بہ صورت
دیگر حاصل ہو جاتا - مثلاً ریل چلی گئی - آگ بوٹ لنگر اُٹھا رہا ہے - بازار میں سب سے
عمدہ چیزیں فروخت ہو گئیں - یا محفل سرود کی اچھی اچھی نشستیں پُر ہو گئیں - ہر شخص ایسی
حالتوں میں جو ہمیشہ پیش آتی رہتی ہیں یہ بات دیکھ سکتا ہے کہ آئندہ کی محرومی ہی
لوگوں کو دیر کرنے سے روکتی ہے - کیا اس کا نتیجہ صاف ظاہر نہیں ہے؟
کیا ایسا ہی نہیں ہونا چاہیئے کہ یہی آئندہ کی محرومی بچے کے چال چلن کو بھی قابو میں رکھے؟
اگر کانسٹنس وقت مقررہ پر تیار نہیں ہوتی تو اس کا قدرتی نتیجہ یہی ہے کہ اس کو
پیچھے چھوڑ دیا جائے - اور ہوا خوری سے محروم رکھا جائے - جب ایک دو مرتبہ
گھر پر رہ جائے گی - اور دوسرے بچے کھیتوں کی سیر کا لطف اُٹھائیں گے - جب
اُس کو معلوم ہوگا کہ اس قیمتی تفریح کا نقصان صرف میری سستی کا نتیجہ ہے تو اس کے
بعد ظن غالب ہے کہ اصلاح ہو جائے گی - کم سے کم اتنا تو ہوگا کہ یہ تجویز اُس ہمیشہ
کی زجر و ملامت کی نسبت زیادہ کارگر ہوگی جس کا نتیجہ یہی ہے کہ بچے
چکنے گھڑے بن جاتے ہیں -

(۳) تیسری مثال

جب بچے غیر معمولی بے پروائی سے وہ چیزیں جو اُن کو دی گئی ہیں - توڑ ڈالیں
یا کھو دیں - تو قدرتی سزا وہی بے آرامی ہے جو اُس نقصان سے حاصل ہوتی ہے
اور یہی سزا بڑے آدمیوں کو بھی زیادہ محتاط بناتی ہے - گم شدہ یا ٹوٹی پھوٹی چیز کی

محتاجگی - اور اُس کی جگہہ دوسری چیز خریدنے کا خرچ - یہ ایسے تجربے ہیں جن کے
ذریعہ سے مردوں اور عورتوں کو اِن معاملات میں تربیت حاصل ہوتی ہے - اور
بچوں کے تجربے بھی حتی الامکان بڑوں کے تجربوں کی مانند ہونے چاہئیں
ہمارا یہ بیان بچپن کے اُس زمانہ سے متعلق نہیں ہے - جب کہ بچے کھلونوں کے
جسمانی خواص سیکھتے وقت اُن کو توڑ پھوڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں - بلکہ اوس زمانہ
مابعد سے متعلق ہے - جب کہ مال کا مفہوم - اور اُس کے فواید بچوں کو معلوم ہوجاتے
ہیں - مثلاً کوئی لڑکا - جس کی عمر اُس قابل ہے کہ وہ چاقو اپنے پاس رکھہ سکے - چاقو
کو ایسی بری طرح استعمال کرے کہ اُس کا پھل ٹوٹ جائے - یا گھاس میں کسی جھاڑی کے
قریب بھول کر چھوڑ آئے - جہاں وہ ایک چھڑی کاٹ رہا تھا - تو غافل باپ یا ناز بردار
رشتہ دار بالعموم فوراً دوسرا چاقو خرید کردے گا - اور یہ نہیں دیکھے گا کہ ایسا کرنے سے
ایک قیمتی نصیحت ضایع ہوگئی ہے - ایسی حالت میں مناسب ہے کہ باپ بیٹے کو
سمجھا دے کہ چاقو خریدنے میں روپیہ صرف ہوتا ہے روپیہ کمانے کی محنت درکار ہے
مجھے اتنا مقدور نہیں - کہ جو شخص چاقو کھوئے یا توڑے - اُس کے لیے نئے چاقو
خریدوں گا اور جب تک اس امر کا ثبوت مشاہدہ میں نہ آجائے کہ بچہ زیادہ محتاط ہوگیا ہے
باپ کو لازم ہے کہ اِس نقصان کی تلافی سے انکار کرے - اسی قسم کی تربیت
فضول خرچی کے روکنے میں کار آمد ہوگی -

امثلہ مذکورہ بالا سے قدرتی اور مصنوعی سزاؤں کا فرق صاف ظاہر ہے -

اِن چند عام مثالوں سے - جن کو یہاں اس وجہ سے منتخب کیا گیا ہے کہ
اُن سے بآسانی ہمارے مدعا کی توضیح ہوتی ہے - ہر شخص پر صاف ظاہر ہوجائیگا -
کہ اِن قدرتی سزاؤں میں - جن کی بابت ہم زور کے ساتھہ کہتے ہیں کہ کارگر
سزائیں دراصل یہی ہیں - اور اُن مصنوعی سزاؤں میں - جن کو عموماً قدرتی
سزاؤں کی جگہہ برتا جاتا ہے - کیا امتیاز ہے ؟ اس اصول کے اعلیٰ اور

دقیق استعمال کی مثالیں بیان کرنے سے پہلے ہم کو چاہیے کہ اُن چند بڑی بڑی
فوقیتوں کو قلم بند کریں۔ جو اس اصول کو اُس اصول پر۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اُس
عملی دستور پر۔ حاصل ہیں۔ جو اکثر خاندانوں میں جاری ہے۔

قدرتی طریقہ ترتیب کے فوائد

پہلا فائدہ

پہلی فوقیت یہ ہے کہ اس طریقہ کی پیروی سے علت اور معلول کا صحیح
تصور پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ تصور۔ بار بار اور استقلال کے ساتھ تجربہ کرنے سے آخرکار
معین اور مکمل ہوجاتا ہے۔ جب افعال کے نیک و بد نتائج سمجھ میں آجاتے ہیں۔ تو
اس بات کا بہت اچھی طرح اطمینان ہوجاتا ہے کہ آئندہ زندگی میں چال چلن عمدہ رہے گا۔
بہ نسبت اس کے کہ محض دوسرے شخص کے اعتبار پر اُن نتائج کا یقین کر لیا جائے
جس بچہ کو یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ چیزوں کو تتر بتر کرنے کی وجہ سے اُن کو ترتیب وار رکھنے
کی محنت اُٹھانی پڑے گی۔ جو اپنے تساہل کی وجہ سے کسی تفریح سے محروم رہتا ہے۔
جس سے بے پروائی کرنے کے سبب کوئی بڑی عزیز شے ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ اُس کو
نہ صرف سخت نتیجہ بھگتنا پڑتا ہے۔ بلکہ علل و اسباب کا علم بھی حاصل ہوجاتا ہے۔ اور یہ
دونوں باتیں بالکل اُن ہی باتوں کے مشابہ ہیں جو اُس کو بڑی عمر میں پیش آئیں گی۔ مگر جب بچہ
کو ایسی حالتوں میں جھڑک دیا جائے۔ یا کوئی مصنوعی سزا دی جائے۔ تو اس سے صرف
یہی نقصان لازم نہیں آتا کہ اُس کو ایسی سزا ملتی ہے۔ جس کی وہ بہت ہی کم پروا کرتا ہے
بلکہ نیک و بد چال چلن کی اصل حقیقت کا علم ہی اُس کو حاصل نہیں ہوتا۔ جو بصورت
دیگر حاصل ہوسکتا تھا۔ مصنوعی انعاموں اور سزاؤں کے معمولی طریقہ کی ایک خرابی
جس پر صاحبان بصیرت مدت سے غور کرتے چلے آتے ہیں یہ ہے کہ یہ طریقہ بدراہی
کے قدرتی نتیجوں کے بجائے خاص مشقتیں یا سزائیں تجویز کرتا ہے۔ جس سے بذاتہ
ایک غلط اخلاقی معیار پیدا ہوتا ہے۔ چوں کہ شیرخواری اور طفولیت کے تمام
زمانہ میں بچہ ہمیشہ یہی سمجھتا رہا ہے کہ جس کام کی ممانعت کی جاتی ہے۔ اُس کا خاص

نتیجہ والدین یا اُستاد کی ناراضی ہے۔ اِس لیے اُس کے ذہن میں یہ بات جم جاتی ہے کہ اُس فعل اور اُس ناراضی میں علت اور معلول کی حیثیت سے خیالات کا ایک مقررہ تعلق ہے۔ اسی وجہ سے جب والدین اور معلم اپنے فرض سے سبک دوش ہو جاتے ہیں۔ اور بچوں کو اُن کی ناراضی کا خوف نہیں رہتا۔ تو افعال ممنوعہ کی روک ٹوک بہت کچھ دور ہو جاتی ہے۔ اور سچی روک ٹوک یعنی قدرتی سزا کا علم۔ افسوس ناک تجربہ کے ذریعہ سے ابھی حاصل کرنا باقی ہے۔ چنانچہ ایک شخص جس نے اِس قاصر طریقہ تربیت سے ذاتی واقفیت حاصل کی ہے۔ اس طرح لکھتا ہے۔

"وہ نوجوان جو مدرسہ سے رہائی پا کر نکلتے ہیں۔ خاص کر وہ جن کے والدین نے اپنے دباؤ سے پوری طرح کام لینے میں غفلت کی ہے۔ ہر طرح کی فضولی میں مبتلا ہو کر حد سے گر جاتے ہیں۔ وہ کسی دستور العمل کو نہیں جانتے۔ وہ اخلاقی چال چلن کی وجوہات سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اُن کے پاس کوئی بنیاد نہیں ہوتی جس پر تکیہ کریں۔ اور جب تک زمانہ اُن کو سختی کے ساتھ ادب نہیں سکھاتا۔ اُس وقت تک وہ قوم کے نہایت ہی خوفناک افراد ہوتے ہیں"

دوسرا فائدہ

اس قدرتی تربیت کا ایک اور بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ خالص انصاف کی تربیت ہے۔ اور ہر ایک بچہ اُس کو ایسا ہی سمجھے گا۔ جس شخص کو اتنی ہی تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے جو نظام اشیاء کی رو سے اُس کی ذاتی بدراہی کا نتیجہ ہونا چاہیئے۔ اُس کو۔ بہ نسبت اس کے کہ وہ مصنوعی سزا کی تکلیف برداشت کرے۔ یہ خیال بہت کم ہوگا کہ میرے ساتھ ناواجب سلوک کیا گیا ہے۔ اور یہ بات جس طرح بڑوں پر صادق آتی ہے اُسی طرح بچوں پر بھی صادق آتی ہے۔ ایک ایسے لڑکے کی مثال کو جو عادۃً اپنے کپڑوں سے غافل رہتا ہے۔ مثلاً بغیر احتیاط کے جھاڑیوں میں سے نکل جاتا ہے۔ یا کیچڑ کی بالکل پروا نہیں کرتا۔ اگر اُس کو مار پیٹ کریں یا سونے کے

لیے بھیج دیں وہ غالباً یہ خیال کرے گا کہ میرے ساتھ بدسلوکی کی گئی ہے۔ بلکہ زیادہ تر احتمال اس امر کا ہے کہ وہ اپنی تکلیفوں کا دھیان کرے گا۔ اور اپنے قصوروں پر پشیمان نہ ہوگا۔ مگر فرض کرو کہ اس سے یہ کہا جائے کہ جہاں تک ممکن ہو اس نقصان کی تلافی کرے جو اس نے کیا ہے۔ یعنی کپڑے کو کیچڑ سے صاف کرے جس میں وہ آلودہ ہو گیا ہے یا جیسا کچھ اُس سے ہو سکے پھٹے کپڑے کو سیئے۔ تو اُس کو یہی معلوم نہ ہوگا کہ یہ خرابی میری ہی پیدا کی ہوئی ہے؟ کیا اس سزا کے بھگتتے وقت اُس کو متواتر اس بات کا شعور نہ ہوگا کہ اس سزا اور اُس کی علت میں باہمی تعلق ہے؟ اور کیا باوجود اپنے غصہ کے وہ اس انتقام کے انصاف کو کم و بیش صراحت کے ساتھ نہیں سمجھ لے گا؟ اگر اس قسم کی متعدد نصیحتیں اصلاح میں قاصر رہیں۔ یعنی اگر کپڑوں کا جوڑا قبل از وقت خراب ہو جائے۔ اگر باپ اسی طریقہ تربیت کی پیروی کر کے نئے جوڑے کے لیے روپیہ خرچ کرنے سے انکار کرے۔ جب تک کہ معمولی وقت نہ گزر جائے۔ اور اگر اس اثنا میں ایسے مواقع پیش آئیں کہ لڑکے کے پاس معقول لباس نہ ہو۔ اور اسی لیے تعطیل کی سیر و تفریح اور تہوار کے دنوں میں۔ عزیزوں سے ملنے جلنے سے اُس کو روک دیا جائے تو یہ بات ظاہر ہے کہ جس طرح اس سزا کا اُس کے دل پر گہرا اثر ہوگا۔ اسی طرح سببیت کے سلسلہ کا پتا لگانے میں۔ اور اس بات کے معلوم کرنے میں کہ یہ میری ہی بے پروائی کا نتیجہ ہے۔ وہ شاید ہی ناکامیاب رہے۔ اور جب وہ یہ بات سمجھ لے گا تو اُس کو کسی ایسی بے انصافی کا احساس پیدا نہ ہوگا۔ کہ گویا قصور اور اُس کی سزا کے درمیان کوئی ظاہری تعلق ہی نہیں ہے۔

تیسرا فایدہ

پھر اس بات پر غور کرو کہ معمولی طریقہ کی نسبت اس طریقہ سے والدین اور اولاد دونوں کے دلوں میں بل پڑنے کا بہت کم احتمال ہے۔ جب خود والدین بجائے اس کے کہ بچوں کو اُن تکلیف دہ نتایج کا تجربہ کرنے کے لیے

چھوڑدیں - جو بے جا چال چلن سے خود بخود پیدا ہوتے ہیں - بعض دوسری تکلیف دہ
سزائیں اُن کو دیں - تو اس سے دوہرا نقصان ہوتا ہے - چوں کہ وہ بے شمار
قوانین بچوں کے لیے بناتے ہیں - اور ان قوانین کے قایم و برقرار رکھنے میں اپنی فوقیت
اور عظمت سمجھتے ہیں - اس لیے ہر ایک خطا کو ایسا سمجھتے ہیں کہ یہ جرم ہمارے برخلاف
ہے - اور ہمارے غصہ کا باعث ہے - اس کے سوا وہ کوفت ہے جو اس وجہ
سے پیدا ہوتی ہے کہ والدین - زاید محنت یا زائد خرچ کی شکل میں - اُن سزاؤں کو اپنے
اوپر لے لیتے ہیں - جو بے جا کام کرنے والوں کو ملنی چاہیے تھیں - اسی طرح کی قوت
بچوں کو پیش آتی ہے - وہ سزائیں جو کاموں کی لازمی مزاحمت سے اُن پر عاید ہوتی
ہیں - یعنی وہ جو شخصی وساطت کے بغیر دی جاتی ہیں - ان کی تکلیف نسبتہً
خفیف اور عارضی ہوتی ہے - مگر جو سزائیں ماں باپ اپنی مرضی سے دیتے ہیں -
اور جن کی بابت بچے بعد میں سمجھتے ہیں کہ ماں باپ ہی اُن کا باعث ہیں - اُن سزاؤں
سے ایسی تکلیف ہوتی ہے جو پہلی تکلیف سے زیادہ سخت اور زیادہ دیرپا ہوتی ہے
ذرا غور تو کرو - اگر یہ عملی طریقہ ابتدا ہی سے اختیار کیا جاتا تو اس کا نتیجہ کیا آفت ناک ہوتا
فرض کرو کہ یہ بات ممکن ہوتی کہ بچوں کو اپنی ناواقفیت یا ناتجربہ کاری کی وجہ سے جو
جسمانی تکلیفیں اُٹھانی پڑتی ہیں - اُن کو والدین اپنے اوپر لے لیتے اور وہ اُن
سزاؤں کو آپ بھگت کر بچوں کو دوسری قسم کی سزائیں دیتے - تاکہ اُن کو اپنے
چال چلن کا ناواجب ہونا معلوم ہو جائے فرض کرو کہ جب کوئی بچہ - جس کو کیتلی
کے چھیڑنے سے منع کیا گیا ہے کھولتا پانی اپنے پاؤں پر گرائے - اور اس کے
بدلے ماں کے پاؤں میں آبلہ پڑ جائے - اور ماں اس کے بدلے بچہ کے
ایک مکّا لگا دے - اور سب حالتوں میں ایسا ہی ہوا کرے - تو کیا یہ آئے دن

کی مصیبتیں - آج کل کی بہ نسبت بہت زیادہ غیظ و غضب کا ذریعہ نہیں ہو جائیں گی؟
کیا دونوں طرف سے سخت بدمزاجی نہ ہوگی؟ با ایں ہمہ آیندہ عمر میں بچوں کے ساتھ
بعینہٖ اس قسم کی حکمت عملی برتی جاتی ہے - جو باپ اپنے لڑکے کو اس وجہ سے
مارتا پیٹتا ہے کہ اُس نے غفلت یا خودسری سے بہن کا کھلونا توڑ دیا ہے اور پھر
خود ہی نئے کھلونے کے دام ادا کرتا ہے - وہ بالکل یہی کام کرتا ہے - یعنی قصوروار
کو مصنوعی سزا دیتا ہے - اور قدرتی سزا اپنے اوپر لیتا ہے - خود اس کا دل اور
قصوروار کا دل خواہ مخواہ آزردہ ہوتا ہے - اگر وہ صرف اتنا کرتا کہ بچے سے اُس کے عوض
میں دوسرا کھلونا دلا دیتا - تو دونوں کا دل اتنا نہ جلتا - اگر وہ بچے سے یہ کہہ دیتا کہ دوسرا کھلونا
تم کو اپنے داموں سے خریدنا چاہیئے - اور داموں کے ادا ہونے تک تمھارا جیب
خرچ ضرور بند کیا جائے گا ،، تو دونوں طرف طبیعت کی بدمزگی بہت کم ظہور میں آتی -
اور بعد میں جیب خرچ سے رہنے کے سبب بچہ منصفانہ اور مفید سزا بھگت لیتا -
المختصر قدرتی روک ٹوک کے ذریعے سے تربیت کا طریقہ دو وجہ سے مزاج کے لیئے
کم تر مضر ہے ایک اس وجہ سے کہ وہ خالص منصفانہ طریقہ سمجھا جاتا ہے اور
دوسرے اس وجہ سے کہ وہ زیادہ تر قدرت کی غیر شخصی وساطت کو والدین
کی شخصی وساطت کا قایم مقام بنا دیتا ہے -

پانچواں فائدہ

اسی سے یہ بدیہی نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ اس طریقہ تربیت سے والدین اور اولاد
کا تعلق زیادہ تر دوستانہ اور اسی لیے زیادہ تر موثر ہوتا ہے -
غصہ - خواہ ماں باپ کا ہو خواہ بچہ کا - خواہ کسی وجہ سے پیدا ہو - اور خواہ کسی
شخص پر ہو - ایک مضر شے ہے - مگر ماں باپ کا غصہ بچہ پر - یا بچہ کا غصہ ماں
باپ پر - خاص کر مضر ہے - کیوں کہ وہ ہم دردی کے اُس علاقہ کو کم زور کرتا ہے -
جو اولاد کو مہربانی سے قابو میں رکھنے کے لیے ضروری ہے تسلسل خیالات

کے قوانین سے یہ نتیجہ لازمی طور پر نکلتا ہے کہ جوانوں اور بڈھوں دونوں کو اُن چیزوں سے نفرت ہوتی ہے۔ جن کا تعلق عملاً ایسے تاثرات سے ہے۔ جو عادتاً ناگوار ہوتے ہیں۔ یا جہاں ابتدا سے محنت موجود ہوتی ہے۔ وہاں جس قدر دردانگیز خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ اُسی قدر وہ محبت کم ہوجاتی ہے۔ یا نفرت سے بدل جاتی ہے والدین کا غصہ۔ جو زجر و توبیخ اور زدوکوب کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اگر بار بار اس کا اعادہ کیا جائے۔ تو یہ نتیجہ ضرور پیدا ہوگا۔ کہ فرزندانہ رشتۂ محبت قطع ہوجائیگا اور بچوں کے غصہ اور آزردگی کا بھی ضرور یہ نتیجہ ہوگا۔ کہ اُن کے ساتھ جو محبت کی جاتی ہے۔ وہ کمزور ہوجائے گی۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ آخرکار زائل ہوجائے۔ اسی لیے بہت سے سچے والدین کو (اور خاص کر باپوں کو جن کو سزا دینے کا کام عموماً سپرد کیا جاتا ہے) اگر نفرت کی نظر سے نہیں۔ تو بے اعتنائی کی نظر سے ضرور دیکھتے ہیں۔ اور اسی لیے بہت سے والدین بچوں کو گوشمالی کی چیز سمجھتے ہیں۔ پس جب کہ ہم نے یہ بات سمجھ لی۔ جیساکہ سب لوگوں نے ضرور سمجھ لی ہوگی۔ کہ وہ اس طرح محبت کا قطع ہوجانا مفید اخلاقی تربیت کے لیے سم قاتل ہے " تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ بچوں کے ساتھ براہ راست مخالفت پیدا کرنے کے موقعوں سے بچنے کے لیے والدین جسقدر زیادہ خیال رکھیں اسی قدر بہتر ہے۔ اور اسی لیے قدرتی نتائج کی اس تربیت سے جس قدر توجہ کے ساتھ فائدہ اُٹھائیں۔ اُسی قدر بہتر ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ والدین کو تعزیری فرائض کی بجاآوری سے سبک دوشی ہوجائے گی اور والدین و اولاد کی باہمی ناراضی اور بیگانگی دور ہوجائے گی۔

فوائد اربعہ مذکورہ بالا کا خلاصہ

پس ہم دیکھتے ہیں کہ اخلاقی تربیت کا یہ طریقہ جس سے باقاعدہ مزاحمت کا تجربہ ہوتا ہے اور جو زمانہ شیرخواری اور زمانہ بلوغ دونوں کے لیے خدا تعالیٰ کا یکساں مقرر کیا ہوا طریقہ ہے طفولیت اور شباب کے درمیانی زمانہ میں بھی برابر اُسی طرح صادق

آتا ہے۔ اس طریقہ کے بعض فوائد حسب ذیل ہیں۔

اوّل۔ اس سے صحیح اور غلط چال چلن کا وہ معقول علم حاصل ہوتا ہے جو سزاؤں کے نیک و بد نتایج کا بذات خود تجربہ کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

دوم۔ چوں کہ بچہ۔ خود اپنی غلط کاریوں کے درد انگیز نتایج کے سوا اور کوئی تکلیف نہیں اٹھائے گا۔ اس لیے ضرور ہے کہ وہ کم و بیش صراحت کے ساتھ ان سزاؤں کے قرین انصاف ہونے کو تسلیم کرے۔

سوم۔ جب وہ سزاؤں کے قرین انصاف ہونے کو تسلیم کرے گا۔ اور کسی دوسرے کے ہاتھ سے نہیں۔ بلکہ اپنے ہی اعمال کا خمیازہ بھگتے گا۔ تو اس کی طبیعت کم پشیمان ہوگی۔ اور جب والدین خاموشی کے ساتھ اس فرض کو پورا کریں گے کہ بچہ قدرتی سزاؤں کو محسوس کرے۔ تو والدین اور اولاد میں بہ نسبتہً یک دلی و یک جہتی قایم رہے گی۔

چہارم۔ جب باہمی ناراضی اس طرح رک جائے گی تو والدین اور اولاد میں بہت زیادہ فرحت انگیز اور موثر تعلقات قایم ہو جائیں گے۔

سخت شرارت کی حالت میں کیا کرنا چاہیے؟

مگر بعض اشخاص یہ سوال کریں گے کہ "زیادہ سخت شرارت کی حالتوں میں کیا کرنا چاہیے؟ جب بچہ خفیف سی چوری کرے۔ یا جھوٹ بولے۔ یا کسی چھوٹے بھائی بہن سے بری طرح پیش آئے۔ اُس وقت اس طریقہ کو کس طرح عمل میں لانا چاہیے"؟

باقاعدہ اخلاقی تربیت کی چند مثالیں

اِن سوالوں کا جواب دینے سے پہلے ہم کو چند تمثیلوں پر غور کرنی چاہیے۔ جو اِن سوالوں کے جواب سے تعلق رکھتی ہیں۔

ہمارے ایک دوست نے جو اپنے بہنوئی کے گھر میں رہتا تھا۔ اپنے چھوٹے بھانجے اور بھانجی کی تربیت کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ اُس نے اِس کا انتظام اُسی طریقہ کے

موافق کیا تھا جو اوپر بیان کیا گیا ہے - یہ طریقہ زیادہ تر قدرتی ہمدردی پر مبنی تھا - نہ کہ
اُن نتائج پر جو بحث و دلیل کے بعد نکالے جاتے ہیں - دونوں بچے گھر میں اُس کے شاگرد
اور باہر اُس کے رفیق تھے - وہ ہر روز سیر و تفریح میں - اور نیز اُس وقت جب کہ وہ نباتات
کی تحقیقات کے لیے باہر جاتا تھا - اُس کے ساتھ رہتے تھے - سرگرمی سے اُس
کے لیے پودے تلاش کرتے تھے - جب وہ اِن پودوں کو دیکھتا بھالتا یا شناخت
کرتا تھا - تو وہ بھی غور سے دیکھا کرتے تھے - اور اِس طریقہ اور دوسرے طریقوں سے
اُس کی صحبت میں لطف اور تعلیم حاصل کرتے تھے - قصہ کوتاہ اخلاقی حیثیت سے
غور کی جائے تو وہ ماں باپ سے بڑھ کر اُن کا ماں باپ تھا - اِس طریقہ تربیت کے
نتائج بیان کرتے وقت - اُس نے من جملہ دیگر مثالوں کے ایک مثال ہمارے سامنے
یہ بیان کی تھی کہ ایک شام کو مجھے کسی چیز کی ضرورت ہوئی - جو مکان کے دوسرے حصہ
میں رکھی تھی - میں نے اپنے بھانجے سے کہا کہ وہ چیز لے آؤ - چوں کہ لڑکے کا دل
اوس کام میں لگا ہوا تھا - جو اُس وقت اُس کے آگے تھا - اِس لیے اس نے
خلافِ عادت - یا تو سخت ناخوشی ظاہر کی - یا انکار کیا - ہم کو یاد نہیں (یہ شک مصنف
کو ہے) چوں کہ ماموں جابرانہ طریقہ پسند نہیں کرتا تھا - خود ہی وہ چیز لینے
چلا گیا - جس کی اُس کو ضرورت تھی - اور صرف اتنا کیا کہ لڑکے کے اس بُرے
برتاؤ سے جو تکلیف اُس کو پہنچی تھی - اپنے تیور سے اس کا اظہار کر دیا - شام کو تھوڑی
دیر کے بعد - جب لڑکے نے معمولی کھیل کی بات چیت شروع کی تو اُس کو سنجیدگی سے
روک دیا گیا - یعنی ماموں نے اُسی سرد مہری کا اظہار کیا - جو قدرتی طور پر
اس میں پیدا ہو گئی تھی - اور اس طرح لڑکے کو چھوڑ دیا کہ اپنے برتاؤ کا لازمی نتیجہ بھگتے -
اگلے دن صبح کو اُٹھنے کے معمولی وقت پر ہمارے دوست نے دروازہ کے باہر
ایک نئی آواز سنی - اتنے میں اُس کا چھوٹا بھانجا گرم پانی لئے اندر آیا - لڑکے نے یہ

دیکھنے کے لیے کہ اور کیا کام کرسکتا ہوں - کمرہ کے چاروں طرف نظر ڈالی اور پھر یہ کہ اُٹھا "آہا! آپ کو اپنے جوتے کی ضرورت ہے" اور اوس کے لانے کے لیے فوراً جھپٹ کر زینہ کے نیچے اُتر گیا - اِس طریقہ سے اور دوسرے طریقوں سے اُس نے ثابت کر دیا کہ وہ اپنے ناواجب برتاؤ کی وجہ سے سچ مچ پشیمان ہے - اُس نے غیر معمولی خدمتوں سے اُس خدمت کی تلافی کی کوشش کی جس سے اُس نے انکار کیا تھا - اُس کے اعلیٰ جذبات نے ادنیٰ جذبات پر واقعی غلبہ پالیا تھا - اور اس فتح کی بدولت قوت حاصل کرلی تھی - اور یہ بات معلوم کرکے کہ "بغیر دوستی کے زندگی بسر کرنے سے کیا کچھہ تکلیف ہوتی ہے" اُس کو اِس دوستی کی قدر - جسے اُس نے کھو کر دوبارہ حاصل کیا تھا - پہلے سے زیادہ ہوگئی تھی -

یہ شخص اب خود صاحب اولاد ہے - اور اُسی طریقہ پر عمل کرتا ہے - اور اُس کو یہ بات معلوم ہوگئی ہے کہ اس طریقہ سے پوری پوری مطلب برآری ہوتی ہے - وہ بالکل اپنے بچوں کا دوست بنا ہوا ہے - بچے اس بات کے آرزومند رہتے ہیں کہ کب شام ہو اور ہمارا باپ گھر آئے - اور وہ یک شنبہ کا لطف خاص کر اس وجہ سے اُٹھاتے ہیں کہ اُن کا باپ دن بھر اُن کے پاس رہتا ہے - چوں کہ بچوں کو اُس پر پورا اعتماد ہے - اور وہ اُس سے پوری محبت رکھتے ہیں - اس لیے وہ دیکھتا ہے کہ محض رضامندی یا نارضامندی کے اظہار کی وجہ سے بچوں کو قابو میں رکھنے کی کافی قوت مجھہ کو حاصل ہے - اگر کبھی گھر واپس آکر وہ یہ سنتا ہے کہ کسی لڑکے نے شرارت کی ہے - تو وہ اُسی سرد مہری کے ساتھہ اُس سے برتاؤ کرتا ہے - جو لڑکے کی شرارت کے شعور سے خود بخود پیدا ہوتی ہے - اور وہ دیکھتا ہے کہ یہ نہایت کارگر سزا ہے - معمولی لاڈ پیار نہ کرنے سے بچوں کو بہت تکلیف ہوتی ہے یعنی اس طریقہ سے - بہ نسبت مار پیٹ کے رنج کا جوش زیادہ عرصہ تک قایم رہتا -

ہے - وہ کہتا ہے کہ اِس خالص اخلاقی سزا کا خوف - میری عدم موجودگی میں بھی ہمیشہ موجود رہتا ہے - یہاں تک کے کہ بچے اکثر اوقات دن میں اپنی ماں سے پوچھتے ہیں کہ وہ آج ہمارا چال چلن کیسا رہا ہے - اور اُس کی بابت اچھی رپورٹ کرے گی یا نہیں؟ حال کا ذکر ہے - کہ سب سے بڑے نے جو ایک مستعد پانچ سال کا لڑکا ہے - حیوانی زندہ دلی کے جوش میں - جو سب تن درست بچوں میں پایا جاتا ہے - ماں کی عدم موجودگی میں - چند بے عنوانیاں کی تھیں - یعنی اپنے باپ کے سنگار دان میں سے استرہ نکال کر بھائی کے بالوں کی لٹ کاٹ لی تھی - اور اپنے آپ کو زخمی کر لیا تھا - جب باپ نے اپنی واپسی کے وقت اِن وقوعوں کو سنا - تو اُس نے لڑکے سے بات تک نہیں کی - نہ اُس شب کو اور نہ اگلی صبح کو - علاوہ فوری تکلیف کے اِس کا یہ نتیجہ ہوا کہ چند روز بعد جب ماں باہر جانے والی تھی - لڑکے نے منت کی کہ ایسا نہ کیجئے - اور جب اُس سے سبب پوچھا گیا - تو معلوم ہوا کہ اُس کو یہ خوف تھا کہ ماں کی عدم موجودگی میں کہیں دوبارہ ایسا ہی قصور اُس سے سرزد نہ ہو جائے -

تدریجی طریقہ تربیت سے والدین اور اولاد کے درمیان دوستانہ تعلقات قایم رہتے ہیں -

ہم نے اِس سوال کا جواب دینے سے پہلے کہ زیادہ سخت قصوروں پر کیا کرنا چاہیئے؟ یہ واقعات بطور تمہید کے اِس غرض سے بیان کیے ہیں کہ پہلے اُس تعلق کو ظاہر کر دیا جائے - جو والدین اور اولاد کے درمیان قایم ہو سکتا ہے - اور قایم ہونا چاہیئے - کیوں کہ اِن زیادہ سخت قصوروں کا کامیابی کے ساتھ تدارک کرنا اسی تعلق کے وجود پر منحصر ہے - اور بطور تمہید مزید کے اب ہم کو یہ بتانا چاہیئے کہ اس تعلق کا قایم رہنا اُسی طریقہ کے اختیار کرنے کا نتیجہ ہوگا جس کی حمایت اِس جگہ کی گئی ہے - ہم پہلے دکھا چکے ہیں کہ وہ اگر بچہ کو صرف چھوڑ دیا جائے کہ اپنی غلط کاریوں کی دردانگیز سزاوں کو خود دیکھتے - تو باپ مخالفت سے محفوظ رہتا ہے - اور اِس بات سے بچا رہتا ہے کہ بچہ اُس کو دشمن سمجھے" مگر اب یہ دکھانا

باقی ہے کہ "جہاں شروع ہی سے استقلال کے ساتھ اس طریقہ کی پیروی
کی جائے گی وہاں والدین اور اولاد میں مستعدانہ دوستی کا خیال ضرور
پیدا ہوگا۔"

الدین کا عام برتاؤ اور کے متناقض خصائل ثر اولاد پر

آج کل - اولاد ماں باپ کو عموماً دشمن دوست نما سمجھتی ہے - چوں کہ
بچوں کے خیالات یقیناً اُس برتاؤ پر منحصر ہوتے ہیں - جو اون کے ساتھ کیا جاتا ہے -
اور چوں کہ وہ برتاؤ یہ ہے کہ کبھی رشوت دی جاتی ہے - تو کبھی روک ٹوک کی جاتی
ہے - کبھی لاڈ پیار ہے تو کبھی دھمکی جھڑکی - کبھی نرمی برتی جاتی ہے
تو کبھی سزا دی جاتی ہے - اور ان حالتوں سے کبھی تجاوز نہیں ہوتا - اس لیے بچے
اس بات کا ضرور یقین کریں گے کہ ہمارے والدین کے خصائل متناقص ہیں -
ماں اپنے چھوٹے بچے سے یہ کہنا کافی سمجھتی ہے - کہ "میں سب سے بڑھ کر
تیری دوست ہوں" اور یہ فرض کر کے کہ بچہ کو اس بات کا یقین کرنا چاہیے - یہ نتیجہ
نکالتی ہے کہ وہ ایسا ہی سمجھے گا "یہ سب تمہارے فائدہ کے لیے ہے" "میں
تم سے بہتر یہ بات جانتی ہوں کہ کون سی چیز تمہارے لیے مناسب ہے" "تمہاری
اتنی عمر نہیں ہے کہ تم اب اس بات کو سمجھ سکو - مگر جب تم بڑے ہو جاؤ گے - تو جو
کچھ میں کرتی ہوں - اس کا شکریہ ادا کرو گے" یہ اور اسی قسم کے بیان ہر روز دھرائے
جاتے ہیں - اسی اثنا میں لڑکا روزمرہ قطعی سزائیں بھگتتا ہے - اور ہر گھڑی اس کو
منع کیا جاتا ہے کہ یہ کام نہ کرو - وہ کام نہ کرو - فلاں کام نہ کرو - جن کو وہ کرنا چاہتا ہے -
لفظوں کے ذریعے سے اس کے کان میں یہ بات پڑتی ہے کہ "ہم کو تمہاری خوشی
مد نظر ہے" مگر اُن افعال سے جو ان اقوال کے ساتھ سرزد ہوتے ہیں - اُس
کو عموماً تھوڑی بہت تکلیف ہوتی ہے - چوں کہ بچہ میں اتنی عقل نہیں ہوتی - کہ اُس
مستقبل کو سمجھ سکے - جو ماں کی نگاہ میں ہے - یا اس بات کو سمجھ سکے کہ یہ برتاؤ جو اُس

آئندہ خوشی میں کیونکر ممد و معاون ہوگا۔ اسلیئے وہ اُن ہی نتیجوں سے رائے قایم کرتا ہے۔ جن کو وہ بھگتتا ہے۔ اور یہ بات معلوم کرکے کہ وہ نتیجے ہرگز خوشی دینے والے نہیں ہیں۔ اُس کو اپنی ماں کے دوستی کے وعدوں کی نسبت شبہ پیدا ہوجاتا ہے۔ اور کیا بچہ سے اِس کے سوا کسی دوسرے نتیجے کی توقع رکھنی حماقت نہیں ہے؟ کیا بچہ کو اُس شہادت کی بنا پر جو اُس نے حاصل کی ہے۔ استدلال نہیں کرنا چاہیئے؟ اور کیا اِس شہادت سے یقیناً وہی نتیجہ نکلتا ہوا نہیں معلوم ہوتا جو اُس نے نکالا ہے؟ اگر ماں کو بھی اسی قسم کی حالت پیش آئے۔ تو وہ بھی بعینہ اسی طرح استدلال کرے گی۔ اگر اُس کو اپنے واقف کاروں میں کوئی ایسا شخص مل جائے۔ جو ہمیشہ اُس کی خواہشوں کو روکتا رہے۔ سخت زجر و توبیخ کرتا رہے۔ اور کبھی کبھی سچ مچ اُس کو سزا بھی دے بیٹھے۔ اور باوجود اِن افعال کے اس بات کا دعویٰ کرے کہ "مجھے تمہاری بہبودی کا بڑا خیال ہے"۔ تو وہ اُس کے دعویٰ پر کچھ توجہ نہ کرے گی۔ بھلا پھر وہ ایسا کیوں خیال کرتی ہے کہ بچہ اس کے خلاف عمل کرے گا۔

قدرتی طریقہ تربیت کے نتایج کی توضیح ایک آسان مثال کے ذریعہ

مگر اب غور کرو۔ کہ جس طریقہ پر ہم زور دیتے ہیں اگر مضبوطی کے ساتھ اس کی پیروی کی جائے۔ یعنی اگر ماں اپنے لڑکے کو اُس سزا سے متنبہ کردے جو قدرت کے ہاتھوں اُس کو بھگتنی پڑے گی۔ اور اس ذریعہ سے نہ صرف سزا کا آلہ بننے سے باز رہے بلکہ ایک دوست کا سا برتاؤ کرے۔ تو اُس کے نتایج کیسے کچھ مختلف ہونگے ایک مثال لو۔ اور مثال بھی نہایت سیدھی سادی تاکہ اس امر کی توضیح ہوجائے کہ بچپن میں اس حکمت عملی سے کس طرح کام لیا جاتا ہے۔ تجربہ کا شوق بچوں میں نہایت نمایاں طور پر پایا جاتا ہے۔ جن کے کام فطرۃً استقرائی طریقہ تحقیقات کے مطابق ہوتے ہیں۔ فرض کرو کہ اس شوق کی تحریک سے لڑکا کاغذ کے ٹکڑے شمع پر جلا رہا ہے۔ اور اُن کو جلتے ہوئے غور سے دیکھ رہا ہے۔ ایک معمولی

ماں جس کی طبیعت میں غور و فکر نہیں ہے۔ یا تو اس عذر سے کہ اُس کو شرارت سے روکا جائے۔ یا اس خوف سے کہ وہ اپنے آپ کو جلائے گا۔ اُس کو اس کام سے باز رہنے کا حکم دے گی۔ اور درصورت عدم تعمیل۔ کاغذ اُس کے ہاتھ سے چھین لیگی۔ لیکن اگر وہ ایسا خوش قسمت ہے کہ اُس کی ماں کی طبیعت میں کسی قدر معقولیت ہے۔ جو یہ بات جانتی ہے کہ جس شوق سے وہ کاغذ جلتے دیکھ رہا ہے۔ وہ شوق ایک مفید تجسس کا نتیجہ ہے۔ اور جس میں اتنی عقل بھی ہے کہ دست اندازی کے نتیجے سمجھ سکتی ہے۔ وہ اس طرح استدلال کرے گی:۔

"اگر میں اس کام کو روک دوں تو کسی قدر علم کے حاصل ہونے میں مزاحمت واقع ہوگی۔ یہ سچ ہے کہ میں بچہ کو جلنے سے بچا سکتی ہوں مگر پھر کیا؟ وہ یقیناً کبھی نہ کبھی اپنے آپ کو جلائے گا۔ اور زندگی میں اُس کی حفاظت کے لیے یہ بات نہایت ضروری ہے کہ وہ شعلے کے خواص کو تجربہ کے ذریعہ سے سیکھے۔ اگر میں اِس موجودہ خطرہ میں پڑنے سے اُس کو منع کروں تو وہ یقیناً اس کے بعد اسی خطرہ یا اس سے بڑھ کر کسی دوسرے خطرہ میں پڑے گا۔ جب کہ کوئی شخص روکنے کے لیے موجود نہ ہوگا۔ حالانکہ کوئی حادثہ اس وقت پیش آئے۔ جب کہ میں پاس موجود ہوں۔ تو میں اُس کو کسی بڑے صدمہ سے بچا سکتی ہوں۔ علاوہ بریں۔ اگر میں اُس کو روک دوں تو میں ایک ایسے شغل میں مزاحم ہوں گی جو بذات خود خالص بے ضرر اور واقعی مفید تفریح ہے۔ اور میری طرف سے تھوڑی بہت بدگمانی بھی اس کے دل میں پیدا ہو جائے گی۔ چوں کہ وہ اس تکلیف سے ناواقف ہے جس سے میں اُس کو بچانا چاہتی ہوں۔ اور صرف اُسی تکلیف کو محسوس کرتا ہے۔ جو اُس کی خواہش کے ترک جانے سے پیدا ہوتی ہے۔ اِس لیے وہ یقیناً مجھی کو اُس تکلیف کا باعث سمجھے گا۔ جو صدمہ اُس کے خیال میں نہیں آسکتا اُس کے نزدیک اُس صدمہ کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اور اس قدر

سے بچانے کے لیے میں اُس کو ایسے طریقہ سے سزا دیتی ہوں جس کی تکلیف وہ نہایت سختی سے محسوس کرتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے نزدیک مجھے تکلیف دہی کا ایک ذریعہ سمجھتا ہے۔ پس میرے لیے سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ اُس کو خطروں سے خبردار کردوں۔ اور کسی سخت صدمہ کے روکنے کے لیئے آمادہ رہوں۔"

زبردستی کی روک ٹوک صرف اُن حالتوں میں ہونی چاہیے جو اُن کو سخت صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہو۔

اور اِس نتیجہ کی پیروی کر کے وہ بچہ سے یہ کہے گی "مجھے اندیشہ ہے کہ اگر تم یہ کام کروگے۔ تو تم کو صدمہ پہنچے گا۔" اب فرض کرو کہ لڑکا اپنی ہٹ پر قایم رہے اور غالباً ایسا ہی ہوگا۔ تو انجام یہ ہوگا کہ اُس کا ہاتھ جل جائے گا۔ بھلا اس سے کیا نتائج نکلتے ہیں؟ اوّلاً۔ اُس نے ایسا تجربہ حاصل کیا ہے۔ جس کا حاصل ہونا انجام کار ضروری ہے۔ اور بچہ کو ذاتی حفاظت کی غرض سے جس قدر جلد یہ تجربہ حاصل ہو۔ اسی قدر بہتر ہے۔ اور ثانیاً۔ اُس کو یہ معلوم ہوگیا ہے۔ کہ ماں کی ناراضی یا فہمائش میری بہبودی کے لیے تھی۔ اور اُس کو ماں کی خیر خواہی کا ایک قطعی تجربہ حاصل ہوگیا ہے۔ یعنی اُس کی راے اور مہربانی پر بھروسا کرنے کے لیے ایک اور وجہ مِل گئی ہے۔

بے شک۔ اُن خطروں میں جو کبھی کبھی پیش آتے ہیں۔ جن میں ہاتھ پاؤں ٹوٹ جانے یا کسی دوسرے سخت صدمہ کا اندیشہ ہو۔ بچوں کو زبردستی روک دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر سخت حالتوں کو چھوڑ کر جو طریقہ تربیت اختیار کیا جائے۔ وہ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ بچہ کو چھوٹے موٹے خطروں سے جو روزمرہ پیش آتے ہیں۔ بچایا جائے۔ بلکہ ایسا ہونا چاہیئے کہ اُس کو اُن سے بچنے کی نصیحت اور فہمائش کی جائے۔ اس طریقہ کی پیروی سے فرزندانہ محبت معمول سے زیادہ قوی ہوجائیگی اگر مشکل اور حالتوں کے بیان بھی اسی ترتیب سے کام لیا جائے جس میں قدرتی

سزا دی جاتی ہے - اگر بچوں کو ایسی حالت میں چھوڑ دیا جائے کہ وہ باہر کی ہاتھا پائی اور گھر کے تجربوں میں مصروف رہیں۔ جن سے اُن کے چوٹ پھپیٹ لگ جانے کا اندیشہ ہو - اور صرف اتنی احتیاط رہے کہ جس قدر خطرہ ہو اسی کے موافق کم یا زیادہ سختی کے ساتھ ممانعت کر دی جائے - تو ممکن نہیں کہ والدین کی دوستی اور ہدایت کا روز افزوں اعتقاد بچوں کے دل میں پیدا نہ ہو - اس طریقہ کے اختیار کرنے سے - جیسا کہ پہلے ثابت ہو چکا ہے - یہی فائدہ نہیں کہ ماں باپ اُس نفرت سے محفوظ رہتے ہیں - جو کھلم کھلا سزا دینے سے اولاد کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے - بلکہ یہ طریقہ - جیسا کہ اب معلوم ہو گیا ہے - اُن کو اُس نفرت سے بھی بچاتا ہے جو بار بار کی روک ٹوک سے پیدا ہو جاتی ہے - اور جن وقتوں سے عموماً جھگڑے قضیے پیدا ہوتے ہیں وہی وقتے باہمی حسن ظن کے مستحکم ہونے کا ذریعہ بن جاتے ہیں - بجائے اس کے کہ بچوں سے زبانی یہ کہا جائے کہ "تمہارے ماں باپ سب سے بڑھ کر تمہارے دوست ہیں" جس کی مخالفت افعال سے ظاہر ہے - بچوں کو اس حقیقت کا علم متواتر روزانہ تجربوں سے حاصل ہو جائے گا - اور جب یہ علم حاصل ہو گیا تو اُن کو ماں باپ پر ایک حد تک اعتماد اور اُن کے ساتھ لگاؤ پیدا ہو جائے گا جو اور کسی طرح پیدا نہیں ہو سکتا -

سخت خطاؤں میں قدرتی طریقہ تربیت کو کس طرح کام میں لانا چاہیے؟

اس طریقہ کے عادۃً استعمال کرنے سے والدین اور اولاد میں جو زیادہ ہمدردانہ تعلق یقیناً پیدا ہوتا ہے - اُس کو تو ہم بیان کر چکے - اب پھر اُسی سوال کی طرف رجوع کرتے ہیں جو اوپر درج کیا گیا ہے یعنی "زیادہ سخت خطاؤں میں اس طریقہ کا استعمال کیوں کر کرنا چاہیئے"؟

قدرتی طریقہ تربیت کی بدولت سخت خطاؤں کی تعداد کم ہو جاتی ہے

اوّل تو اس بات پر غور کرو کہ معمولی دستور العمل کی نسبت اس دستور العمل کی پیروی میں - جو ہم نے بیان کیا ہے - یہ سخت تر خطائیں غالباً نہ تو اس قدر کثرت

اور بہت سخت خطائیں بھی سرزد نہیں ہوتیں

سے واقع ہوں گی اور نہ اس قدر سخت ہوں گی۔ بہت سے بچوں کی تربیت کا انتظام ایسا خراب ہوتا ہے۔ جس سے اُن کو سخت اشتعال طبع ہوتا ہے۔ اور اُن کی بدراہی خود اسی اشتعال طبع کا نتیجہ ہے۔ بار بار سزا دینے سے جدائی اور مخالفت کی حالت پیدا ہوتی ہے۔ یہ حالت ہمدردی کو یقیناً زائل کرتی ہے۔ اور اسی لیے اُن خطاؤں کا دروازہ یقیناً کھل جاتا ہے۔ جو ہمدردی کی بدولت رُک جاتی ہیں۔ وہ سخت برتاؤ۔ جو ایک ہی خاندان کے بچے ایک دوسرے کے ساتھ کرتے ہیں۔ اکثر اوقات بہت کچھ اُسی سخت برتاؤ کا پرتو ہوتا ہے۔ جو بڑے بوڑھے اُن کے ساتھ کرتے ہیں اور اس برتاؤ کا خیال کچھ تو بزرگوں کی بلاواسطہ تقلید سے ہوتا ہے۔ اور کچھ بدمزاجی سے اور بنا بتہٗ انتقام لینے کے میلان سے پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ دونوں باتیں سزاؤں اور دھمکیوں کا نتیجہ ہیں۔ جس تربیت کا حال ہم بیان کر چکے ہیں۔ اُس کی بدولت جذبات طبیعت کا عمل زیادہ قوی ہو جاتا ہے۔ اور تازگی کی انشاط انگیز حالت بچوں کے دل میں قایم ہو جاتی ہے۔ اور اس میں کچھ کلام نہیں ہو سکتا کہ اس وجہ سے بچے ضرور اس بات سے باز رہیں گے کہ ایک دوسرے کے خلاف اتنی کثرت سے اور ایسے سخت قصور کریں۔ جو قصور اس سے بھی زیادہ قابل الزام ہیں۔ مثلاً جھوٹ اور چھوٹی موٹی چوری۔ وہ بھی اِن ہی اسباب سے کم ہو جائیں گے۔ خانگی تنافر ایسے قصوروں کا بڑا سرچشمہ ہے۔ فطرت انسانی کا یہ ایک قانون ہے۔ اور جو لوگ مشاہدہ کرتے ہیں اُن سب کو صاف نظر آتا ہے۔ کہ جن لوگوں کو اعلیٰ درجہ کی تفریحوں سے روکا جاتا ہے۔ وہ ادنیٰ درجہ کی تفریحوں پر گر پڑتے ہیں۔ جن لوگوں کے پاس ہمدردی کی خوشیاں نہیں ہوتیں۔ وہ خود غرضی کی خوشیاں ڈھونڈھتے ہیں۔ اور برعکس اس کے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ والدین اور اولاد کے درمیان مسرت انگیز تعلقات کا قایم رہنا اُن قصوروں کی تعداد کو گھٹاتا ہے۔ جن کی جڑ خود غرضی ہے۔

سخت قصوروں کی حالت میں بھی قدرتی طریقہ تربیت اختیار کرنا چاہیئے

مگر جب بچوں سے اِس قسم کے قصور سرزد ہوں - جیسا کہ بہتر سے بہتر طریقہ تربیت میں بھی کبھی کبھی سرزد ہوں گے - اُس وقت بھی قدرتی نتائج کی تربیت اختیار کی جا سکتی ہے - اور اگر والدین اور اولاد میں اعتماد اور محبت کا وہ تعلق موجود ہو جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے - تو یہ تربیت کارگر ہوگی - وجہ یہ ہے کہ قدرتی نتیجے مثلاً چوری کی سزا - دو قسم کے ہوتے ہیں - بلاواسطہ اور بالواسطہ - بلاواسطہ نتیجہ جو خالص انصاف پر مبنی ہے - یہ ہے کہ مال مسروقہ واپس دلایا جائے - منصف حاکم (اور ہر ایک ماں باپ کو ایسا ہی بننے کا ارادہ رکھنا چاہیئے -) یہ خواہش کرے گا کہ حتی الامکان غلط عمل کی تلافی صحیح عمل سے کی جائے اور چوری کی حالت میں اس کے یہ معنی ہیں کہ یا تو چرائی ہوئی چیز واپس دی جائے - یا اگر وہ خرچ ہو گئی ہو - تو اس کی قیمت دی جائے - اور بچہ چوری کرے تو یہ معاوضہ اُس کے جیب خرچ سے پورا ہو سکتا ہے - بالواسطہ نتیجہ جو زیادہ باوقعت ہے - والدین کی سنجیدہ ناراضی ہے - اور اُن تمام قوموں میں جو اس قدر مہذب ہیں کہ چوری کو جرم سمجھتی ہیں - یہ نتیجہ ضرور پیش آتا ہے - مگر اس پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ "والدین کی ناراضی کا اظہار - خواہ الفاظ میں ہو خواہ مار پیٹ سے - یہ تو ایسی حالتوں میں ایک معمولی سی بات ہے - اور یہ طریقہ کوئی نئی بات نہیں بتاتا" بالکل ٹھیک ہے - ہم پہلے ہی تسلیم کر چکے ہیں کہ بعض صورتوں میں اس طریقہ کی پیروی قدرتی طور پر کی جاتی ہے - ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ تعلیمی طریقوں کا میلان یہ ہے کہ صحیح طریقہ کی طرف رجوع کریں - اور جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں - یہاں بھی یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ اگر مہربانی کا برتاؤ رکھا جائے تو اس قدرتی سزا کی سختی - ضرورتوں کے موافق ہوگی - یعنی والدین کی ناراضی نسبتہً وحشیانہ زمانہ میں جب کہ بچے بھی نسبتہً وحشی ہوتے ہیں - سخت تدبیروں کی شکل میں ظاہر ہوگی - اور زیادہ ترقی یافتہ معاشرت کی حالتوں میں جہاں بچے

بھی اسی وجہ سے نرم برتاؤ کے سزاوار ہیں۔ کم بے رحمی کی صورت میں ظاہر ہوگی۔ مگر یہاں جس بات پر غور کرنے سے ہم کو خاص کر تعلق ہے۔ وہ یہ ہے کہ والدین کی سخت ناراضی جو ان سخت قصوروں میں سے کسی قصور پر ظاہر ہوتی ہے۔ جس قدر کہ والدین اور اولاد میں گرم جوشی کا تعلق موجود ہوگا۔ ٹھیک اسی مناسبت سے اس ناراضی کا عمدہ اثر ہوگا۔ جس قدر استقلال کے ساتھ قدرتی سزا کی تربیت سے دوسری حالتوں میں کام لیا جاتا ہے۔ اس حالت میں بھی اسی قدر استقلال کے ساتھ یہ تربیت کارگر ہوگی۔ اس امر کے ثبوت کا تجربہ سب لوگ کر سکتے ہیں۔ اگر وہ اس کو تلاش کریں۔

مزید تشریح اس امر کی کہ خفیف اور نیز سخت قصوروں کے تدارک کے لیے قدرتی نتائج کی ترتیب مفید ہے

کیا ہر شخص کو یہ بات معلوم نہیں ہے کہ جب وہ کسی دوسرے شخص کو ناراض کرتا ہے۔ تو اس سے جس قدر اس کو پشیمانی ہوتی ہے (بے شک۔ دنیاوی اعتبارات وخیالات واسباب سے قطع نظر کرکے) وہ اسی قدر کم یا زیادہ ہوتی ہے۔ جس قدر کہ اس کو اس دوسرے شخص کے ساتھ ہمدردی ہوتی ہے؟ کیا وہ اس بات سے واقف نہیں ہے کہ اگر کسی دشمن کو ناراض کیا جائے۔ تو اس کو ایذا دینا پوشیدہ خوشی کا باعث ہوتا ہے نہ کہ رنج کا؟ کیا اس کو یہ بات یاد نہیں ہے کہ اگر کوئی محض اجنبی آدمی اس سے ناراض ہو جائے۔ تو اس کو بہت ہی کم پروا ہوتی ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ کوئی ایسا شخص ناراض ہو جائے۔ جس سے اس کی گہری دوستی تھی؟ برعکس اس کے کیا وہ ایک قابل وقعت اور عزیز دوست کے غصہ کو سخت بدنصیبی نہیں سمجھتا۔ اور کیا اس کو مدتوں اس بات کا سخت افسوس نہیں رہتا؟ پس ضرور ہے کہ اولاد پر والدین کی ناراضی کا اثر بھی اس باہمی تعلق کی نسبت سے کم یا زیادہ ہو۔ جو پہلے سے ان میں موجود ہے۔ جب والدین اور اولاد میں اجنبیت مستحکم ہو جائے۔ تو قصوروار بچہ کو محض خود غرضانہ خوف کا خیال ہوتا ہے

کہ اب عن قریب جسمانی سزا ملے گی۔ یا کسی فائدہ سے محروم رہوں گا۔ اور جب وہ اس سزا کی تکلیف بھگت لیتا ہے۔ تو اُس پُر ضرر مخالفت اور نفرت سے۔ جو اِس سزا کا نتیجہ ہے۔ یہ اجنبیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ برخلاف اس کے۔ جب فرزندانہ تعلق کا جوش جو والدین کی مستقل دوستی کا نتیجہ ہے۔ موجود ہوتا ہے۔ تو والدین کی ناراضی سے نفس کی جو حالت ہوتی ہے۔ وہ نہ صرف اُسی قسم کی آیندہ بدراہی کے لیے ایک مفید روک ہے۔ بلکہ بجائے خود بھی مفید ہے۔ ایسی محبت کرنے والے دوست کے سرپرست ہاتھ سے جاتے رہنے سے جو اخلاقی تکلیف ہوتی ہے۔ وہ اُس جسمانی تکلیف کی قایم مقام ہوتی ہے جو بچوں کو عموماً دی جاتی ہے اور اگر زیادہ نہیں تو اُس کے برابر موثر تو ضرور ہی ثابت ہوتی ہے۔ پہلے طریقہ سے تو بچوں کے دل میں خوف اور انتقام کا جوش پیدا ہوتا ہے۔ مگر بجائے اس کے دوسرے طریقہ سے اس بات کا جوش پیدا ہوتا ہے کہ والدین کے رنج کے ساتھ ہمدردی کریں۔ اِس بات پر سچی پشیمانی ظاہر کریں کہ ہم نے کیوں اُن کو رنج دیا۔ اور یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی کفارہ سے دوستانہ تعلق کو دوبارہ قایم کریں۔ بجائے اِس کے کہ انانیت کے خیالات پیدا ہوں۔ جن کی کثرت سے مجرمانہ افعال سرزد ہوتے ہیں۔ ایثار علی النفس کے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ جو مجرمانہ افعال کو روکتے ہیں۔ پس قدرتی نتائج کی تربیت سخت اور خفیف دونوں طرح کے قصوروں کے لیے سزاوار ہے۔ اور اُس کا عمل میں لانا ایسے قصوروں کے نہ صرف انسداد بلکہ استیصال کا باعث ہے۔

سخت گیری کے مضر نتائج اور اس کے متعلق سرجان لاک وغیرہ کی رائیں۔

المختصر۔ سچ تو یہ ہے کہ سختی سے سختی پیدا ہوتی ہے اور نرمی سے نرمی۔ جن بچوں کے ساتھ بے دردی سے سلوک کیا جاتا ہے

وہ بے درد ہو جاتے ہیں۔ مگر مناسب ہمدردی کے ساتھ سلوک کرنا اُن کی ہمدردی کو ترقی دینے کا وسیلہ ہے۔ سیاست ملکی کی طرح سیاست منزل میں بھی سخت ظالمانہ حکومت ہی سے اُن جرموں کی ایک بڑی تعداد پیدا ہوتی ہے جن کا انسداد کرنا پڑتا ہے۔ مگر برخلاف اِس کے نرم اور منصفانہ حکمرانی۔ نااتفاقی کے بہت سے اسباب کو روکتی ہے۔ اور تاثر کی حالت کو ایسا شائستہ بنا دیتی ہے۔ کہ خلاف ورزی کی طرف میلان کم ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ جان لاک[1] نے اب سے بہت پہلے کہا تھا کہ "تعلیم میں بہت سخت سزا دینے سے بہت ہی کم فائدہ ہوتا ہے۔ نہیں بلکہ زیادہ نقصان ہوتا ہے۔ اور میں یقین کرتا ہوں کہ جن بچوں کو بہت زیادہ سزا دی جاتی ہے۔ اُن میں سے شاذ و نادر ہی عمدہ ترین اشخاص نکلتے ہیں۔ بشرطیکہ باقی امور میں مساوی ہوں" اس رائے کی تصدیق میں ہم یہ بات بیان کر سکتے ہیں۔ جو پنٹن ول کے جیل خانہ کے سرکاری پادری مسٹر راجرز نے حال ہی میں عام طور پر ظاہر کی ہے کہ جن کم سن مجرموں کو سزائے تازیانہ دی جاتی ہے۔ وہی اکثر و بیشتر جیل خانہ میں واپس آتے ہیں" برعکس اس کے نرم برتاؤ کے مفید نتائج کی توضیح اُس واقعہ سے عمدہ طور پر ہوتی ہے۔ جو ایک فرانسیسی خاتون نے ہم سے بیان کیا تھا جس کے مکان میں ہم حال ہی میں بمقام پیرس مقیم رہے تھے۔ ایک چھوٹے لڑکے کی وجہ سے گھر میں ہر روز ایک اودھم مچا رہتا تھا۔ اور نہ تو کوئی شخص گھر پر اُس کا انتظام کر سکتا تھا اور نہ مدرسہ میں۔ خاتون موصوف نے ہم سے اس بات کی معذرت کر کے یہ کہا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ اس لڑکے کا کچھ علاج نہیں ہے۔ سوائے اُس

[1] جان لاک۔ ملک انگلستان کا رہنے والا مشہور فلسفی اور الٰہیات کا عالم گزرا ہے ۱۶۳۲ء میں پیدا ہوا تھا۔ ۱۷۰۴ء میں انتقال کیا۔ مترجم۔

علاج ہے کہ جس سے اوس کے بڑے بھائی کی اصلاح میں کامیابی ہوئی ہے۔ یعنی یہ کہ اُس کو انگلستان کے مدرسہ میں بھیج دیا جائے" اُس نے بیان کیا کہ یہ بڑا بھائی پیرس کے مختلف مدرسوں میں بالکل ناقابل تربیت ثابت ہو چکا تھا۔ اور ہم نے مایوسی کی حالت میں اُس کو انگلستان بھیج دینے کی صلاح پر عمل کیا۔ اور گھر واپس آنے پر وہ ایسا ہی نیک ہو گیا۔ جیسا کہ پہلے بد تھا۔ خاتون موصوف نے اس عجیب تبدیلی کو بالکل اس امر کی طرف منسوب کیا تھا کہ انگلستان کی تربیت مقابلتہً نرم ہے۔

اخلاقی تربیت کے متعلق چند نصیحتیں۔

اخلاقی تربیت کے اصول کی توضیح و تشریح تو اوپر بیان ہو چکی۔ اب سب سے بہتر بات یہ ہے کہ اس باب کے باقی ماندہ صفحات کو اُن چند بڑے بڑے مسائل کے بیان سے پُر کیا جائے۔ جو اُن اصول سے مستنبط ہوتے ہیں۔ اور اختصار کی غرض سے ہم اُن کو نصیحت کی شکل میں بیان کریں گے۔

پہلی نصیحت

بچہ سے بہت زیادہ اخلاقی نیکی کی توقع نہ رکھو۔ ابتدائی عمر میں ہر ایک مہذب آدمی کو اخلاق کی اُس حالت میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ جس کا ظہور وحشی نسلوں میں۔ جو کہ نوع انسان کا اصل سرچشمہ ہیں۔ ہوتا ہے۔ جس طرح بچہ کے خط و خال۔ مثلاً چپٹی ناک۔ کھلے کھلے نتھنے۔ موٹے موٹے ہونٹ پھیلی پھٹی۔ آنکھیں۔ چہرہ کی غیر موزونی۔ کچھ عرصہ تک وحشیوں کے خط و خال سے مشابہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح اُس کی فطرت بھی اُن سے مشابہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بے رحمی۔ چوری اور جھوٹ بولنے کی رغبت بچوں میں نہایت عام طور پر پائی جاتی ہے۔ اور جس طرح بچہ کے خط و خال میں تغیر واقع ہوتا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح اس رغبت میں۔ تربیت کی مدد کے بغیر بھی تھوڑا بہت تغیر ہو جاتا ہے۔ یہ عام خیال کہ "بچے معصوم" ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے تو صحیح ہے کہ ان کو

بُرائی کا علم نہیں ہوتا۔ مگر اس اعتبار سے بالکل غلط ہے کہ اُن میں بُرائی کا میلان نہیں ہوتا جیسا کہ دایہ خانہ میں آدہ گھنٹے کے مشاہدہ سے ہر شخص پر ظاہر ہو سکتا ہے جب بچوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ عام مدرسوں میں ہوتا ہے۔ تو وہ بمقابلہ بڑے آدمیوں کے آپس میں زیادہ وحشیانہ برتاؤ کرتے ہیں۔ اور اگر اُن کو ابتدائے عمر ہی سے اُن کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ تو اُن کا وحشی پن اور بھی زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے۔

بچوں کے لیے نیک چلنی کا اعلیٰ معیار قائم کرنا ہی نادانی نہیں ہے بلکہ بہت تاکید کے ساتھ نیک چلنی کی ترغیب دینی بھی نادانی ہے "قبل از وقت عقلی نشوونما" کے مضر نتیجوں کو اکثر آدمی پہلے ہی سے تسلیم کرتے ہیں۔ مگر اس امر کا تسلیم کرنا باقی ہے کہ "قبل از وقت اخلاقی نشوونما" کے نتیجے بھی مضر ہوتے ہیں۔ ہمارے اخلاقی قویٰ بھی مثل ہمارے اعلیٰ عقلی قویٰ کے نسبتًہ پیچیدہ ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ دونوں طرح کے قویٰ نسبتًہ دیر میں نشوونما پاتے ہیں۔ اور اگر اخلاقی قویٰ خواہ عقلی قویٰ میں تحریک کے ذریعہ سے بچپن ہی میں مستعدی پیدا کی جائے۔ تو یہ مستعدی آیندہ اخلاقی نقصان کے بغیر حاصل نہ ہوگی۔ اسی وجہ سے یہ عام بے قاعدگی دیکھی جاتی ہے کہ جو لوگ بچپن میں نوخیز نیکی کا نمونہ ہوتے ہیں۔ اُن کی حالت کا تغیر رفتہ رفتہ برائی کی جانب ہوتا ہے۔ جو بظاہر ناقابل تشریح معلوم ہوتا ہے اور بڑھنا تو کجا انجام کار متوسط درجہ سے بھی گر جاتے ہیں۔ مگر جو لوگ بڑے ہو کر اوروں کے لیے نسبتًہ نمونہ ہوتے ہیں۔ اُن کے بچپن کا زمانہ اکثر ایسا ہوتا ہے جس سے ہرگز امید نہیں ہوتی کہ وہ ہونہار ہوں گے۔

دوسری نصیحت

اسی لیے متوسط درجہ کی تجویزوں اور متوسط درجہ کے نتیجوں پر قناعت کرو۔ اگر تم یہ بات یاد رکھو کہ جس طرح اعلیٰ درجہ کی عقل آہستہ آہستہ حاصل ہوتی ہے

اسی طرح ضرور ہے کہ اعلیٰ درجہ کے اخلاق تک بھی تدریجی نشو و نما کے ذریعہ سے رسائی ہو۔ تو تم کو ان عیبوں پر صبر آجائے گا۔ جو تم کو اپنے بچہ میں ہر وقت نظر آتے ہیں اور تمہارا میلان ہمیشہ کی ڈانٹ ڈپٹ۔ دھمکی جھڑکی اور روک ٹوک کی طرف کم ہوگا۔ جس کی وجہ سے بہت سے والدین سخت خانگی اشتعال کی طرف بچوں کو ترغیب دیتے ہیں۔ اور یہ احمقانہ امید رکھتے ہیں۔ کہ اس طرح ہم اپنے بچوں کو ایسا بنالیں گے۔ جیسا اُن کو ہونا چاہیئے۔

سیاست منزل کی یہ آزادانہ شکل جس میں اس امر کی خواہش نہیں کی جاتی کہ بچہ کے چال چلن کے تمام جزئیات کا انتظام خود مختارانہ طور پر کیا جائے۔ اُسی طریقہ کا لازمی نتیجہ ہے۔ جس کی ہم حمایت کرتے ہیں۔ اگر تم یہ دیکھ کر اپنا اطمینان کرلو کہ تمہارا بچہ اپنے افعال کے قدرتی نتیجے ہمیشہ بھگتتا ہے۔ تو تم اُس زیادہ روک ٹوک سے بچ جاؤ گے جس میں اکثر والدین غلطی کرتے ہیں۔ اگر تم ایسا کرو کہ حتی الامکان اُس کو "تجربہ کی تربیت" پر چھوڑ دو۔ تو تم اُس کو اُس بناوٹی نیکی سے محفوظ رکھو گے جو حد سے زیادہ ضابطہ کی پابندی سے تربیت پذیر طبیعتوں میں پیدا ہو جاتی ہے یا اُس مخرب اخلاق مخالفت سے محفوظ رکھو گی جو آزاد طبیعتوں میں اُس ضابطہ کی پابندی سے پیدا ہوتی ہے

اگر تم یہ ٹھان لو کہ تمام حالتوں میں بچہ کے افعال پر قدرتی سزا دی جائے تو تمھارے اپنے مزاج کی بھی ایک مفید روک تھام ہو جائے گی۔ بہت سے والدین۔ بلکہ ہماری رائے میں زیادہ تر والدین جس طریقہ تعلیم کی پیروی کرتے ہیں۔ وہ اور کچھ نہیں۔ بس یہی طریقہ ہے کہ جس طرح بادی النظر میں سوجھ گیا اُسی طرح اپنے غصہ کا اظہار کر دیا۔ ماں اپنے بچوں کے چھوٹے موٹے قصوروں پر عموماً اس قسم کا سلوک کرتی ہے کہ اُن کو طمانچے مارتی ہے سختی کے ساتھ جھڑا جھڑا دیتی ہے۔ کرخت الفاظ کا استعمال کرتی ہے اور حقیقت میں غور سے

دیکھا جائے تو اُن میں سے اکثر قصوروں کو قصور نہیں کہہ سکتے) یہ برتاؤ عام طور پر ماں
ہی کے جذبات کا ظہور ہے جن پر اُس کو بخوبی قابو نہیں ہوتا - یا یوں کہو کہ یہ برتاؤ
زیادہ تر اُن جذبات کی تحریک کا نتیجہ ہے - نہ کہ مجرموں کو فائدہ پہنچانے کی خواہش کا -
لیکن اگر تم پر خلاف ورزی کی حالت میں اس بات کے سوچنے کے لیے توقف
کرو کہ اس کا باقاعدہ نتیجہ کیا ہونا چاہیے - اور قصوروار پر اس کا گہرا اثر ڈالنے کے لیے
سب سے عمدہ طریقہ کیا ہے - تو تم کو اپنے نفس کو قابو میں لانے کے
لیے وقت مل جائے گا - نرا اندھا غصّہ جو اول اول بھڑک اُٹھا تھا - دب
جائے گا - اور جذبہ کی شدّت کم ہو جائے گی - اور ظن غالب ہے کہ یہ بات تم کو حق سے
منحرف نہیں ہونے دے گی۔

تیسری نصیحت

مگر اس بات کے درپے نہ رہو کہ بے حس و حرکت آلہ کی طرح
برتاؤ کرو - یاد رکھو کہ بچہ کے افعال کی اُن قدرتی سزاؤں کے علاوہ - جو مختلف حالات
کے اثر سے اُس پر عاید ہوتی ہیں - تمہاری رضامندی یا نارضامندی بھی ایک
قدرتی سزا ہے - اور اُس کی ہدایت کے لیے جو وسائل مقرر ہیں - اُن میں سے
ایک وسیلہ یہ بھی ہے - جس غلطی پر ہم اعتراض کرتے رہے ہیں - وہ یہ ہے کہ جو
سزائیں قدرت نے مقرر کی ہیں اُن کے عوض میں والدین کی ناراضی اور مصنوعی
سزاؤں کو رکھا جاتا ہے - جب ہم یہ کہتے ہیں کہ "والدین کی ناراضی کو اِن قدرتی سزاؤں
سزاؤں کے عوض میں نہیں رکھنا چاہیے" تو ہم کو اِس بات سے ہرگز بحث نہیں
ہے کہ قدرتی سزاؤں کے ساتھ ساتھ بھی اُن کا استعمال نہ کرنا چاہیے - اگرچہ
ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ دوم درجہ کی سزا اول درجہ کی سزا کی جگہ غضب کرے
تاہم اُس کو اول درجہ کی سزا کے ساتھ بطور ضمیمہ - اعتدال کے ساتھ - شامل کرنا
مناسب ہے - جس قدر رنج یا غصّہ تم کو محسوس ہو - اُس کو الفاظ یا تیور کے ذریعہ سے

ظاہر کرنا چاہیے۔ مگر شرط یہی ہے کہ تمہاری عقل سلیم بھی اس بات کو قبول کرے۔ جو اثر تمہارے دل میں پیدا ہوگا۔ اُس کی نوعیت اور اُس کی مقدار تمہاری اپنی خصلت پر یقیناً منحصر ہوگی۔ اور اسی لیے یہ کہنا کہ "وہ اثر ایسا ویا ویسا ہونا چاہیئے" بے فائدہ ہے۔ مگر تم اس تاثر کو اُس تاثر میں تبدیل کرنے کی کوشش کر سکتے ہو۔ جس کی بابت تم کو یہ یقین ہے کہ اُس کو قایم رکھنا چاہیئے۔ مگر اس اظہار ناخوشی میں وہ انتہائی حدوں (افراط و تفریط) سے بچتے رہنا۔ نہ صرف اس اعتبار سے کہ یہ ناخوشی کس قدر سخت ہونی چاہیئے۔ بلکہ اس اعتبار سے بھی کہ کتنے عرصہ تک قایم رہنی چاہیئے ایک تو طبیعت کی نااستواری سے بچو۔ جو ماؤں میں نہایت عام طور پر پائی جاتی ہے جس کا یہ نتیجہ ہے کہ دھمکی اور معافی تقریباً ساتھ ہی ساتھ ہوتی ہیں۔ دوسرے ایسا نہ کرو کہ نا واجب طور پر بچہ سے بے تعلقی ظاہر کرتے رہو۔ مبادا اُس کو یہ عادت ہو جائے کہ وہ بغیر تمہاری دوستی کے زندگی بسر کر سکے۔ اور تمہارا رعب اُس کے دل سے اُٹھ جائے بچہ کی حرکات پر جو اخلاقی سزائیں تم کو دینی پڑتی ہیں۔ تم کو چاہیئے کہ ان سزاؤں کو حتی الامکان اُن سزاؤں کے مشابہ بناؤ جو تمہارے خیال میں کامل الفطرت والدین کو دینی پڑتی ہیں۔

چوتھی نصیحت

احکام کی تعداد میں کمی کرو۔ حکم صرف اُس وقت دو جب کہ تربیت کے دیگر وسائل بچہ کی سمجھ سے باہر ہوں یا اُن میں ناکامیابی رہی ہو مسٹر کرجا کہتے ہیں کہ "اکثر حکموں میں بمقابلہ بچہ کے فائدہ کے۔ والدین کے فائدہ کا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے" جس طرح تمدن کی ابتدائی حالت میں قانون کی خلاف ورزی کی سزا زیادہ تر اس وجہ سے نہیں دی جاتی تھی کہ یہ فعل حقیقتہً نا واجب ہے۔ بلکہ اس وجہ سے کہ وہ بادشاہ کے حکم کی بے وقعتی ہے۔ یعنی اُس کے برخلاف بغاوت ہے۔ اسی طرح بہت سے خاندانوں میں جو سزا قصوروار کو دی جاتی ہے

اُس کا محرک زیادہ تر نافرمانی کا غصّہ ہوتا ہے - نہ کہ قصور پر ملامت کرنا - اس قسم کی معمولی بات چیت سنو - کہ "تم کو میری نافرمانی کی کیا مجال ہے" ؟ "میں کہتا ہوں کہ حضرت یہ کام آپ سے کرا کے رہوں گا" "میں تم کو یہ بات جلد سکھا دوں گا کہ آقا کون ہے - میں یا تم" ؟ اور پھر غور کرو کہ یہ الفاظ یہ لہجہ اور یہ تیور کس بات پر دلالت کرتے ہیں ؟ ایسی گفت و گو میں بچہ کی بہبودی کے خیال کی بہ نسبت اُس کو مطیع و منقاد بنانے کا ارادہ زیادہ نمایاں طور پر نظر آتا ہے - اُس وقت تو والدین کی طبیعت کا اندازہ اُس مطلق العنان حاکم کے انداز سے کچھ ایسا مختلف نہیں ہوتا جو سرکش رعیت کو سزا دینے پر تلا بیٹھا ہو - مگر سلیم الطبع والدین مثل اُس مقنّن کے جس کو نوع انسان سے محبت ہے جبر و تعدی سے خوش نہیں ہوتے - بلکہ اس بات سے خوش ہوتے ہیں کہ جبر و تعدی کی ضرورت ہی نہ پڑے - چال چلن کے باضابطہ رکھنے کے لیے جہاں کہیں دوسرے طریقوں کو کامیابی کے ساتھ استعمال کر سکتے ہیں - وہاں بغیر قانون کے کام چلاتے ہیں - اور جب قانون کی ضرورت ہوتی ہے تو قانون کی طرف رجوع کرنے سے اُن کو افسوس ہوتا ہے - جیسا کہ مسٹر کرانے بیان کیا ہے کہ "ملکی سیاست کا سب سے عمدہ قاعدہ یہ ہے کہ حد سے زیادہ تحکم نہ کرو" یہی قاعدہ تعلیم میں بھی صادق آتا ہے "جن والدین کی تحکم کی خواہش اپنے فرض منصبی کے سچے خیال کی وجہ سے رُک جاتی ہے - اُن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنے بچوں کو ایسا بنائیں کہ جہاں تک ممکن ہو - وہ خود اپنے نفس کو قابو میں رکھیں - اور وہ تحکم کی طرف صرف اس وجہ سے رجوع کرتے ہیں - کہ وہ آخری علاج ہے -

پانچویں نصیحت

مگر جب کبھی حکم دو - قطعی طور پر اور استقلال کے ساتھ حکم دو - اگر صورت واقع ایسی ہے جس میں در اصل بجز تحکم کے کسی دوسری طرح برتاؤ ممکن نہیں ہے

تو اپنا حکم ناطق جاری کرو اور پھر ہرگز اس سے انحراف نہ کرو۔ جو کام تم کرنے والے ہو اُس کو اچھی طرح سوچ لو۔ تمام نتیجوں کا موازنہ کر لو۔ اس بات پر غور کرو کہ تمہارے ارادہ میں کافی استقلال ہے یا نہیں۔ اور جب آخرکار ایک قانون بنا لو۔ تو چاہے کتنا ہی نقصان ہو۔ اس کی تعمیل پر زور دو۔ تمہاری سزائیں اُن سزاؤں کے مشابہ ہونی چاہئیں۔ جو موجودات غیر ذی روح دیتے ہیں۔ یعنی اٹل ہونی چاہئیں جب بچہ پہلے پہل گرم بھوبل میں ہاتھ ڈالتا ہے تو اُس کا ہاتھ جل جاتا ہے۔ دوسری دفعہ بھی جل جاتا ہے۔ تیسری دفعہ بھی جل جاتا ہے۔ غرض ہر دفعہ جل جاتا ہے۔

اور اُس کو بہت جلد معلوم ہو جاتا ہے کہ گرم بھوبل کو نہیں چھونا چاہیئے۔ اگر تم بھی ایسے ہی مستقل رہو۔ یعنی اگر تم بچہ سے یہ بات کہدو کہ فلاں فلاں کاموں کی یہ یہ سزائیں ہیں اور وہ سزائیں ویسے ہی استقلال سے دی جائیں۔ تو جس طرح قوانین قدرت کی وقعت اُس کے دل میں پیدا ہوتی ہے تمہارے قوانین کی وقعت بھی جلد پیدا ہو جائے گی اور جب یہ وقعت ایک دفعہ قائم ہو گئی۔ تو بے انتہا خانگی خرابیاں رک جائیں گی۔ تعلیمی غلطیوں میں سے ایک نہایت ہی سخت غلطی بے استقلالی ہے جس طرح قوم میں۔ جب انصاف کا کوئی خاص انتظام نہیں ہوتا۔ تو جرائم کی زیادتی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح خاندان میں قصوروں کا بہت زیادہ بڑھ جانا۔ سزا دینے میں تامّل یا بے قاعدگی کا نتیجہ ہے کمزور ماں۔ جو ہمیشہ دھمکاتی رہتی ہے اور شاذونادر ہی دھمکی کو پورا کرتی ہے۔ جو جلدی میں قانون بناتی ہے۔ اور فرصت میں بیٹھ کر پچھتاتی ہے۔ جو ایک ہی قصور پر۔ جیسا کہ تلون مزاجی اُس کو سجھاتی ہے۔ کبھی سختی سے سلوک کرتی ہے۔ اور کبھی نرمی سے۔ اپنے لیے اور اپنے بچوں کے لیے مصیبتوں کا ذخیرہ جمع کرتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو اُن کی نظروں میں حقیر کرتی ہے۔ وہ نفس پر قابو نہ رکھنے کی مثال اُن کے سامنے پیش کرتی ہے۔ وہ اُن کو عدول حکمی کی

ترغیب دیتی ہے - کیوں کہ بچوں کو یہ امید ہوتی ہے کہ غالباً سزا نہیں ملے گی - وہ بے سد جھگڑے قصّے پیدا کرتی ہے - اور ساتھ ہی اپنے مزاج اور بچوں کے مزاج کو نقصان پہنچاتی ہے - وہ اُن کے دلوں میں اخلاقی ابتری پیدا کرتی ہے جس کی درستی آیندہ عمر میں بہت کچھ نقصان اُٹھانے کے بعد بمشکل ہو سکتی ہے - وحشیانہ خانگی حکومت بھی - اگر استقلال کے ساتھ عمل میں لائی جائے - اُس رحم دلی کی حکومت سے - جو بے استقلالی کے ساتھ عمل میں لائی جائے - زیادہ بہتر ہے -

ہم دوبارہ یہی کہتے ہیں کہ حتی الامکان جابرانہ تدبیروں سے بچو - لیکن جب تم دیکھو کہ تحکم دراصل ناگزیر ہے - اُس وقت سچ مچ خود مختار حاکم بن جاؤ -

چھٹی نصیحت

یاد رکھو کہ تمہاری تربیت کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ایک ایسا شخص پیدا کیا جائے - جو اپنے نفس پر آپ حکومت کر سکے - نہ کہ ایسا جس پر غیر حکومت کریں - اگر تمہاری اولاد کی قسمت میں غلاموں کی طرح زندگی بسر کرنا لکھا ہو تو جس قدر غلامی کی عادت اُن کو بچپن میں ڈالوائی جائے - اُسی قدر اچھا ہے - مگر چونکہ ان کو رفتہ رفتہ آزاد بننا ہے - جب کہ کوئی شخص اُن کے روزانہ چال چلن کی روک ٹوک کرنے والا نہ ہوگا - تو اُس وقت جب کہ وہ تمہارے زیر نظر ہیں - جس قدر اُن کو اپنے نفس پر قابو رکھنے کی عادت ڈلواؤ - اُسی قدر بہتر ہے - قدرتی نتایج کے ذریعہ سے تربیت کرنا ہی وہ طریقہ ہے - جو اُس معاشرت کے لیے جہاں تک کہ اب انگلستان میں ہماری رسائی ہوئی ہے - خاص کر موزون ہے - فیوڈل سسٹم کے زمانہ میں جب کہ اُن بڑی بڑی خرابیوں میں سے جن کا اہل شہر کو خوف لگا رہتا تھا - ایک خرابی اپنے بالا دستوں کا غصہ بھی تھا - اُس وقت یہی بات مناسب تھی کہ بچپن کے زمانہ میں والدین کی سختی - سیاست کا بڑا ذریعہ ہو - مگر اب کہ اہل شہر کو کسی سے کچھ اندیشہ نہیں ہے

اب کہ بھلائی یا برائی - جس کا وہ تجربہ کرتے ہیں - زیادہ تر وہی ہوتی ہے - جو باعتبار
نظام اشیاء کے - اِن کے ذاتی چال چلن کا نتیجہ ہوتی ہے - یہ امر ضروری ہے کہ وہ
ابتدائے عمر سے بذریعہ تجربہ اِن نیک و بد نتائج کا علم حاصل کرنا شروع کریں جو خاص خاص
قسم کے چال چلن سے قدرتی طور پر پیدا ہوتے ہیں - اس لیے والدین کو تربیت کا
مقصد ایسا قرار دینا چاہیئے - جس سے اُن کا تحکم کم ہو جائے - جب کہ وہ اُس تحکم کی بجائے
بچہ کے دل میں ضبط نفس کا وہ خیال پیدا کر سکیں - جو نتائج کی پیش بینی سے پیدا ہوتا ہے
شیر خواری کے زمانہ میں بہت کچھ تحکم کی ضرورت ہے - تین برس کا بچہ جو
کھلے استرہ سے کھیل رہا ہو - اُس کو اس بات کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ " وہ
نتائج کی تربیت " کے ذریعہ سے علم حاصل کرے - کیوں کہ ممکن ہے کہ اس کے نتائج
نہایت سخت ہوں مگر جوں جوں عقل بڑھتی جائے تحکمانہ مداخلتوں کی تعداد
کم ہو سکتی ہے - اور کم ہونی چاہیئے - تاکہ جب وہ زمانہ بلوغ کو پہنچ جائیں - تو
رفتہ رفتہ اُن مداخلتوں کا خاتمہ ہو جائے[1] - جملہ تغیرات خطرناک ہوتے ہیں - اور سب سے
زیادہ خطرناک وہ تغیر ہے جو گھر کے دائرہ کی پابندی سے نکل کر دنیا کی آزادی
میں قدم رکھتے وقت پیش آتا ہے - اسی وجہ سے جس حکمت عملی کی ہم حمایت کرتے
ہیں - اُس کی پیروی ضروری ہے - چوں کہ اس حکمت سے بچہ کی ضبط نفس کی طاقت
بڑھتی رہتی ہے - اور ضبط نفس کے اُس درجہ میں ترقی ہوتی رہتی ہے - جس میں اُس کو
چھوڑا گیا تھا - اور وہ اس طرح ایسی حالت تک بہ تدریج پہنچتا ہے - کہ بغیر کسی کی مدد کے
اپنے نفس پر قابو رکھ سکے - اِس لئے اس حکمت عملی پر کاربند رہنے سے وہ معمولی
تغیر پیش نہیں آ سکتا - جو طفولیت کی " بیرونی حکومت " سے جوانی کی " اندرونی حکومت

[1] اردو میں اس مضمون کی یہ مثل مشہور ہے " بارہ برس کو بیدہ کیا ؟ اور اٹھارہ برس کو قید
کیا " ؟ مترجم

تک یکایک پہنچتے وقت پیش آتا ہے - اور خوفناک ہوتا ہے - خانگی سیاست کی تاریخ - ملکی سیاست کی تاریخ کا کسی قدر نمونہ ہونا چاہیئے - یعنی ابتدا میں مطلق العنان حکومت - جہاں فی الحقیقت اُس کی ضرورت ہے - اور رفتہ رفتہ باضابطہ حکومت شروع ہونی چاہیئے - جس میں رعایا کی آزادی کسی قدر خاص طور پر تسلیم کی جاتی ہے - پھر رعایا کی اس آزادی کو بہ تدریج وسعت دی جائے - اور آخر کار والدین کی حکومت کو آہستہ آہستہ بالکل اُٹھا لیا جائے -

ساتویں نصیحت

اگر بچے زیادہ ہٹ اور خود رائی ظاہر کریں - تو اس کا افسوس نہ کرو - یہ اُس کم تر سخت گیری کا جواب ہے - جو زمانہ حال کی تعلیم میں نہایت نمایاں ہے - یہ جو بچوں کو آج کل زیادہ میلان اس بات کی طرف ہے کہ وہ اپنے فعل کی آزادی کے خواہاں رہتے ہیں - یہ اس امر کا جواب ہے کہ والدین اُن پر ظلم کرنے کا میلان کم رکھتے ہیں - یہ دونوں میلانات اُسی طریقہ تربیت کی طرف پہنچنا ظاہر کرتے ہیں جس پر ہم زور دے رہے ہیں - اور جس کی بدولت بچے قدرتی سزاؤں کا تجربہ کر کے روز بروز اس امر کی طرف زیادہ مائل ہوتے جاتے ہیں کہ اپنے نفس پر آپ حکومت کریں - اور یہ دونوں میلان ہماری زیادہ ترقی یافتہ معاشرت کے ساتھ ساتھ موجود رہتے ہیں آزاد انگریز لڑکا - آزاد انگریز آدمی کا باپ ہے - اور آزاد باپ بغیر آزاد لڑکے کے نہیں بن سکتا ملک جرمنی کے معلم کہتے ہیں کہ "ہم بارہ جرمنی لڑکوں کو قابو میں رکھ سکتے ہیں - مگر ایک انگریز لڑکے کو قابو میں نہیں رکھ سکتے" تو کیا اس وجہ سے ہم یہ خواہش کریں کہ ہمارے لڑکے ایسے تربیت پذیر ہو جائیں جیسے جرمنی لڑکے - اور اس کے ساتھ ہی بالغ اہل جرمنی کی سی کمینہ اطاعت اور ملکی غلامی حاصل کریں ؟ یا ہم اپنے لڑکوں میں اُن خیالات کو گوارا کریں - جو اُن کو آزاد آدمی بناتے ہیں - اور جو ہمارے طریقوں میں بھی اُسی کے موافق تبدیلی پیدا کرتے ہیں ؟ -

آٹھویں نصیحت

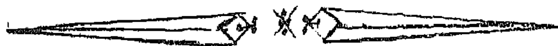
آخری نصیحت یہ ہے کہ یہ بات ہمیشہ یاد رکھو کہ ٹھیک ٹھیک تعلیم دینا سہل اور آسان کام نہیں ہے۔ بلکہ ایک پیچیدہ۔ نہایت مشکل۔ اور سب سے زیادہ سخت کام ہے جو بڑے آدمی کو اپنی زندگی میں کرنا پڑتا ہے۔ خانگی تربیت کا ناہموار طریقہ۔ جو لگتے ہاتھ بے سوچے سمجھے اختیار کیا جاتا ہے۔ اس کو تو نہایت ادنیٰ اور نہایت ناتربیت یافتہ عقل والے آدمی ہی برت سکتے ہیں۔ طمانچے اور سخت الفاظ ایسی سزائیں ہیں۔ جو نہایت ہی کم اصلاح یافتہ وحشی آدمی اور احمق سے احمق دہقان دونوں کو یکساں سوجھتی ہیں۔ وحشی جانور تک اس طریقہ تربیت کا استعمال کرسکتے ہیں۔ جیسا کہ تم دیکھتے ہو کہ جب کوئی پلا بہت زیادہ دق کرتا ہے تو کتیا اُس کو روکنے کے لیے اُس پر غراتی اور آہستہ سے کاٹتی ہے۔ لیکن اگر تم ایک معقول اور مہذب طریقہ کو کامیابی کے ساتھ عمل میں لانا چاہو۔ تو تم کو بہت کچھ عقلی محنت کے لیے۔ یعنی کسی قدر مطالعہ۔ کسی قدر ذہانت۔ کسی قدر صبر اور کسی قدر ضبط نفس کے لیے آمادہ رہنا چاہیے۔ تم کو ہمیشہ اس بات پر غور کرنی ہوگی کہ وہ کون سے نتیجے ہیں۔ جو بڑی عمر میں بعض قسم کے کاموں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور پھر تم کو ایسے طریقے تجویز کرنے چاہئیں جن سے بچوں کے اوسی قسم کے کاموں پر بھی اُسی قسم کے نتیجے عائد ہوں۔ اس بات کی ضرورت ہر روز پیش آئے گی کہ بچوں کے چال چلن کے محرکات کی چھان بین کی جائے۔ یعنی وہ کام جو حقیقت میں اچھے ہیں۔ اور وہ کام جو ادنیٰ درجہ کے محرکات کا نتیجہ ہیں۔ خواہ وہ عمدہ کاموں سے مشابہ ہی ہوں۔ اُن میں باہم تمیز کی جائے۔ اور تم کو اس جابرانہ غلطی کے رفع کرنے کے لیے۔ جو اکثر کی جاتی ہے۔ ہمیشہ خبردار رہنا پڑے گا۔ یعنی "جو کام نہ نیک ہیں نہ بد۔ اُن کو خواہ مخواہ قصور سمجھ لیا جاتا ہے۔ اور جو جذبات بچوں کے دل میں ہوتے ہیں۔ اُن سے بدتر جذبات اُن کی طرف منسوب کر دیے جاتے ہیں" اپنے طریقہ کو ہر بچے کے مزاج

کے موافق بنانے کے لیے۔ تم کو اُس میں تھوڑی بہت تبدیلی ضرور کرنی چاہیے اور جوں جوں ہر بچہ کا مزاج نئی نئی صورتیں اختیار کرے۔ تم کو اور بھی زیادہ تبدیلی کرنے کے لیے مستعد رہنا چاہیے۔ جس طریقہ سے بظاہر کوئی نتیجہ نہ نکلتا ہو۔ یا کم نتیجہ نکلتا ہو۔ اُس پر استقلال کے ساتھ قائم رہنے کے لیے۔ تم کو اکثر اوقات اپنے یقین کو مضبوط رکھنا پڑے گا۔ اگر تم کو ایسے بچوں سے سابقہ پڑے۔ جن کی تربیت غلط طریقہ پر ہوئی ہے۔ تو تم کو ایک مدت مدید تک صبر کی آزمائش کے لیے مستعد رہنا چاہیے۔ تب جا کر بہتر طریقوں میں کامیابی ہوگی۔ کیونکہ جو تربیت وہاں بھی آسان نہیں ہے۔ جہاں ابتدا ہی سے صحیح خیالات موجود ہوتے ہیں۔ وہ اُس وقت تو دوچند مشکل ہو جائے گی۔ جب کہ غلط خیالات کو صحیح کرنا ہو۔ تم کو ہمیشہ بچوں ہی کے محرکات کی چھان بین نہیں کرنی پڑے گی۔ بلکہ خود اپنے محرکات کی بھی چھان بین کرنی پڑے گی۔ یعنی تم کو دو قسم کے خیالات میں تمیز کرنی ہوگی۔ ایک وہ جو سچی پدرانہ خیر خواہی سے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور دوسرے وہ جو تمہاری اپنی خود غرضی۔ آرام طلبی اور خواہش تحکم کے سبب پیدا ہوتے ہیں۔ اور پھر اس سے بھی زیادہ صبر آزما بات یہ ہے کہ تم کو ان کمینہ رغبتوں کا نہ صرف پتا لگانا پڑے گا۔ بلکہ اُن کو مغلوب کرنا بھی پڑے گا۔ المختصر جب تم بچوں کو تعلیم دو تو اُس کے ساتھ ہی اپنی اعلیٰ تعلیم بھی تم کو جاری رکھنی پڑے گی۔ بحیثیت عقلی تم کو یہ لازم ہے کہ سب سے زیادہ پیچیدہ مضمون۔ یعنی انسانی فطرت اور اُس کے قوانین کو جس طرح کہ اُن کا ظہور تمہارے بچوں میں۔ تمہارے نفس میں۔ اور دنیا میں ہوتا ہے۔ ایسی ترقی دو کہ اُن سے نیک مقصد حاصل ہو۔ بحیثیت اخلاقی تم کو یہ لازم ہے کہ اعلیٰ درجہ کے خیالات کی مشق ہمیشہ جاری رکھو۔ اور ادنیٰ درجہ کے خیالات کی روک تھام رکھو۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ جس کی صداقت عام طور پر ابھی تسلیم

نہیں کی گئی - کہ صرف فرائض والدین کے ادا ہونے کی بدولت ہی ہر زن و مرد عقلی نشو و نما کے آخری درجہ پر پہنچتا ہے - اور جب یہ حقیقت مسلّم ہو جائے گی - اُس وقت یہ بات معلوم ہو گی کہ وہ انتظام کیسا قابل تعریف ہے جس کی بدولت لوگوں کے نہایت قوی جذبات اُن کو اس بات کی ہدایت کرتے ہیں کہ اپنے نفس کی ایسی تربیت کریں - جو اور کسی طرح اُن کو حاصل نہیں ہو سکتی -

انسانی تربیت کا کامل نمونہ نوع انسان کی ترقی یافتہ حالتوں کے لیے مناسب ہے اور یہ طریقہ والدین اور اولاد دونوں کے لیے مفید ہے

جہاں بعض آدمی تعلیم کے اس خیال کو کہ "تعلیم کیسی ہونی چاہیئے" شبہ کی نظر سے دیکھیں گے - اور اُس سے اُن کی ہمت ٹوٹ جائے گی - وہاں - ہمارا خیال ہے کہ بعض آدمیوں کو اس خیال کے واقعی ہونے کا ثبوت ملے گا - کیونکہ تعلیم کا کامل نمونہ یہی ہے - ضعیف الرائے - بے درد - اور کوتاہ نظر اِس بات کو سمجھ نہیں سکیں گے - بلکہ اِس کے سمجھنے کے لیے فطرت انسانی کے اعلیٰ اوصاف (قوت رائے - ہمدردی - اور عقل دوربین) کی ضرورت ہے - اس لیے وہ دیکھیں گے کہ اس قسم کی تعلیم نوع انسان کی زیادہ ترقی یافتہ حالتوں کے لیے مناسب ہے - اگرچہ اس میں بہت محنت اور نفس کُشی کی ضرورت ہے - تاہم وہ دیکھیں گے کہ اُس سے خوشی کا ایک کثیر معاوضہ ملنے کی توقع ہے - خواہ فوراً ملے خواہ کچھ عرصہ کے بعد - وہ یہ بھی دیکھیں گے - کہ تربیت کا بُرا طریقہ والدین اور اولاد دونوں کے لیے مضر نتیجے پیدا کرتا ہے - اور اسی لیے دُہری آفت ہے - مگر اچھا طریقہ دُہری برکت ہے - یعنی تربیت کرنے والے کو - اور جس کی تربیت کی جاتی ہے - اُس کو بھی برکت دیتا ہے -



باب چہارم

تعلیم جسمانی

ہر طبقہ کے لوگ امرا۔ غربا دیہاتی۔ شہری وغیرہ مویشیا کی پرورش اور اُن کے انتظام سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔

خواہ نواب کے دسترخوان پر۔ جب کہ بیگمات کھانا کھا کر چلی جاتی ہیں۔ خواہ کسانوں کے معمولی بازار میں۔ اور خواہ گاؤں کے بوزہ خانہ میں۔ سب جگہہ متداول ملکی مسئلہ پر بحث کرنے کے بعد جس مضمون سے لوگوں کو بالعموم سب سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ وہ مویشی کا انتظام ہے۔ جب شکاری شکار سے فارغ ہونے کے بعد سوار ہو کر گھر کی طرف واپس آتے ہیں۔ تو گفت و گو کا میلان عموماً گھوڑوں کی نسل بڑھانے اور اُن کے نسب ناموں۔ اور کسی نہ کسی ”عمدہ مضمون“ کی طرف ہوتا ہے۔ اور اگر کسی مرطوب سرزمین میں شکار کا اتفاق ہوا ہے۔ تو غالباً جب تک کتوں کے علاج کی بابت کچھہ نہ کچھہ بات چیت نہ ہولے۔ اُس وقت تک وہ دن ختم نہ ہوگا۔ جب پاس پاس کے کھیتوں کے مزارع گرجا گھر سے واپس آتے وقت اکٹھے ہو کر کھیتوں میں سے گزرتے ہیں۔ تو وعظ پر نکتہ چینی کرتے کرتے موسم۔ فصل۔ اور ذخیرہ پر نکتہ چینی کرنے لگتے ہیں۔ اور پھر اُسے چھوڑ کر مختلف قسم کے چارے۔ اور اُس کے پرورش کرنے والی خاصیتوں کے متعلق بحث چھڑ جاتی ہے۔ زید و عمر اپنے اپنے سُور خانوں کے متعلق اپنی یادداشتوں کا باہم مقابلہ کر کے اپنی گفت و گو سے یہ بات ظاہر کرتے ہیں کہ ہم اپنے مالکوں کے مویشیوں اور بھیڑوں کی عمدہ نگرانی کرتے ہیں۔ اور اُن نتیجوں

پر غور کرتے ہیں جو خاص خاص علاجوں سے ان پر مترتب ہوتے ہیں - تازی خانہ اصطبل - گئوشالہ اور بھیڑوں کے بارے کے قواعد و ضوابط نہ صرف دیہاتی لوگوں کو دل پسند ہیں - بلکہ شہروں میں بھی بے شمار اہل حرفہ[1] جو کتے پالتے ہیں - اور وہ نوجوان[2] جن کو اتنا مقدور ہے کہ کبھی کبھی اپنے شکار کے شوق کا لطف اٹھائیں - اور ان سے زیادہ متین[3] بزرگ جو ترقی زراعت پر گفت و گو کرتے ہیں - اور مسٹر میکی کی سالانہ رپورٹوں اور مسٹر کیرڈ[5] کی ان چٹھیوں کو پڑھتے ہیں جو انہوں نے اخبار ٹائمز کو لکھی تھیں اگر ان سب کی تعداد کو جمع کیا جائے تو ملک کا بڑا حصہ ایسے ہی لوگ نکلیں گے - اگر تمام سلطنت کے بالغ مردوں کو لو - تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے اکثر کسی نہ کسی قسم کے جانوروں کی نسل بڑھانے - ان کو پرورش کرنے یا سدھانے کا کچھ نہ کچھ شوق رکھتے ہیں -

بچے بچوں کی پرورش اور پیٹے لوگ عموماً بالکل لا ہیں -

مگر کھانا کھانے کے بعد جو بات چیت ہوتی ہے اس وقت - یا اسی قسم کی ملاقات کے دوسرے موقعوں پر - آدمی کے بچوں کی پرورش کے متعلق کبھی کسی نے ذکر سنا ہے ؟ جب کوئی دیہاتی شریف اپنے اصطبل کا روزانہ معائنہ کر چکتا ہے اور اپنے گھوڑوں کی حالت اور ان کے علاج معالجہ کا بابت خود ملاحظہ کر چکتا ہے جب وہ اپنے چھوٹے چھوٹے وصن کو ایک نظر دیکھ چکتا ہے اور نوکروں چاکروں کو ہدایتیں کر چکتا ہے تو بھلا وہ دایہ خانہ میں جا کر خورد و نوش کے انتظام غذا کے اوقات اور ہوا کی آمد و رفت کو دن میں کتنی دفعہ دیکھتا بھالتا ہے (ایک دفعہ بھی نہیں) - اس کے کتب خانہ کی الماریوں میں ایسی کتابیں تو مل سکتی ہیں - جیسے وائٹ صاحب کی کتاب "بیطاری" سیٹون صاحب کی کھیت

---

[5] مسٹر جیمز کیرڈ ملک سکاٹ لینڈ کا باشندہ - علم فلاحت کا ماہر - اور مدبر سلطنت تھا سنہ ۱۸۱۶ء میں پیدا ہوا اور سنہ ۱۸۹۲ء میں انتقال کیا - مترجم

کی کتاب ۔ بخود صاحب کی کتاب "شکاریوں کی حالت" اور اُس کو اِن کے مضامین سے تھوڑی بہت واقفیت ہوتی ہے ۔ مگر اُس نے بچوں کے زمانہ شیر خواری اور طفولیت کے انتظام کے متعلق کتنی کتابیں پڑھی ہیں ؟ (ایک بھی نہیں) اس قسم کی باتوں سے کہ "وہ کھل میں مویشی کو موٹا تازہ بنانے کی خاصیت ہے" "سوکھی گھاس اور بھوسے کی قدر و قیمت میں کیا مناسبت ہے" "حد سے زیادہ کلا و (گھاس) کھلانے سے مویشی کو کس نقصان کے پہنچنے کا خطرہ ہے" ہر ایک زمین دار ۔ کسان ۔ اور دہقان کو کچھ نہ کچھ واقفیت ہوتی ہے ۔ مگر اُن میں فی صدی کتنے آدمی ایسے ہیں جو اس بات کی تحقیقات کرتے ہیں کہ آیا وہ خوراک ۔ جو ہم اپنے بچوں کو دیتے ہیں ۔ نمو کرنے والے لڑکوں اور لڑکیوں کی جسمانی ضرورتوں کے موافق ہے یا نہیں ؟ اس قسم کے لوگوں کی بابت اس بے قاعدگی کی وجہ شاید یہ بتائی جاسکے کہ اُن کو ان ہی کاموں سے تعلق ہے ۔ مگر یہ وجہ ناکافی ہے کیوں کہ یہی بے ربطی اور لوگوں میں بھی پائی جاتی ہے ۔ بیس شہری آدمیوں میں سے ۔ اگر ہوں تو ایک ہی دو آدمی اس بات سے ناواقف ہوں گے کہ جب گھوڑا چارا کھا چکے تو اُسی وقت اُس سے کام نہیں لینا چاہئے مگر ان ہی بیس میں سے ۔ اگر بالفرض سب کے سب صاحب اولاد ہوں ۔ غالباً ایک بھی ایسا نہیں ملے گا جس نے اس بات پر غور کی ہو کہ بچوں کے کھانا کھانے اور سبقوں کے دوبارہ شروع کرنے کے درمیان کا وقفہ کافی ہے یا نہیں ۔ درحقیقت اگر جرح کے سوالات کئے جائیں تو قریب قریب ہر شخص اِس پوشیدہ رائے کو ظاہر کردیگا کہ "بچوں کے کھانے پینے کا انتظام میرا کام نہیں ہے" وہ غالباً یہ جواب دے گا "اجی ! میں تو یہ سب کام عورتوں پر چھوڑ دیتا ہوں" اور اکثر حالتوں میں اُس جواب کے لہجہ سے اشارۃً یہ مفہوم ہوگا کہ "ایسی غور و پرداخت مردوں کی شان کے شایاں نہیں ہے"

حیوانات کی پرورش کی طرف تو اس قدر رغبت! اور اپنے بچوں کی پرورش سے اس قدر غفلت! عجیب حماقت ہے۔

اگر رسمی حیثیت سے قطع نظر کر کے کسی دوسری حیثیت سے اِس پر غور کی جائے تو یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ اول درجہ کے بچھڑوں کا تیار کرنا تو ایسا کام ہے جس پر تعلیم یافتہ مرد خوشی خوشی بہت سا وقت اور خیال صرف کرتے ہیں۔ مگر تعلیم و تربیت کے ذریعہ سے اچھے انسان پیدا کرنا ایسا کام ہے جس کی نسبت کنایۃً یہ راے دی جاتی ہے کہ وہ اُن کی توجہ کے لایق نہیں ہے۔ مائیں جن کو السنہ۔ موسیقی اور "ہنرمندی و خوش سلیقگی" کے سوا اور کسی چیز کی تعلیم بہت ہی کم دی جاتی ہے۔ اِن کی نسبت یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اناؤں کی مدد سے جن میں نہایت پرانے تعصبات بھرے ہوتے ہیں۔ بچوں کے خورونوش۔ لباس۔ اور ورزش کا انتظام کرنے کی لیاقت رکھتی ہیں۔ اِس اثنا میں باپ کتابیں اور رسالے پڑھتے ہیں۔ زراعتی جلسوں میں شریک ہوتے ہیں۔ تجربے کرتے ہیں۔ مباحثوں میں مصروف رہتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ اِس غرض سے کہ قابل انعام سوروں کو موٹا تازہ بنانے کا طریقہ معلوم ہو جائے! ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ایسا گھوڑا تیار کرنے کے لیے جو ڈربی[۵۱] کی گھوڑدوڑ میں بازی لے جائے۔ بے حد محنت و جاں فشانی کی جاتی ہے۔ اور زمانہ حال کا پہلوان پیدا کرنے کے لیے مطلق کوشش نہیں کی جاتی۔ اگر گلور باشندگاں لیلیپوٹا[۵۲] کے حالات میں یہ بیان کرتا کہ وہاں کے مرد اس بات کا

[۵۱] ڈربی انگلستان کا ایک ضلع ہے۔ معدنیات اور ریشم کی دستکاری کی وجہ سے خاص کر مشہور ہے اور آج کل انگلستان میں گھوڑدوڑ کا بڑا مرکز ہے۔ مترجم

[۵۲] مسٹر سوفٹ نے ایک فرضی قصہ موسوم بہ "سفرنامہ گلور" لکھا ہے۔ گلور اس قصہ کا ہیرو (موضوع) لیلیپوٹا ایک فرضی جزیرہ ہے جس کا ذکر اس سفرنامہ میں آیا ہے۔ گلور سفر کرتا کرتا اس جزیرے میں جا پہنچتا ہے۔ یہ جزیرہ بالکل گول ہے۔ اس کا قطر ساڑھے چار میل کے قریب ہے۔ یہاں کے باشندوں کی نسبت عجیب و غریب باتیں بیان کی گئی ہیں! اور یہ لکھا ہے کہ وہ محض خیالی باتوں میں مصروف رہتے ہیں اور کام کی باتوں کی طرف سے غافل رہتے ہیں۔ مترجم

علم حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے خواہاں رہتے ہیں کہ حیوانات کے بچوں کی پرورش کا بہترین طریقہ کون سا ہے - اور خود اپنے بچوں کی پرورش کا عمدہ ترین طریقہ دریافت کرنے سے غافل ہیں - تو یہ بات بھی اُن ہی حماقتوں کی ہم پلہ ہوتی - جو اوس نے اُن کی طرف منسوب کی ہیں -

بچوں کی جسمانی تربیت نہایت ضروری ہے اور روز بروز اس کی ضرورت بڑھتی جاتی ہے -

مگر یہ بات سرسری نہیں ہے - اگرچہ یہ مقابلہ ایک ہنسی کی بات ہے تاہم جو نتیجہ اس سے نکلتا ہے وہ کچھ کم مصیبت نہیں ہے - جیسا کہ ایک لائق مصنف لکھتا ہے - کہ زندگی میں کامیابی کی پہلی شرط "اچھا حیوان بننا" ہے اور قومی اقبال مندی کی پہلی شرط اچھے حیوانوں کی قوم بننا ہے - یہی بات نہیں کہ جنگ کا نتیجہ زیادہ تر سپاہیوں کی طاقت اور جفاکشی پر منحصر ہے - بلکہ تجارت کے جھگڑے تصفیے بھی ایک حد تک تجارتی مال پیدا کرنے والوں کی جسمانی جفاکشی کی بدولت طے ہوتے ہیں - میدان جنگ اور میدان تجارت میں دوسری قوموں کے ساتھ زور آزمائی کرنے سے ہم کو خوف کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی - مگر اس بات کے آثار کچھ کم نہیں ہیں کہ عن قریب ہماری قوتوں پر حد سے زیادہ بوجھ پڑنے والا ہے - آج کل زندگی بسر کرنے کی کشاکش اس قدر سخت ہو گئی ہے - کہ بہت ہی کم لوگ - بغیر کسی نقصان کے - ضروری محنت برداشت کر سکتے ہیں - ہزاروں آدمی پہلے ہی اس بوجھ سے کچلے جا رہے ہیں جس کے نیچے وہ دبے ہوئے ہیں - اگر یہ بوجھ - جیسا کہ ظن غالب ہے - اسی طرح بڑھتا رہا - تو وہ نہایت ہی صحیح القویٰ لوگوں کو بھی تھکا کرے گا - اسی لیے یہ بات خاص طور پر مہتم بالشان ہوتی جاتی ہے کہ بچوں کی تربیت اس طرح کی جائے کہ جو محنت اُن کو در پیش ہے اس کے لیے نہ صرف عقلی قابلیت ہی نہیں - بلکہ اُس محنت سے جو سخت تکان اور ضعف ہوتا ہے اُس کے برداشت کرنے کے لیے جسمانی قابلیت

بھی پیدا ہو جائے۔

خوش قسمتی سے اس معاملہ پر لوگ توجہ کرنے لگے ہیں۔ مسٹر کنگسلے[۱] نے اپنی تحریروں میں حد سے زیادہ تربیت کی مخالفت کی ہے۔ جو شاید کسی قدر اعتدال سے گزر گئی ہے۔ جیسا کہ اس قسم کی مخالفتوں میں ہوا کرتا ہے۔ اخباروں میں کبھی کبھی اس قسم کی چٹھیاں اور مضامین لکھے جاتے ہیں۔ جن سے ظاہر ہے کہ لوگوں کو جسمانی تربیت کا شوق پیدا ہوتا جاتا ہے۔ اب ایک مدرسہ قائم ہوا ہے جس کا نام "استھنزا ورتھنوسند علیسائیت" رکھا گیا ہے جس سے اس مدرسہ کا مقصد صاف معلوم ہوتا ہے۔ یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ لوگوں کی رائے یہ ہوتی جاتی ہے کہ تربیت اولاد کے موجودہ طریقوں میں جسم کی بہبودی کا لحاظ کافی طور پر نہیں رکھا جاتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ مضمون عنقریب معرض بحث میں آنے والا ہے۔

جسمانی تربیت کی طرف آجکل لوگوں کی توجہ مبذول ہونے لگی ہے

ہم کو ضرورت اس بات کی ہے کہ دایہ خانہ اور مدرسہ کے دستور العمل کو آجکل کے سائنس کے مسلمہ حقائق کے موافق بنایا جائے۔ اب وقت آگیا ہے کہ کیمیائی کارخانوں کی تحقیقات سے جو فائدے بھیڑوں اور بیلوں کو پہنچ رہے ہیں اُن فائدوں میں اپنے بچوں کو بھی حصہ دیا جائے۔ گھوڑوں کے سدھانے اور سؤروں کے پالنے کی بڑی ضرورت ہے۔ اس پر ہم کو کچھ اعتراض نہیں۔ مگر بچوں کو اس طرح پرورش کرنا کہ وہ بڑے ہو کر پورا نمو حاصل کریں۔ آخر اس کی بھی تو کچھ نہ کچھ وقعت ہے۔ اس لیے ہم یہ بات سمجھانی چاہتے ہیں۔ کہ جس طرح مویشیوں کی پرورش میں اُن نتائج پر کاربند رہتے ہیں۔ جو قیاس سے صحیح معلوم ہوتے ہیں اور عمل سے جن کی تصدیق ہوتی ہے اسی طرح اولاد کی پرورش میں بھی اُن پر کاربند رہنا چاہیے۔ خیالات کی اس ترتیب سے

جسمانی تربیت کا انتظام سائنس کے حقائق مسلمہ کے موافق ہونا چاہیے۔

---

[۱] ریورنڈ چارلس کنگسلے۔ انگلستان کا مشہور مصنف ہے ۱۸۱۹ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۸۷۵ء میں فوت ہوا۔ مترجم

غالباً بہت سے آدمی چونکنا ہوجائیں گے - بلکہ شاید ناخوش ہوں گے - مگر یہ بات کہ انسان بھی ان ہی قوانین منضبطہ کا تابع ہے - جن کے تابع ادنیٰ حیوانات ہیں ایک ایسی بات ہے - جس میں کچھ کلام نہیں ہوسکتا اور جسے ہم کو مان لینا چاہیے - کوئی عالم تشریح الابدان - کوئی عالم علم الاعضاء - کوئی کیمیاگر - ایک لمحہ کے لیے بھی اس بات کے تسلیم کرنے میں پس وپیش نہیں کرے گا کہ جو عام اصول حیوانات کے جسمانی نشوونما پر صادق آتے ہیں - وہی اصول انسان کے جسمانی نشوونما پر صادق آتے ہیں اور اس بات کا سچے دل سے تسلیم کرلینا رائگاں نہ جائے گا - یعنی حیوانات پر تجربہ اور مشاہدہ کرنے کے بعد جو اصول کلیہ قائم کیے گئے ہیں وہی انسان کی ہدایت کے لیے بھی مفید ہوسکتے ہیں - اگرچہ علم الحیات ابتدائی حالت میں ہے تاہم بعض ابتدائی اصول تک اس کی رسائی ہوچکی ہے جو جملہ اجسام نامیہ کی نموکی - جن میں انسان بھی شامل ہے - بنیاد ہیں - جو کام ہم کو اب کرنا ہے اور جس کے لیے ہم کسی قدر کوشش کریں گے - وہ اس بات کا پتا لگانا ہے کہ ان بنیادی اصول کو بچپن اور جوانی کی جسمانی تربیت سے کیا تعلق ہے -

معاشرت کی ہر ایک حالت کا میلان کبھی افراط کی طرف ہوتا ہے اور کبھی تفریط کی طرف

معاشرت کے ہر ایک درجہ میں اس بات کا پتا مل سکتا ہے کہ ہر شے کا میلان اُتار چڑھاؤ کی طرف ہے - اس کی مثال یہ ہے کہ انقلاب سلطنت کے بعد ظلم و تعدی کا دور دورہ ہوتا ہے - اور ہم لوگوں میں اس کی مثال یہ ہے کہ زمانہ اصلاح اور زمانہ پابندی رسوم قدیمہ کا ایک دوسرے کے بعد دورہ ہوتا رہتا ہے - اسی میلان کی وجہ سے زمانہ نفس پرستی کے بعد زمانہ رہبانیت کا اور زمانہ رہبانیت کے بعد زمانہ نفس پرستی کا دور آتا رہتا ہے - تجارت میں اس میلان کا ہمیشہ یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ کبھی تو تجارت کی خوب گرم بازاری ہوتی ہے - اور کبھی سخت کساد بازاری - اسی میلان کی بدولت فیشن کے دلدادہ ایک حد سے زیادہ بیہودگی

کو چھوڑ کر مقابل کی دوسری بیہودگی اختیار کر لیتے ہیں۔ غرض کہ یہی میلان ہماری خورونوش
کی عادتوں پر۔ اور ضمناً بچوں کی خوراک پر۔ اثر کرتا ہے۔ اِس دور کے بعد جو شکم پرستی کی وجہ
سے مشہور تھا۔ اب نسبتہً پرہیز کا زمانہ آگیا ہے۔ اور لوگوں نے ترک مسکرات اور ترک
حیوانات کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اُن کو زمانۂ قدیم کی رندانہ معاشرت پر سخت اعتراض ہے
بڑوں کے خورونوش میں اس تبدیلی کے ساتھ ساتھ بچوں کے خورونوش میں بھی ایسی
ہی تبدیلی ہو گئی ہے۔ قدیم نسلوں کا یہ اعتقاد تھا کہ بچہ کو جس قدر زیادہ کھانے
پینے کی ترغیب دی جا سکے۔ اسی قدر بہتر ہے۔ اور اب بھی کسانوں کے درمیان
اور اضلاع دور دست میں جہاں پشت ہا پشت کے خیالات بہت زیادہ عرصہ
تک قایم رہتے ہیں۔ ایسے ماں باپ مل سکتے ہیں۔ جو اپنے بچوں کو خوب ڈٹ کر
کھانے کی ترغیب دیتے ہیں۔ مگر تعلیم یافتہ لوگوں میں۔ جن کا رجحان پرہیز کی
طرف زیادہ تر ہوتا ہے۔ یہ قطعی میلان دیکھا جاتا ہے کہ بچوں کو ضرورت سے کم
خوراک دی جائے۔ نہ کہ زیادہ۔ اور زمانہ قدیم کی بہیمیت سے جو نفرت والدین کو
ہے۔ اُس کا ظہور درحقیقت اولاد کے ساتھ برتاؤ کرتے وقت زیادہ صراحت کے
ساتھ ہوتا ہے۔ نہ کہ اپنے نفس کے ساتھ۔ کیونکہ والدین کی اشتہائیں اُن
کی ریائی رہبانیت کو جہاں تک کہ اُن کے چال چلن سے اُس کا تعلق ہے۔
روک دیتی ہیں۔ مگر یہ رہبانیت بچوں کے لیے قانون بنانے میں اپنا
پورا رنگ دکھاتی ہے۔

پرخوری اور کم خوری دونوں بُری ہیں۔ مگر کم خوری بہت بُری ہے۔

یہ بات کہ "پرخوری اور کم خوری دونوں بُری ہیں" ایک بدیہی بات ہے
مگر ان دونوں میں کم خوری نہایت خراب ہے۔ جیسا کہ ایک اعلیٰ درجہ کی معتبر
کتاب میں لکھا ہے کہ "اگر کبھی کبھی خوب ڈٹ کر کھانا کھا لیں تو اُس کے نتایج بھوکے
رہنے کے مقابلہ میں کم تر مضر ہوتے ہیں۔ اور زیادہ آسانی سے اُن کا تدارک

ہو جاتا ہے[۱]"۔ اس کے علاوہ جہاں بچوں کے کھانے پینے میں نادانی سے دست اندازی نہیں کی جاتی۔ وہاں "ڈٹ کر" کھانے کی نوبت شاذونادر ہی پیش آتی ہے "پرخوری بڑوں کا عیب ہے نہ کہ بچوں کا۔ اور جب تک مربیوں کا قصور نہ ہو۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ بچے کھا، یا پی، ہی جائیں[۲]"۔ روک ٹوک کا یہ طریقہ جس کو بہت سے والدین نہایت ضروری سمجھتے ہیں۔ ناکافی مشاہدہ اور غلط استدلال پر مبنی ہے "حد سے زیادہ قانون" جس طرح سلطنت میں ہوتا ہے اسی طرح دایہ خانہ میں بھی ہوتا ہے۔ اور خوراک کی مقدار میں تخفیف کرنا اس قانون کی مضر صورتوں میں سے ایک صورت ہے۔

"مگر کیا بچوں کو شکم سیری کی اجازت دی جائے؟ کیا یہ بات گوارا کی جائے کہ وہ لذیذ کھانے خوب ڈٹ کر کھائیں۔ اور اپنے تئیں بیمار ڈال لیں۔ جیسا کہ وہ یقیناً کریں گے؟" اگر یہ سوال اسی حیثیت سے کیا جائے۔ تو اس کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے۔ مگر جب یہ سوال اس حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ تو اس میں امر زیر بحث کو پہلے ہی فرض کر لیا جاتا ہے۔ ہم زور کے ساتھ کہتے ہیں کہ چونکہ اشتہا ادنیٰ حیوانات کے لیے عمدہ رہبر ہے۔ چونکہ وہ شیرخوار بچہ کے لیے عمدہ رہبر ہے۔ چونکہ وہ کم زور آدمی کے لیے عمدہ رہبر ہے۔ چونکہ وہ انسان کی مختلف الحالت نسلوں کے لیے عمدہ رہبر ہے۔ اور چونکہ وہ ہر بالغ انسان کے لیے جو صحت بخش زندگی بسر کرتا ہے۔ عمدہ رہبر ہے۔ اس لیے بے کھٹکے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ بچپن کے لیے بھی عمدہ رہبر ہے۔ اگر اشتہا اور سب حالتوں میں قابل اعتبار ہو۔ مگر بچپن ہی میں قابل اعتبار نہ ہو۔ تو یہ بات حقیقت میں عجیب ہوگی۔

اشتہا ہر طبقہ کے انسان و حیوان کے لیے عمدہ رہبر ہے۔ اسی طرح چھوٹے بچوں کے لیے بھی وہ رہبر ہے۔

۵۱۔ دیکھو کتاب "طب عملی کی قاموس" (Cyclopaedia of Practical Medicine)

۵۲ ایضاً ایضاً ایضاً

بچوں پر کھانے پینے کی روک ٹوک کے مضر نتائج اور اس بات کا ثبوت کہ مٹھاس اور ترشی انکی جسمانی ساخت کے لیے نہایت ضروری ہیں

شاید بعض لوگ اس جواب کو پڑھ کر بے چین ہو جائیں گے۔ کیونکہ وہ یہ خیال
کریں گے کہ ہم اس کے بالکل برخلاف واقعات پیش کر سکتے ہیں۔ اگر ہم ان واقعات
کے بجا ہونے سے انکار کریں۔ تو یہ بات بیہودہ معلوم ہوگی۔ اور گو یہ بات بظاہر
خلاف عقل ہے۔ مگر اس کی پوری طرح تائید ہو سکتی ہے۔ سچ یہ ہے کہ بے اعتدالی
کی جو مثالیں اُن لوگوں کے دلوں میں ہیں۔ وہ عموماً اُسی روک ٹوک کے نتیجے ہیں جن
کو وہ صحیح قرار دیتے معلوم ہوتے ہیں۔ بچوں کو راہبانہ طریقہ پر غذا دینے کا
یہ نتیجہ ہے کہ جب اُن کو موقع ملتا ہے۔ حد سے زیادہ کھا جاتے ہیں۔
اِن نتیجوں سے اس عام حقیقت کی کسی قدر توضیح ہوتی ہے۔ کہ بچپن میں جن لوگوں
کی تربیت نہایت سختی کے ساتھ ہوتی ہے۔ وہ بعد میں نہایت وحشیانہ بے اعتدالیوں
پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ یہ نتائج اُن خوفناک واقعات سے مشابہ ہیں جو کسی زمانہ
میں خانقاہوں میں عام طور پر دیکھے جاتے تھے۔ جہاں راہبہ عورتیں سخت
ترین ریاضت سے آزاد ہو کر قریب قریب شیطانی شرارتوں میں مبتلا ہو جاتی
تھیں۔ اِن نتائج سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مدت کی رکی ہوئی خواہشیں
اس قدر سخت ہوتی ہیں کہ اُن پر قابو نہیں ہو سکتا۔ غور کرو کہ بچوں کی
معمولی رغبت کس چیز کی طرف ہوتی ہے۔ اور اُن کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جاتا ہے۔
مٹھاس کی رغبت بچوں میں نمایاں ہوتی ہے۔ اور قریب قریب سب بچوں میں پائی
جاتی ہے۔ غالباً سَو میں سے ننانوے [۹۹] آدمی یہ بات فرض کر لیتے ہیں کہ اِس میں
زبان کے چٹخارے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اور یہ کہ دیگر نفسانی خواہشوں
کی طرح۔ اِس کو بھی روکنا چاہیے۔ مگر علم الاعضاء کا عالم جس کی تحقیقاتیں اُس
کو ایسی ہدایت کرتی ہیں کہ نظام کائنات کی روز افزوں وقعت اُس کے دل میں پیدا
ہو جاتی ہے۔ یہ گمان کرتا ہے کہ مٹھاس کی اِس رغبت میں زبان کے چٹخارے کے

علاوہ - جیساکہ عام خیال ہے کچھ اور بھی ہے - اور تحقیقات سے اس گمان کی تصدیق ہوتی ہے - وہ دیکھتا ہے کہ نظام بدن میں شکر بہت کار آمد ہے شکر اور چربی کے مادے دونوں - جسم میں داخل ہو کر اکسائڈ بن جاتے ہیں - اور اس کے ساتھ ہی حرارت کو ترقی ہوتی ہے - چند اور مرکبات بھی - قبل اس کے کہ حرارت پیدا کرنے والی خوراک کا کام دیں - شکر کی صورت میں تبدیل ہو جاتے ہیں - اور شکر بننے کا یہ عمل جسم میں جاری رہتا ہے - دوران ہضم میں نہ صرف نشاستہ - شکر کی صورت میں تبدیل ہوتا ہے - بلکہ مسٹر کلاڈ برنارڈ[1] نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ جگر ایک کارخانہ ہے - جہاں خوراک کے دوسرے اجزا بھی شکر کی صورت میں تبدیل ہو جاتے ہیں - غرض شکر کی ضرورت ایسی قطعی و یقینی ہے کہ جب اور کوئی چیز نہیں ملتی - تو اُن مادوں سے بھی - جن میں نائٹروجن شامل ہے - اسی طرح شکر بن جاتی ہے - پس بچوں کو اس قابل قدر حرارت پیدا کرنے والی - خوراک کی نمایاں خواہش ہوتی ہے - اور جب ہم اس پر اتنا اور اضافہ کریں کہ بچے اُس خوراک کو سخت ناپسند کرتے ہیں - جو اکسائڈ بنتے وقت حرارت کی بہت زیادہ مقدار کو خارج ہوتی ہے (یعنی چربی) تو ہم کو اس خیال کی ایک وجہ مل جاتی ہے کہ ایک چیز کی زیادتی سے دوسری چیز کی کمی کا معاوضہ ہو جاتا ہے - یعنی جسم کی بناوٹ کے لیے زیادہ تر شکر کی ضرورت اس وجہ سے ہوتی ہے کہ زیادہ چربی سے کام نہیں چل سکتا - اس کے علاوہ بچوں کو ترکاریوں کی ترشی بھی بھاتی ہے وہ سب قسم کے پھلوں کا لطف اُٹھاتے ہیں - اور اگر کوئی بہتر شئے نہ ملے - تو کچے ککرونڈے اور نہایت ہی کھٹے جنگلی سیب تک کھا جاتے ہیں - اب غور کرو کہ صرف ترکاریوں

[1] مسٹر کلاڈ برنارڈ ملک فرانس کا باشندہ اور علم الاعضا کا عالم تھا - ۱۸۱۳ء میں پیدا ہوا - اور ۱۸۷۸ء میں فوت ہوا - مترجم

کی ترشی - اور معدنیات کی ترشی بہت عمدہ مقویات ہیں - اور اعتدال کے ساتھ اُن کا
استعمال کیا جائے - تو مفید مقویات ہیں - بلکہ اگر قدرتی حالت میں اُن کا استعمال
کیا جائے تو اور بھی فائدے ہیں - ڈاکٹر اینڈرو کوم[15] کہتے ہیں - کہ پکے پھل بہ نسبت
اس ملک (برطانیہ کلاں) کے یوروپ میں زیادہ آزادی سے بچوں کو دئیے جاتے
ہیں - اور خصوصاً جب کہ امعاء کا عمل ناقص ہو - بہت مفید ہوتے ہیں لیکن ذرا دیکھو کہ
بچوں کی طبعی ضرورتوں میں اور اُس معمولی برتاؤ میں - جو اُن کے ساتھ کیا جاتا ہے -
کیا اختلاف ہے - بچوں میں دو قسم کی خواہشیں زیادہ تر ہوتی ہیں - اور وہ خواہشیں غالباً
اُن کے جسم کی خاص ضرورتوں کو ظاہر کرتی ہیں - اور وہ مرشد دایہ خانہ کے انتظام
خورونوش میں اُن سے غفلت کی جاتی ہے - بلکہ عام میلان یہی ہے کہ ان کو
پورا نہ ہونے دیا جائے - صبح کو دودھ نان پاؤ رات کو چائے اور مکھن روٹی
یا کوئی اور اسی قدر روکھی پھیکی خوراک کی مداومت سختی کے ساتھ کی جاتی ہے - اور
ذائقہ کو کسی قسم کی مدد پہنچانا غیر ضروری - بلکہ بے جا سمجھا جاتا ہے - اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے
جب تیج تہوار کے دنوں میں لذیذ چیزیں نہایت کثرت سے موجود ہوتی ہیں - جب
جیب خرچ ملنے کی وجہ سے حلوائی کی دوکان تک بچوں کی رسائی ہو جاتی ہے
یا جب کسی اتفاق سے وہ میوہ دار باغ تک بے روک ٹوک جا پہنچتے ہیں -
تو مدت کی رکی ہوئی خواہشیں - جو اسی وجہ سے شدید ہوتی ہیں سخت بے اعتدالی
تک نوبت پہنچا دیتی ہیں - کچھ تو پچھلی بندشوں سے آزاد ہو جانے کے سبب اور
کچھ یہ سمجھ کر کہ کل سے بڑا لمبا روزہ شروع ہو جائے گا - بچے لگتے ہاتھ خوب
عید مناتے ہیں - پھر جب تھوڑی سی خرابیاں ظاہر ہوتی ہیں - تو صحت پیش

[15] ڈاکٹر اینڈرو کوم ملک سکاٹ لینڈ کا باشندہ اور علم الاعضاء کا عالم تھا - سنہ ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوا - اور سنہ ۱۸۴۷ء میں انتقال کیا - مترجم -

کی جاتی ہے کہ بچوں کو اُن کی اشتہا کی ہدایت پر نہ چھوڑنا چاہیے! اس مصنوعی روک ٹوک کے آفت ناک نتائج کو اور زیادہ روک ٹوک کی ضرورت کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے! اس لیے ہم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اس طریقہ دست اندازی کو صحیح قرار دینے کے لیے جو دلیل پیش کی گئی ہے۔ وہ نہایت لغو ہے۔ ہم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اگر بچوں کو بہ زیادہ لذیذ کھانے پینے کی چیزیں دی جائیں۔ جو اعضا کے افعال کے لیے درکار ہیں۔ تو وہ شاید ہی کبھی کھانے پینے میں ایسی بے اعتدالی کریں۔ جیسی کہ آج کل۔ جب موقع ملتا ہے۔ کر بیٹھتے ہیں۔ غرض جیسا کہ ڈاکٹر کومب ہدایت کرتے ہیں۔ اگر پھل باقاعدہ خوراک کا جزو ہوں (اور جیسا کہ وہ مشورہ دیتے ہیں۔ کھانے کے درمیانی اوقات میں نہیں۔ بلکہ کھانے کے ساتھ کھلائے جائیں) تو بچوں کو کوئی ایسی خواہش پیدا نہ ہوگی جس سے اُن کو جنگلی سیب اور جھڑبیری کے بیر کھا جانے کی ترغیب ہوتی ہے۔ اور یہی صورت اور حالتوں میں پیش آئے گی۔

اس بات کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ بچہ کو کس قدر خوراک دینی چاہیے۔ اسکا فیصلہ صرف بچہ کی طبیعت کر سکتی ہے۔

یہی بات نہیں کہ بچوں کی اشتہا پر اعتماد کرنے کے علمی دلائل قوی ہیں۔ اور جو دلائل اُن پر اعتماد نہ کرنے کے لیے پیش کیے گئے ہیں۔ وہ ضعیف ہیں۔ بلکہ بات یہ ہے کہ اس کے سوا اور کوئی ہدایت قابل اعتماد ہی نہیں ہے۔ بھلا والدین کی اس رائے کی۔ جس کو اصل ضابطہ کی جگہ دی گئی ہے۔ کیا وقعت ہو سکتی ہے؟ جب بچہ اور کھانا مانگتا ہے۔ اور ماں یا اُستانی کہتی ہے "نہیں"۔ تو وہ کس بنیاد پر انکار کرتی ہے؟ وہ یہ خیال کرتی ہے کہ بچہ کافی کھانا کھا چکا ہے۔ مگر اس خیال کی وجوہ اُس کے پاس کہاں ہیں؟ کیا وہ لڑکے کے معدہ کا پوشیدہ حال معلوم کر لیتی ہے؟ کیا کوئی کشف کی قوت اُس کو حاصل ہے جس کے سبب بچہ کے جسم کی ضرورتوں کو دریافت کر لیتی ہے؟ اگر نہیں۔ تو پھر کس طرح بے دھڑک فیصلہ کر سکتی ہے؟ کیا وہ

نہیں جانتی کہ اس امر کا فیصلہ کہ وہ جسم کو خوراک کی ضرورت ہے یا نہیں بے شمار پیچیدہ
اسباب پر منحصر ہے - یعنی یہ ضرورت موسم کی حرارت و برودت - ہوا کی رطوبت
اور ہوا کی برقی حالت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے - اور ورزش جو کی جاتی ہے
اس کے لحاظ سے اس خوراک کی نوعیت و مقدار کے لحاظ سے - جو سب سے
پچھلے کھانے کے وقت کھائی گئی ہو - اور جس قدر عرصہ سے پچھلا کھانا ہضم ہو گیا
ہو - اس کے لحاظ سے بھی بدلتی رہتی ہے - پس ان مجموعہ اسباب کے نتیجہ کا اندازہ وہ
کیونکر کر سکتی ہے - جیسا کہ ہم نے ایک پانچ سال کے لڑکے کے باپ کو جس کا
بیٹا اس قدر لمبا ہے کہ اس کے اکثر ہمعمر لڑکے اس کے کندھے کے برابر آتے
ہیں - یہ کہتے سنا ہے کہ میرے پاس کوئی مصنوعی مقیاس نہیں ہے -
جس سے اس کی خوراک کا اندازہ ہو سکے - اگر میں یہ کہوں کہ اتنا کھانا کافی ہے تو یہ
محض قیاس ہے - اور قیاس کے غلط ہونے کا ایسا ہی احتمال ہے جیسا کہ
صحیح ہونے کا - اسی لیے قیاسات پر اعتماد نہ کر کے - میں اس کو پیٹ بھر کر کھانے
دیتا ہوں " اور جو شخص اس حکمت عملی پر اس کے نتائج کے ذریعہ سے رائے قائم کریگا
وہ بے شک اس بات کی معقولیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گا - حقیقت میں جس اعتماد پر
اکثر اشخاص بچوں کے معدہ کے لیے قانون مقرر کرتے ہیں - اس سے یہ ثابت
ہوتا ہے کہ وہ علم الاعضا سے ناواقف ہیں - اگر ان کو زیادہ علم
ہوتا تو وہ اس قدر دلیر نہ ہوتے - علم کے گھمنڈ میں بمقابلہ
جہالت کے گھمنڈ کے - انکسار ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص یہ
بات سیکھنی چاہیے کہ انسان کی رائے پر کس قدر کم - اور ازلی نظام اشیاء پر کس
قدر زیادہ اعتماد کرنا چاہیے - تو اس کو نا تجربہ کار طبیب کی شتاب زدگی
کا مقابلہ - نہایت حاذق طبیب کی احتیاط کے ساتھ کرنا چاہیے

یا سر جان[1] فاربس کی اُس کتاب میں جس کا نام ہے "مرض کے علاج میں طبیعت اور صناعت کا بیان[2] کا ہوش کرنا چاہیئے۔ اور وہ دیکھے گا کہ فن زندگی کا جس قدر زیادہ علم حاصل ہوتا جاتا ہے۔ اسی قدر اپنی رائے پر کم۔ اور طبیعت پر زیادہ اعتقاد ہوتا جاتا ہے۔

بچوں کو عمدہ اور مقوی خوراک دینی چاہیئے۔ یہ خیال غلط ہے کہ گوشت بچوں کے لیئے مفید نہیں ہے

خوراک کی کمیت کے سوال کو چھوڑ کر اُس کی کیفیت کے سوال کی طرف رجوع کریں۔ تو یہاں بھی ہم کو وہی راہبانہ میلان نظر آتا ہے۔ نہ صرف محدود خوراک بلکہ نسبتاً ادنیٰ درجہ کی خوراک بچوں کے لیئے مناسب تصور کی جاتی ہے۔ آج کل عام رائے یہ ہے کہ اُن کو گوشت بہت کم دینا چاہیئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کم مقدور والوں کو کفایت شعاری نے اس رائے کی طرف ہدایت کی ہے۔ یعنی اسی اقتضا سے یہ خیال پیدا ہوا ہے۔ جن والدین کو زیادہ گوشت خریدنے کا مقدور نہیں ہوتا۔ وہ بچوں کی درخواستوں کا یہ جواب دیتے ہیں۔ "گوشت چھوٹے لڑکوں اور لڑکیوں کے لیئے اچھا نہیں ہے" اور یہ بات جو اوّل اوّل محض ایک آسان سا عذر تھا۔ بار بار کی تکرار سے ایک اعتقاد بن گیا ہے۔ مگر جن لوگوں کو خرچ کا خیال نہیں ہوتا۔ وہ کچھ تو اکثر اشخاص کی دیکھا دیکھی۔ اور کچھ اتالیق کے اثر سے جو ادنیٰ طبقہ میں سے لی جاتی ہیں۔ اور کسی قدر زمانہ گذشتہ کی بہیمیت سے نفرت کے سبب مغلوب ہو گئے ہیں۔

گوشت صرف مفید غذا ہے

تاہم۔ اگر اس بات کی تحقیقات کریں کہ اس رائے کی بنیاد کیا ہے۔ تو ہم کو معلوم

---

[1] سر جان فاربس۔ بریٹانیہ کلان کا ایک مشہور طبیب تھا۔ اُس نے فن طبابت میں مختلف کتابیں لکھی ہیں۔ سنہ ۱۷۸۷ء میں پیدا ہوا۔ اور سنہ ۱۸۶۱ء میں فوت ہوا مترجم۔

[2] اس کتاب کا انگریزی نام یہ ہے۔

(On Nature and Art in the Cure of Disease) مترجم

بچوں کے لیے ناموافق ہے - مگر دو تین سال کی عمر کے بچے اس کو بھی ہضم کر سکتے ہیں -

ہو گا کہ اس کی بنیاد بہت کم ہے - یا بالکل نہیں ہے - یہ ایسا مسئلہ ہے جس کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے - اور جس کو بلا ثبوت تسلیم کر لیا گیا ہے - مثل اس مسئلہ کے جو ہزارہا سال تک اس امر پر زور دیتا رہا تھا کہ شیر خوار بچوں کے جسم پر پٹیاں باندھنی چاہئیں - شیر خوار بچہ کے معدہ کے لیے جس نے ابھی زیادہ عضلاتی قوت حاصل نہیں کی - گوشت غالباً ناموافق غذا ہے - کیونکہ گوشت کو قبل اس کے کہ وہ مستحیل بہ کیموس ہو - زیادہ پیسنے کی ضرورت ہے - مگر یہ اعتراض اس گوشت پر وارد نہیں ہو سکتا - جس کے ریشے نکال لیے جائیں (اور صرف آب جوش استعمال کیا جائے) اور نہ اس زمانہ سے متعلق ہو سکتا ہے - جب کہ دو تین سال کے بعد بچہ میں خاصی عضلاتی قوت پیدا ہو جاتی ہے - یہ شہادت جو اس مسئلہ کی تائید میں پیش کی گئی ہے - بہت چھوٹے بچوں کی بابت تو کسی قدر قوی ہے - مگر بڑی عمر کے بچوں کی بابت قوی نہیں ہے - گو ان کے ساتھ بھی عموماً اسی طرح سلوک کیا جاتا ہے - تاہم ان کی بابت خلاف شہادت وافی اور قطعی موجود ہے - سائنس کا فتویٰ عام رائے کے بالکل خلاف ہے - ہم نے یہ سوال دو سربرآوردہ طبیبوں اور چند نہایت ممتاز علم الاعضاء کے عالموں کے سامنے پیش کیا تھا - اور وہ سب اس نتیجہ سے یکساں متفق ہیں - کہ بچوں کو بڑوں کی نسبت کم مقوی خوراک نہیں - بلکہ اگر ہو سکے - تو زیادہ مقوی خوراک دینی چاہیئے -

بچوں کو بڑوں کے مقابلہ میں خوراک کی ضرورت نسبتہً زیادہ ہوتی ہے - اس بات کی تشریح اور اس کی وجوہ

اس نتیجہ کے وجوہ ظاہر ہیں - اور یہ دلیل صاف ہے - یہ معلوم کرنے کے لیے کہ لڑکے کو بمقابلہ بڑے آدمی کے خوراک کی ضرورت نسبتہً زیادہ ہوتی ہے کہ صرف اس امر کی ضرورت ہے - کہ ایک بڑے آدمی اور ایک لڑکے کے جسمانی نشوونما کا باہم مقابلہ کیا جائے - وہ مقاصد کیا ہیں - جن کے لیے انسان کو خوراک

کی ضرورت ہے؟ اُس کا جسم ہر روز تھوڑا بہت گھٹتا رہتا ہے - یعنی جسمانی محنت
کی وجہ سے فرسودہ ہو جاتا ہے - نفس کے عملوں کی بدولت نظام عصبی بھی فرسودہ
ہو جاتا ہے - زندگی کے وظائف و افعال کے جاری رہنے سے اعضاء فرسودہ
ہو جاتی ہیں - اور جو مادہ اس طرح ضائع ہوتا ہے - اُس کی کمی پوری کرنی ضرور ہے
انتشار حرارت کے ذریعہ سے حرارت کی ایک بڑی مقدار بھی جسم سے خارج
ہوتی رہتی ہے - اور چونکہ افعال زندگی کے جاری رکھنے کے لیے جسم کی حرارت
کا قایم رکھنا ضروری ہے - اس لیے اِس نقصان کا معاوضہ اس طرح کرنا
چاہیے کہ جسم میں ہمیشہ حرارت پیدا ہوتی رہے - اور اِسی لیے جسم کے بعض اجزا
پر ہمیشہ آکسیڈیشن کا عمل ہوتا رہتا ہے - پس دن بھر کے نقصانات کی تلافی اور
جس قدر حرارت دن بھر میں صرف ہوئی ہے - اُس کے عوض ایندھن بہم پہنچانا
صرف یہی مقاصد ہیں - جن کے لیے بالغوں کو خوراک کی ضرورت ہے - اب
لڑکے کی حالت پر غور کرو - اُس کے جسم کا مادہ بھی کام کرنے کی وجہ سے ضائع
ہوتا رہتا ہے - اور اِس بات کے سمجھنے کے لیے کہ لڑکا اپنے جثہ کی مناسبت
سے غالباً اسی قدر زیادہ ضائع کرتا ہے - جس قدر کہ بڑا آدمی ؛ صرف اُس کے
چونچال پن پر غور کرنے کی ضرورت ہے - انتشار حرارت کے ذریعہ سے
اُس کے جسم کی حرارت بھی زائل ہوتی رہتی ہے - اور چونکہ بچہ کا جسم مقابلہ بڑے
آدمی کے - جثہ کے لحاظ سے - زیادہ تر کھلا رہتا ہے - اور اسی لیے بچے کے
جسم سے حرارت بھی نسبتہً زیادہ خارج ہوتی رہتی ہے - لہذا بڑے آدمی کو حرارت
پیدا کرنے والی خوراک کی جس قدر ضرورت ہے - بچہ کو - اپنے جثہ کے موافق اُس
سے زیادہ خوراک کی ضرورت ہے - پس نشو و نما کے جو عمل بڑے آدمی کے جسم
میں جاری رہتے ہیں - اگر بچہ کو اُن عملوں کے سوا اور کسی عمل کی ضرورت نہ ہوتی

تو بھی اس کو - اپنے جثہ کی مناسبت سے - غذا کسی قدر زیادہ وغیرہ کی ضرورت
ہوتی - مگر بچہ کو جسم کی کمی پوری کرنے - اور اس کی حرارت قایم رکھنے کے علاوہ نمو کی
غرض سے زیادہ پیدا کرنے کی بھی ضرورت ہے - جب جسم کے ذبول اور حرارت
کے نقصان کی تلافی ہو جاتی ہے - تو جو زائد غذا باقی رہتی ہے وہ جسم کے نمو میں کام
آتی ہے - اور باقاعدہ نمو اسی زائد غذا کی بدولت ممکن ہے - اور اس کی عدم
موجودگی میں جو اکثر کبھی واقع ہوتا ہے - اس سے بیّن اضمحلال پیدا ہوتا ہے
جو ناقص بدل ما یتحلل کا نتیجہ ہے - یہ سچ ہے کہ ایک خاص قانون جو تفصیل
کی وجہ سے جس کی تشریح یہاں ممکن نہیں ہے - چھوٹے جسم نامی کو بڑے جسم نامی
پر اسی نسبت سے فوقیت حاصل ہوتی ہے جو قایم رکھنے والی اور زائل کرنے والی
قوتوں میں پائی جاتی ہے - حقیقت میں یہ ایسی فوقیت ہے - کہ نمو کا امکان بھی
اس کی بدولت ہے - مگر اس کے تسلیم کر لینے سے یہ بات اور بھی زیادہ واضح ہو جاتی
ہے کہ - اگرچہ ممکن ہے کہ جسم کی طاقت مخالف اثر کو برداشت کرے - اور بالکل
ہی زائل نہ ہو جائے - مگر چونکہ طاقت میں کمی ضرور واقع ہوتی ہے - اس لیے
ہر ایک مخالف اثر قد و قامت یا جسمانی تکمیل کو ضرور نقصان پہنچائے گا - یہ بات
کہ نمو کرنے والے بچہ کے لیے مادہ کی ضرورت کس قدر ناگزیر ہے اس امر سے
ثابت ہے کہ بچپن میں جب کہ لڑکا مدرسے میں پڑھتا ہے - اس کی بھوک نہایت تیز
ہوتی ہے اور آئندہ زندگی میں شاذ و نادر ہی ایسی تیز بھوک لگتی ہے - اور نیز اس امر
سے کہ بچہ کو نسبتاً جلد بھوک لگ جاتی ہے - اور اگر اس بات کی اور زیادہ شہادت
درکار ہو - کہ بچوں کو زیادہ خوراک کی ضرورت ہوتی ہے - تو اس واقعہ سے حاصل
ہوتی ہے کہ جہازوں کی تباہی اور دیگر مصائب کے بعد جو قحط واقع ہوتے ہیں ان
میں بچے سب سے پہلے مرتے ہیں -

آیا بچوں کو کم زور غذا کی زیادہ مقدار دی جائے یا مقوی غذا کی معتدل مقدار؟

جب یہ بات مسلم ہو چکی - اور مسلم ہونی ہی چاہیئے - کہ بچوں کو خوراک کی ضرورت نسبتاً زیادہ ہے - تو اب یہ سوال باقی رہتا ہے کہ کیا ہم اس ضرورت کو اس طرح پورا کریں کہ بچوں کو بہت زیادہ مقدار اس غذا کی دی جائے جس کو کم زور غذا کہتے ہیں - یا مقوی غذا - زیادہ معتدل مقدار میں دی جائے"؟ گوشت کی ایک معین مقدار سے جس قدر غذائیت حاصل ہوتی ہے - وہ اس سے زیادہ مقدار کی روٹی سے - یا اس سے بھی زیادہ مقدار کے آلوؤں سے حاصل ہوتی ہے - اور دیگر اغذیہ کو بھی اسی پر قیاس کرنا چاہیئے جس قدر کم غذائیت کسی شے میں ہو - ضرورت کو پورا کرنے کے لیے - اس کی مقدار اسی قدر زیادہ کرنی چاہیئے اب کیا ہم نمو کرنے والے بچہ کی زائد ضرورتوں کا لحاظ رکھ کر اس کو ایسی عمدہ خوراک کی کافی مقدار دیں - جیسی کہ بڑوں کو دی جاتی ہے؟ یا اس امر کا لحاظ نہ رکھ کر - کہ بچہ کے معدہ کو اس عمدہ خوراک کی بھی نسبتاً زیادہ مقدار ہضم کرنی پڑتی ہے" ادنیٰ خوراک کی اس سے زیادہ مقدار دے کر اس کے معدہ پر اور بھی زیادہ بار ڈال دیں؟

بچوں کو ایسی غذا دینی چاہیئے جو مقوی بھی ہو اور زود ہضم بھی

اس سوال کا جواب کسی قدر صاف ہے - ہضم کی محنت میں جس قدر تخفیف ہوتی ہے اعضا کے نمو اور عمل کے لیے اسی قدر زیادہ قوت باقی رہتی ہے - معدہ اور امعاء کے فرائض - اعصابی قوت اور خون کا زیادہ ذخیرہ بہم پہنچے بغیر پورے نہیں ہو سکتے - اور خوب پیٹ بھر کر کھانے کے بعد جو کسل نسبتاً زیادہ پیدا ہوتا ہے - اس سے ہر ایک بالغ کو اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ یہ اعصابی قوت اور خون کا ذخیرہ نظام جسمانی کے نقصان سے حاصل ہوتا ہے - اگر کم مقوی خوراک کی ایک کثیر مقدار سے مطلوبہ غذائیت حاصل ہو - تو معدہ پر بہ نسبت اس کے کہ مقوی خوراک کی معتدل مقدار سے اسی قدر غذائیت حاصل ہو زیادہ

کام کا بار پڑ جاتا ہے - اور اعضاء پر زائد بار پڑنا بہت بڑا نقصان ہے -
یہ نقصان بچوں میں قوت کی کمی یا نمو کی کمی یا دونوں سے ظاہر ہوتا ہے - پس
یہ نتیجہ نکلا کہ بچوں کو ایسی خوراک ملنی چاہیئے - جو حتی الامکان مقوی
بھی ہو اور منہضم بھی -

غذائیت کے اعتبار سے گوشت اور نباتاتی کا باہم مقابلہ

بے شک یہ بات صحیح ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو خاص یا تقریبًا خالص
نباتاتی غذا سے پرورش کر سکتے ہیں - طبقہ اعلیٰ میں ایسے بچے پائے جاتے
ہیں جن کو گوشت نسبتًہ کم دیا جاتا ہے - اور وہ پھر بھی بڑھتے ہیں - اور صحیح و
سالم معلوم ہوتے ہیں - مزدوروں کے بچے شاذ و نادر ہی گوشت چکھتے ہوں گے
پھر بھی صحیح و سالم بلوغ کو پہنچتے ہیں - مگر ان واقعات میں - جو بظاہر خلاف معلوم
ہوتے ہیں - ہرگز وہ وزن نہیں ہے - جو عمومًا خیال کیا جاتا ہے - اول تو یہ بات
لازم نہیں آتی کہ جو لوگ ابتدائی عمر میں روٹی اور آلو سے پرورش پاتے ہیں - وہ
آخر کار عمدہ نمو پائیں گے - اور انگلستان کے زراعتی مزدوروں اور امرا کی حالت
کا - یا فرانس کے طبقہ متوسط اور طبقہ ادنیٰ کی حالت کا مقابلہ کرنا - نباتات خوروں کے
حق میں ہرگز مفید نہیں ہے - دوسرے یہ سوال جسم کی کمیت ہی سے متعلق
نہیں ہے - بلکہ کیفیت سے بھی متعلق ہے - نرم پلپلا جسم دیکھنے میں ایسا ہی
اچھا معلوم ہوتا ہے - جیسا کہ سخت گٹھیلا جسم - اگرچہ ممکن ہے کہ سرسری نظر سے
دیکھنے والے کی نگاہ میں - ایسا بچہ جس کے رگ و پٹھے کمل اور نرم ہوں - اس
بچہ کے برابر معلوم ہو جس کے ریشے چست اور گٹھے ہوئے ہوں - مگر طاقت
کی آزمائش سے فرق معلوم ہو جاتا ہے - بچوں کا زیادہ موٹاپا
اکثر کمزوری کی علامت ہے - جن لوگوں کی تعلیم و تربیت کی جاتی ہے - اُن
کا بدن گٹھ جاتا ہے - یہی وجہ ہے کہ ان ادنیٰ درجے کی خوراک کھانے والے

بچوں کی ظاہری صورت سے کچھ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا - تیسرے - جثہ کے علاوہ ہم کو کام کرنے کی قوت کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے - گوشت خواروں کی اولاد اور آلو روٹی کھانے والوں کی اولاد میں اس اعتبار سے ایک نمایاں فرق ہے - دہقان کا لڑکا عقلی اور جسمانی دونوں طرح کی زندگی میں ایک شریف آدمی کے بیٹے سے بہت کم درجہ کا ہوتا ہے -

اگر ہم حیوانات کی مختلف قسموں کا - یا آدمیوں کی مختلف نسلوں کا - یا ایک ہی قسم کے حیوانوں اور انسانوں کا - جب کہ اُن کو مختلف قسم کی خوراک دی جائے باہم مقابلہ کریں - تو ہم کو اس امر کا اور بھی زیادہ صاف ثبوت ملتا ہے کہ کام کرنے کی قوت کا درجہ - خوراک کے مقوی ہونے پر یقیناً منحصر ہے -

مقوی خوراک کھانے والے حیوان - کم زور خوراک کھانے والے حیوانوں کے مقابلہ میں زیادہ ترچست و چالاک ہوتے ہیں - گائے - اور گھوڑے - بھیڑ اور کتے کی خوراک کا باہم مقابلہ

ہم دیکھتے ہیں کہ گائے - جو گھاس جیسی کم زور خوراک پر گزارہ کرتی ہے - اُس کے لیے خوراک کی بہت زیادہ مقدار درکار ہے - اور اُس کے ہضم کرنے کے لیے ایک وسیع معدہ کی ضرورت ہے - اُس کے ہاتھ پاؤں - جو جسم کے مقابلہ میں چھوٹے ہوتے ہیں - بوجھ کے مارے دبے رہتے ہیں - اِس بھاری جسم کے اوٹھانے اور خوراک کی اس کثیر مقدار کے ہضم کرنے میں بہت سی قوت صرف ہو جاتی اور تھوڑی سی باقی رہ جاتی ہے - اس لیے یہ جانور سست ہوتا ہے گائے سے گھوڑے کا مقابلہ کرو - اس جانور کی بناوٹ گائے سے تقریباً ملتی جلتی ہے - مگر وہ زیادہ مقوی خوراک کا عادی ہے - اس کا جسم اور خاص کر پیٹ سے نیچے کا حصہ - اُس کے ہاتھ پاؤں کے مقابلہ میں زیادہ بھاری نہیں ہے - اور اس کے قویٰ پر اس قدر بھاری انتڑیوں وغیرہ کے اٹھانے کا بار نہیں پڑتا اور نہ اس قدر کثیر المقدار خوراک ہضم کرنے کا - اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس میں زیادہ تر قوت ہمت کی اور بہت کچھ چستی و چالاکی پائی جاتی ہے - پھر اگر ہم گھاس خور بھیڑ کی

احمقانہ سستی و کاہلی کا کتے کی چستی و چالاکی کے ساتھ مقابلہ کریں - جو گوشت یا اناج پر یا دونوں چیزوں پر گزارہ کرتا ہے - تو ہم کو ایسا ہی فرق نظر آئے گا جو بلحاظ نوعیت کے اُسی قسم کا ہے - (جو گائے اور گھوڑے میں پایا جاتا ہے) مگر بلحاظ درجہ کے اُس سے بھی زیادہ ہے - اور اگر ہم چڑیا گھر کی سیر کر کے اس بات پر غور کریں کہ گوشت خور جانور کیسی بے چینی کے ساتھ کبھی اپنے پنجروں کے اوپر جاتے ہیں اور کبھی نیچے آتے ہیں - تو صرف اس بات کے یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ یہ زائد قوت نباتات خور جانوروں میں سے کسی جانور میں عادۃً نہیں پائی جاتی - اور اس بات کے سمجھنے کی ضرورت ہے کہ خوراک کے مقوی ہونے اور چستی و چالاکی کے درجہ میں کس قدر صریح تعلق ہے -

یہ تفاوت جیسا کہ بعض اشخاص حجت پیش کر سکتے ہیں - جسمانی ساخت کے اختلاف کا براہ راست نتیجہ نہیں - بلکہ اُس خوراک کے اختلاف کا نتیجہ ہے جس پر گزارہ کرنے کے لیے ان حیوانات کا جسم بنایا گیا ہے - اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہی اختلاف ایک ہی نوع کی مختلف صنفوں میں دیکھا جاتا ہے - گھوڑے کی مختلف قسموں سے اس امر کی توضیح ہوتی ہے - بڑے پیٹ والے سست اور مریل یکّہ کے گھوڑے کا مقابلہ - شکار یا گھوڑ دوڑ کے گھوڑے کے ساتھ کرو جس کے پہلو چھوٹے چھوٹے اور مضبوط ہوتے ہیں - اور پھر اس بات کو یاد کرو کہ ایک کی خوراک دوسرے کی خوراک کے مقابلہ میں کس قدر کم مقوی ہوتی ہے - یا نوع انسانی کی مثال لو - اہل آسٹریلیا - جنوبی افریقہ کی خانہ بدوش قومیں اور ان کے علاوہ نہایت ادنیٰ درجہ کے وہ وحشی لوگ - جو جڑوں اور جنگلی پھلوں پر گزارہ کرتے اور کبھی کبھی چھوٹے چھوٹے کیڑے اور اسی قسم کی ادنیٰ خوراک کھا لیتے ہیں - نسبتہً پست قد ہوتے ہیں اُن کے پیٹ بڑے بڑے اور عضلات نرم اور غیر نشوونما یافتہ ہوتے ہیں - اور وہ

امثلہ مذکورہ بالا میں حیوانات کی چستی و چالاکی اور سستی و کاہلی کی تفاوت اختلاف خوراک کا نتیجہ ہے نہ کہ جسمانی ساخت کے اختلاف کا -

ہاتھاپائی یا زیادہ محنت کرنے میں اہل فرنگ کے ساتھ بالکل یگانہیں کہا سکتے۔ اب اُن وحشی قوموں کو شمار کرو جو پورے قدوالی۔ مضبوط اور چست و چالاک ہیں۔ جیسے کافر[51]۔ شمالی امریکہ کے وحشی باشندے۔ اور اہل پٹیاگونیا[52]۔ اور تم کو معلوم ہوگا کہ وہ بڑے گوشت خوار ہیں۔ ادنی خوراک کھانے والا ہندو انگریز کا مقابلہ جو زیادہ مقوی خوراک کھاتا ہے۔ نہیں کرسکتا۔ اور وہ عقلی قوت میں بھی انگریز سے اُسی قدر کم ہے۔ جس قدر کہ جسمانی قوت میں۔ اور ہمارا خیال یہ ہے کہ دنیا کی تاریخ عموماً یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ عمدہ خوراک کھانے والی قومیں قوی اور غالب رہی ہیں۔

کسی جانور کو جس قدر کم یا زیادہ مقوی خوراک دی جاتی ہے۔ وہ اُسی قدر کم یا زیادہ محنت برداشت کرسکتا ہے۔ اور گھوڑے کی مثال سے اس امر کی توضیح۔

مگر جب ہم یہ بات دیکھتے ہیں کہ ایک خاص حیوان کی خوراک جس قدر کم یا زیادہ مقوی ہوتی ہے۔ وہ اسی قدر کم یا زیادہ محنت کرسکتا ہے۔ تو یہ حجت اور بھی قوی ہوجاتی ہے۔ یہ بات گھوڑے کی حالت میں ثابت ہوچکی ہے۔ اگرچہ گھاس خور گھوڑے کے بدن پر گوشت چڑھ جاتا ہے۔ مگر اُس کی طاقت جاتی رہتی ہے۔ جیسا کہ اُس کو سخت کام پر لگانے سے ثابت ہوتا ہے "گھوڑوں کو گھاس پر چھوڑ دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ اُن کے عضلات ڈھیلے پڑجاتے ہیں کہ اگر کسی بچھڑے کو سمتھ فیلڈ کی منڈی میں بھیجنے کے لیے تیار کیا جائے تو اوس کے لیے گھاس بہت عمدہ چیز ہے۔ مگر شکاری گھوڑے کے لیے بہت خراب ہے" قدیم زمانہ میں لوگ اچھی طرح یہ بات جانتے تھے کہ شکاری گھوڑوں کو کھیتوں میں موسم گرما بسر کرنے کے بعد کئی مہینے اصطبل میں رکھ کر خوراک دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تب جاکر وہ شکاری کتوں کا ساتھ دے سکتے ہیں۔ اور یہ بات کہ آیندہ موسم بہار کے آغاز تک اُن کی حالت

---

[51] براعظم افریقہ کی اُس وحشی قوم کو جو ٹیگر دانیشہ اور کیپ کالونی کے درمیان رہتی ہے۔ کافر کہتے ہیں۔ خاصکر اس حصہ کے رہنے والوں کو جو کافریا میں رہتے ہیں۔ مترجم

[52] پٹیاگونیا۔ قدیم نام اس ملک کا ہے جو جنوبی امریکہ کا جنوبی سرا ہے۔ مترجم۔

عمدہ نہیں ہوتی - اور آج کل کا دستور جس پر مسٹر اپیر سے نے زور دیا ہے - یہ ہے کہ وہ شکاری گھوڑے کو گرمی کے موسم میں گھاس پر کبھی نہ چھوڑو - اور خاص اور نہایت مساعد حالتوں کے سوا - اُس کو کبھی باہر نہ نکلنے دو" اِس کے یہ معنی ہیں کہ اُس کو ادنیٰ درجہ کی خوراک ہرگز نہ دو - صرف مقوی خوراک کے متواتر استعمال سے زیادہ طاقت اور جفاکشی پیدا ہوتی ہے - یہ بات - جیسا کہ مسٹر اپیر سے نے ثابت کیا ہے - ایسی صحیح ہے کہ اگر متوسط درجہ کے گھوڑے کو ایک عرصہ دراز تک اعلیٰ درجہ کی خوراک دی جائے - تو وہ اپنے کرتبوں میں اُس اول درجہ کے گھوڑے کا مقابلہ کر سکتا ہے جس کو معمولی خوراک ملتی ہو - اِن مختلف شہادتوں پر اس عام واقعہ کا اور اضافہ کرو کہ جب کسی گھوڑے سے دُگنا کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے تو دستور ہے کہ اس کو لوبیا دیتے ہیں یہ ایسی خوراک ہے جس میں گھوڑے کی معمولی خوراک یعنی جو کی نسبت نائٹروجن یعنی گوشت بنانے والے مادہ کی مقدار زیادہ ہوتی ہے -

انسان پر بھی مقوی اور غیر مقوی خوراک کا اثر نہایت نمایاں ہوتا ہے - اور چند مثالوں سے اس امر کی تشریح

یہ حقیقت خاص اشخاص کی حالت میں بھی اسیقدر یا اس سے بڑھ کر صفائی کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے - ہم اُن لوگوں کا حوالہ نہیں دیتے - جن کو طاقت آزمائی کے کرتبوں کی تعلیم دی جاتی ہے - اِن کی غذا تو اس اصول کے بالکل موافق ہی ہوتی ہے - ہم ریل کے ٹھیکہ داروں اور اُن کے مزدوروں کے تجربہ کا حوالہ دیتے ہیں - یہ امر سالہا سال سے بخوبی مسلم ہو چکا ہے کہ انگلستان کی بحری فوج - جو بہت گوشت کھاتی ہے یوروپ کی بحری فوج کی نسبت - جو اُس خوراک پر گذارہ کرتی ہے جس میں آٹے کے اجزا ملے ہوئے ہوتے ہیں - بہت زیادہ کام کر سکتی ہے - اس قدر زیادہ کہ جن انگریزوں نے یوروپ کی ریلیں بنانے کا ٹھیکہ لیا تھا - انہوں نے دیکھا کہ اپنے مزدوروں کو ساتھ سے جانے میں نفع ہے - یہ بات حال ہی میں صاف صاف ثابت ہو گئی

ہے کہ اس فوقیت کا باعث ۔ غذا کا اختلاف تھا ۔ نہ کہ نسل کا ۔ کیوں کہ یہ نتیجہ برآمد ہوا ہے کہ جب یوروپ کی بحری فوج ۔ اُسی طریقہ پر زندگی بسر کرتی ہے ۔ جس طرح کہ حریف انگریز تو وہ بھی تھوڑے سے عرصہ میں کم و بیش انگریزی فوج کے برابر برابر کام دینے لگتی ہے ۔ اس واقعہ پر ہم کو ایک بالعکس واقعہ اضافہ کرنا چاہیئے ۔ جس کی بابت ہم ذاتی شہادت دے سکتے ہیں ۔ اور جو چھہ مہینے تک خالص نباتاتی غذا کا تجربہ کرنے پر مبنی ہے ۔ یعنی یہ کہ گوشت نہ کھانے سے جسم اور نفس دونوں کی طاقت کم ہو جاتی ہے ۔

ان شہادتوں سے ثابت ہے کہ بچوں کو عمدہ اور مقوی خوراک دینی چاہیئے ۔

کیا یہ مختلف شہادتیں بچوں کی خوراک کی بابت ہماری دلیل کی تصدیق نہیں کرتیں ؟ کیا وہ اس بات پر دلالت نہیں کرتیں ۔ کہ گو بالفرض غیر مقوی خوراک سے اُسی قدر قد و قامت اور ڈیل ڈول حاصل ہو جائے ۔ جس قدر کہ مقوی خوراک سے حاصل ہوتا ہے ۔ تو بھی غیر مقوی خوراک سے جو مادہ پیدا ہوتا ہے وہ باعتبار کیفیت کے بہت ادنٰی درجہ کا ہوتا ہے ؟ کیا وہ شہادتیں اس خیال کو مستحکم نہیں کرتیں کہ اگر قوت اور تیز نمو کو قایم و برقرار رکھنا ہو ۔ تو یہ بات صرف اعلیٰ درجہ کی خوراک دینے سے حاصل ہو سکتی ہے ؟ کیا وہ اس یقینی نتیجہ کی تصدیق نہیں کرتیں کہ "جب بچہ سے جسمانی یا عقلی کام لینے کی کچھ ایسی ضرورت نہیں ہوتی ۔ وہ اُس خوراک سے ۔ جس میں آٹے کے اجزا شامل ہوں ۔ خاصی اچھی طرح نشو و نما حاصل کر سکتا ہے ۔ مگر جب بچہ کو ہر روز نہ صرف نئے مادہ کی واجبی مقدار مہیا کرنی بلکہ اُس نقصان کی تلافی کرنی پڑتی ہے ۔ جو عضلات سے زیادہ کام لینے کا نتیجہ ہے ۔ اور اُس مزید نقصان کی بھی جو دماغ کی سخت ورزش کا نتیجہ ہے ۔ اُس کو ایسی خوراک کا استعمال کرنا ضروری ہے ۔ جس میں مقوی مادہ کی زیادہ تر مقدار شامل ہو" ؟ اور کیا یہ صریح نتیجہ نہیں ہے ۔ کہ اس سے بہتر خوراک کے نہ دینے

سے یا تو نمو یا جسم کی مستعدی ہیں یا نفس کی مستعدی ہیں جیسے کہ جسمانی ساخت اور حالات مقتضی ہوں۔ ضرور فتور واقع ہوگا؟ ہم کو یقین ہے کہ جو شخص منطقیانہ عقل رکھتا ہو۔ وہ اس بات پر اعتراض نہ کرے گا۔ اس کے خلاف رائے رکھنا گویا اُن لوگوں کے پُرانے مغالطہ کو در پردہ تسلیم کرنا ہے۔ جو دوام حرکت کے قائل ہیں۔ یعنی یہ بات مان لینا ہے کہ لاشئے سے قوت حاصل کرنی ممکن ہے۔

بچوں کو ایک ہی قسم کی خوراک دینا سخت غلطی ہے۔

خوراک کی بحث ختم کرنے سے پہلے چند الفاظ خوراک کی ایک اور ضروری شرط یعنی اُس کے تنوّع کی بابت ضرور کہنے چاہییں۔ اس اعتبار سے بچوں کے خورونوش کا انتظام بہت ناقص ہے۔ اگرچہ ہمارے بچوں کو ہمارے سپاہیوں کی طرح "بیس سال تک ابلا ہوا گوشت" کھانے کی سزا تو نہیں دی جاتی۔ تو بھی اُن کو بسا اوقات یکساں خوراک کی تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے۔ اور اگرچہ اُس خوراک کی مداومت نہ تو اس قدر سخت ہوتی ہے اور نہ اس قدر دیرپا تاہم اُن کی خوراک بھی سپاہیوں کی خوراک کی طرح صراحتہً قوانین صحت کے برخلاف ہے۔ یہ سچ ہے کہ دن کے کھانے پر بچوں کو ایسی خوراک دی جاتی ہے جس میں کم و بیش کئی چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ مگر ناشتہ میں ہفتہ بہفتہ۔ ماہ بماہ اور سال بسال وہی دودھ روٹی ملتی ہے۔ یا شاید آش جو ملتا ہو۔ اور شام کو اسی قسم کی مداومت کے ساتھ دوبارہ دودھ روٹی یا چائے۔ اور "مکھن روٹی" دی جاتی ہے۔

خوراک کی تبدیلی کی ضرورت اور اُس کے فوائد۔

یہ دستور علم الاعضا کے احکام کے خلاف ہے۔ ایک ہی کھانا بار بار کھانے سے جو نفرت پیدا ہو جاتی ہے اور جو کھانا بہت دنوں سے نہ کھایا ہو اُس سے جو لطف حاصل ہوتا ہے۔ یہ دونوں باتیں۔ جیسا کہ لوگ بے پروائی سے فرض کر لیتے ہیں۔ بے معنی نہیں ہیں۔ بلکہ طرح طرح کی صحت بخش خوراک کے لیے محرک ہیں۔ بے شمار تجربوں سے ثابت ہو گیا ہے کہ شاید کوئی ایک خوراک خواہ کیسی ہی

عمدہ ہو۔ ایسی نہیں جس میں ایسے تمام اجزا مناسب مقدار یا صحیح شکل میں موجود ہوں جو جسمانی نشو و نما کو باقاعدہ جاری رکھنے کے لیے مطلوب ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خوراک کے تمام اجزا کی مقدار کا موازنہ قایم رکھنے کے لیے خوراک کو اکثر تبدیل کرتے رہنے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور حقیقت جو علم الاعضا کے عالموں کو معلوم ہے۔ یہ ہے کہ زیادہ مرغوب غذا سے جو لطف حاصل ہوتا ہے۔ اس سے اعصاب کو تحریک ہوتی ہے اور قلب کا فعل زیادہ ہوتا ہے۔ اور دوران خون۔ جو زیادہ قوت کے ساتھ ہوتا ہے۔ آیندہ ہضم میں مدد دیتا ہے۔ اور یہ حقائق آج کل۔ مویشیوں کو خوراک دینے کے اصول کے مطابق ہیں۔ جو اس بات کی ہدایت کرتے ہیں۔ کہ خوراک اول بدل کردینی چاہیے۔

مگر نہ صرف وقتاً فوقتاً خوراک کی تبدیلی کی بڑی ضرورت ہے۔ بلکہ ان ہی وجوہات سے اس بات کی بھی بڑی ضرورت ہے کہ ہر ایک کھانے پر کئی طرح کی چیزیں استعمال کی جائیں۔ اجزاے خوراک کا بہتر موازنہ اور زیادہ تر عصبی تحریک کا پیدا ہونا یہ دونوں فائدے پہلے کی طرح یہاں بھی حاصل ہوتے ہیں۔ اگر اس کے ثبوت میں واقعات مطلوب ہوں۔ تو ہم ایک یہ واقعہ بیان کر سکتے ہیں کہ اہل فرانس کے کھانے کو جو مقدار میں بہت زیادہ ہوتا ہے۔ مگر اس میں نہایت مختلف قسم کی چیزیں ہوتی ہیں۔ معدہ نسبتہً آسانی کے ساتھ ہضم کر سکتا ہے۔ شاید کسی کو اس پر اعتراض نہ ہوگا۔ کہ ایک ہی قسم کا اتنا بہت کھانا۔ خواہ کیسا ہی عمدہ پکا ہوا ہو۔ ایسی آسانی سے ہضم نہیں ہو سکتا۔ اور اگر کوئی شخص مزید واقعات کا خواہش مند ہو۔ تو وہ "انتظام حیوانات" کے متعلق زمانہ حال کی ہر ایک کتاب میں مل سکتے ہیں۔ جب حیوانات کو ہر ایک کھانے پر کئی چیزیں دی جاتی ہیں۔ تو وہ خوب موٹے تازے ہو جاتے ہیں۔"

ہر ایک کھانے پر کئی طرح کی چیزیں استعمال کرنے کی ضرورت اور اس کی وجہ

گاسن اور سٹارک کے تجربوں سے اس بات کا نہایت قطعی ثبوت ملتا ہے کہ ایک ایسا مرکب پیدا کرنے کی غرض سے - جو معدہ کے فعل کے لیے سب سے زیادہ مناسب ہو - مختلف چیزوں کی آمیزش مفید بلکہ ضروری ہے[۵۱]"۔

اس اعتراض کا جواب کہ بچوں کو اول بدل کر خوراک دینا یا ایک وقت میں کئی طرح کی چیزیں دینا تکلیف مالا یطاق ہے۔

اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے - جیسا کہ غالباً بہت سے اشخاص کریں گے کہ "بچوں کو اول بدل کر خوراک دینا اور ایسی خوراک دینا - جس میں ہر ایک کھانے پر کئی طرح کی چیزیں ہی ہوں - ایک تکلیف مالا یطاق ہوگی" تو ہم یہ جواب دیں گے کہ جو تکلیف بچوں کے عقلی نشوونما میں ممد و معاون ہو وہ "تکلیف مالا یطاق" نہیں سمجھی جا سکتی - اور یہ کہ بچوں کی آئندہ بہبودی کے خیال سے ممد جسمانی نشوونما کی وقعت اس سے بڑھ کر ہے - علاوہ بریں یہ بات افسوسناک اور عجیب بھی معلوم ہوتی ہے - کہ سوروں کے موٹا تازہ بنانے میں جو تکلیف خوشی خوشی گوارا کی جاتی ہے بچوں کی پرورش میں اُس کو تکلیف مالا یطاق سمجھا جائے -

خوراک کی بابت چند اور ہدایتیں

جو لوگ خوراک کے اس دستور العمل کو - جو ہم نے بتایا ہے - اختیار کرنا چاہیں - اُن کی تنبیہ کی غرض سے چند اور جملے اضافہ کرنے ضروری ہیں - یہ تبدیلی یکایک نہیں ہونی چاہیئے - کیوں کہ متواتر ادنیٰ درجہ کی خوراک کھاتے کھاتے جسمانی نظام ایسا ضعیف ہو جاتا ہے - کہ وہ اعلیٰ درجہ کی خوراک کو فوراً ہضم نہیں کر سکتا - کم مقوی خوراک بذات خود سوء ہضمی کا باعث ہے یہ بات حیوانات کی بابت بھی صحیح ہے " جب ملائی اُترا ہوا دودھ یا لسی یا کوئی اور ادنیٰ درجہ کی خوراک

---

[۵۱] دیکھو "علم تشریح الابدان اور علم الاعضا کی قاموس"

(Cyclopaedia of Anatomy and physiology.)

بچھڑوں کو دی جاتی ہے۔ تو اُن کو بدہضمی ہو جانے کا احتمال ہوتا ہے[۵] پس اسی وجہ سے جہاں قوت کم ہوتی ہے۔ وہاں ضرور ہے کہ اعلیٰ درجہ کی خوراک کی طرف بہ تدریج تبدیلی کی جائے۔ یعنی جس قدر قوت بڑھتی جائے اُسی کے موافق مقوی خوراک کا نیا اضافہ ٹھیک ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ مقوی خوراک حد اعتدال سے نہ بڑھنے پائے۔ مناسب خوراک کی ایک شرط یہ ہے کہ اُس کی اتنی ہی مقدار دی جائے۔ جو پیٹ بھرنے کے لیے کافی ہو۔ اور یہ شرط اُس خوراک کے دینے کی ممانعت کرتی ہے۔ جس میں وہ مادے موجود نہ ہوں جن سے مناسب خوراک مہیا ہوتی ہے۔ اگرچہ عمدہ خوراک کھانے والی شائستہ قوموں میں آلات ہضم کا حجم۔ بری خوراک کھانے والی وحشی قوموں کے مقابلہ میں کم ہوتا ہے اور ممکن ہے کہ اُن کا حجم آخرکار اور بھی کم ہو جائے۔ تاہم بالفعل خوراک کی مقدار کا تصفیہ معدہ کی موجودہ گنجائش کے لحاظ سے ہونا چاہیئے۔ اب ہم خوراک کی دونوں صفتوں کا مناسب لحاظ رکھ کر یہ نتیجے نکالتے ہیں۔

اوّل۔ بچوں کی خوراک اعلیٰ درجہ کی مقوی ہونی چاہیئے۔

دوم۔ ہر ایک کھانے اور اُس کے بعد کے کھانوں پر مختلف قسم کی خوراک ہونی چاہیئے۔

سوم۔ خوراک بہت کافی ہونی چاہیئے۔

خوراک کی طرح بچوں کے لباس میں بھی کمی کی جاتی ہے جسمانی احساسات ہمارے رہبر ہیں نہ کہ گمراہ کرنے والے

خوراک کی طرح لباس میں بھی عام میلان ناواجب کمی کی طرف ہے۔ یہاں بھی رہبانیت اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ ایک عام خیال۔ جو مبہم طور پر لوگوں کے دلوں میں موجود ہے۔ اگرچہ اُس کو قطعی و یقینی اصول کی شکل میں نہیں رکھا گیا۔ یہ ہے

۵ل۔ دیکھو "فن زراعت کی قاموس" مصنفہ مارٹن۔
Morton's Cyclopaedia of Agriculture.

کہ دو احساسات کا کچھ خیال نہیں کرنا چاہیے‘‘ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ لوگوں کا عام اعتقاد جبکہ اس کو بہت شکل میں رکھا جائے۔ یہ ہے کہ دو احساسات ہماری ہدایت کے لیے نہیں۔ بلکہ ہم کو گمراہ کرنے کے لیے ہیں‘‘ یہ سخت غلطی ہے۔ کیوں کہ ہمارے جسم کی ساخت ایسی ہے جس سے قدرت کی بہت زیادہ مہربانی ثابت ہوتی ہے احساسات کی اطاعت نہیں۔ بلکہ اُن کی نافرمانی ہمیشہ جسمانی خرابیوں کا باعث ہوتی ہے۔ بھوک میں نہیں۔ بلکہ بے بھوک کھانا کھانا بُرا ہے۔ پیاس میں پانی پینا نہیں۔ بلکہ جب پیاس بجھ جائے۔ اُس وقت بھی پانی پیتے رہنا بُرا ہے۔ اُس تازہ ہوا میں سانس لینے سے۔ جس کا لطف ہر تندرست آدمی اٹھاتا ہے۔ نقصان نہیں ہوتا۔ بلکہ باوجود پھیپھڑوں کی منافرت کے غلیظ ہوا میں سانس لینے سے نقصان ہوتا ہے۔ اُس مستعدانہ ورزش سے جس کی ترغیب قدرت مضبوطی کے ساتھ دیتی ہے۔ نقصان نہیں ہوتا۔ جیساکہ ہر ایک بچہ کی ورزش سے ثابت ہے۔ بلکہ قدرت کی تحریکوں کا متواتر لحاظ نہ رکھنے سے نقصان ہوتا ہے۔ وہ عقلی کام جو دل کی اُمنگ سے کیا جائے اور جس سے حظ حاصل ہو۔ اُس سے کچھ نقصان نہیں پہنچتا۔ بلکہ نقصان اس کام سے ہوتا ہے جس کو اُس وقت بھی نہیں چھوڑا جاتا۔ جب کہ سر کو گرمی چڑھ جاتا۔ یا سر میں درد ہو جاتا اُس سے باز رہنے کا حکم دیتا ہے۔ وہ جسمانی محنت جو خوش گوار ہو۔ یا نہ خوش گوار ہو۔ اور نہ ناگوار۔ اُس سے نقصان نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ محنت نقصان پہنچاتی ہے جو اُس وقت بھی جاری رہے جب کہ تکان اُس کی ممانعت کرتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ جن لوگوں نے مدت تک بیماری میں زندگی بسر کی ہے۔ اُن کے احساسات قابل اعتبار رہ نہیں ہوتے۔ جو لوگ برسوں تقریبًا ہمیشہ ہی گھر کی چار دیواری میں مقید رہے ہیں۔ جنھوں نے اپنے دماغ سے بہت زیادہ کام لیا ہے اور اپنے جسموں سے شاید بالکل ہی نہیں لیا جنھوں نے

کھانا کھانے میں۔ بغیر اس کے کہ اپنے معدہ سے صلاح لیں۔ اپنے گھنٹے گھڑی کی پیروی کی ہے۔ اغلب ہے کہ ایسے لوگ اپنے فاسد احساسات کی وجہ سے گمراہ ہو جائیں۔ مگر اُن کی یہ ابتر حالت ہی احساسات کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہے۔ اگر وہ بچپن سے اُس احساس کی جس کو ہم "جسمانی قوت ممیزہ" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ نافرنی نہ کرتے۔ تو یہ قوت پژمردہ نہ ہوتی بلکہ ایک وفادار ناصح بنی رہتی۔

بچوں کے لباس میں گرمی اور سردی کے احساس کا لحاظ رکھنا لازم ہے۔ اُن کو "جفاکش" بنانے کے خیال سے کم لباس پہنانا محض لغو ہے۔

من جملہ ان احساسات کے جو ہماری ہدایت کا کام دیتے ہیں گرمی اور سردی کا احساس ہے۔ اور اگر بچوں کے لباس میں اِن دونوں باتوں کا احتیاط کے ساتھ لحاظ نہ رکھا جائے۔ تو ایسے لباس کو قابل الزام سمجھنا چاہیئے۔ یہ عام خیال کہ بچوں کو "جفاکش بنانا" چاہیئے۔ سخت دھوکا ہے۔ بہتیرے بچے تو جفاکش بنتے بنتے ہی دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اور جو بچ جاتے ہیں۔ اور جو بچ جاتے ہیں اُن کے نمو یا جسمانی ساخت کو دائمی نقصان پہنچتا ہے۔ ڈاکٹر کوم کہتے ہیں کہ "بچوں کی صورت شکل کی نزاکت اُس نقصان کی کافی علامت ہے جو اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور اُن پر بیماری کے متواتر حملے ہونے۔ سب فکر والدین کے لیے بھی ایک تنبیہ کا کام دے سکتے ہیں"۔ وہ دلیل جس پر اس "جفاکش بنانے" کے خیال کی بنیاد ہے۔ نہایت ہی سطحی ہے۔ دولت مند والدین یہ دیکھ کر کہ دہقانوں کے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں کھلی ہوا میں کھیلتے پھرتے ہیں۔ جب کہ اُن کا بدن صرف آدھا ڈھکا ہوا ہوتا ہے۔ اور مزدوروں کی عام صحت کو اس واقعہ کے ساتھ شامل کر کے یہ غلط نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ صحت۔ بدن کے کھلے رہنے کا نتیجہ ہے۔ اور یہ ٹھان لیتے ہیں کہ اپنے بچوں کو بھی تھوڑے کپڑے پہنائیں گے! یہ بات فراموش کر دی جاتی ہے کہ یہ بچے جو دیہات کے سبزہ زاروں میں کھیلتے پھرتے ہیں۔ ان کی حالت اکثر اعتبارات

سے مساعد ہوتی ہے - یعنی اُن کی عمر قریب قریب ہمیشہ کھیل ہی میں صرف ہوتی ہے وہ دن بھر تازہ ہوا میں سانس لیتے ہیں - اور بہت زیادہ دماغی محنت سے اُن کے جسم میں خلل واقع نہیں ہوتا - اُن کی عمدہ صحت اُن کے ناکافی لباس کی وجہ سے نہیں بلکہ باوجود ناکافی لباس کے بھی قایم رہ سکتی ہے - گو یہ بات کیسی ہی خلاف معلوم ہو ہم کو یقین ہے کہ یہ دوسرا نتیجہ صحیح ہے اور یہ کہ حرارت غریزی کا زوال - جس میں وہ مبتلا ہوتے ہیں - یقیناً نقصان پہنچاتا ہے -

سردی میں بدن کے کھلے رہنے سے بمو کو ضرور نقصان پہنچتا ہے -

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب جسمانی نظام اس قدر صحیح و سالم ہو کہ جسم کے کھلے رہنے کی برداشت ہو سکے - تو جسم سختی کی برداشت تو کر لیتا ہے - مگر بمو کو نقصان پہنچاتا ہے - یہ حقیقت حیوان اور انسان دونوں میں یکساں نظر آتی ہے - شٹلینڈ[۵۱] کے ٹٹو جنوبی انگلستان کے گھوڑوں کی نسبت زیادہ سختی کی برداشت کر لیتے ہیں مگر اُن کا قد چھوٹا رہ جاتا ہے - پہاڑی بھیڑیں اور مویشی جو زیادہ سرد آب و ہوا میں رہتے ہیں انگلستان کی بھیڑوں اور مویشی کے مقابلہ میں قد میں چھوٹے ہوتے ہیں - قطبی ممالک میں نسل انسان اپنے معمولی قد سے بہت چھوٹی ہوتی ہے - لیپ لینڈ[۵۲] اور گرین لینڈ[۵۳] کے باشندے بہت بونے ہوتے ہیں - اور ٹیرا ڈل فیوگو[۵۴] کے باشندے جو سرد ملک میں ننگے پھرتے ہیں - ان کی بابت ڈارون نے بیان کیا ہے کہ وہ اس قدر پست قد اور ڈراونی شکل کے ہوتے ہیں کہ مشکل ہی سے کوئی شخص باور کر سکتا ہے کہ وہ اُس کے ہم جنس (انسان) ہیں -

---

۵۱ - شٹلینڈ - ایک مجمع الجزائر ہے جو سکاٹ لینڈ کے شمال کی طرف واقع ہے - مترجم

۵۲ لیپ لینڈ - ایک ملک ہے جو زنگستانی روس اور خلیج باتھنیا کے شمال کی طرف واقع ہے - مترجم - ۵۳ گرین لینڈ - ایک جزیرہ ہے جو یورپ کے گوشہ شمال مغرب میں واقع ہے مترجم

۵۴ - ٹیرا ڈل فیوگو - ایک جزیرہ ہے جو جنوبی امریکہ کے جنوب کی طرف واقع ہے - مترجم -

بیان مذکورہ بالا کی تشریح علمی حیثیت سے

یہ لونا پن جو حرارت کے زیادہ خارج ہو جانے سے پیدا ہوتا ہے۔ سائینس اس کی تشریح کرتا ہے۔ اور یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ نتیجہ لامحالہ پیدا ہوتا ہے۔ بشرطیکہ خوراک اور دیگر امور مساوی ہوں۔ کیوں کہ۔ جیسا پہلے بیان ہو چکا ہے۔ جس حرارت کے زوال سے ہمیشہ بدن میں برودت پیدا ہوتی رہتی ہے اُس کی تلافی کے لیے یہ امر ضروری ہے کہ بعض مادوں پر جو خوراک کا جز ہیں۔ آکسیڈیشن کا عمل برابر جاری رہے۔ اور جس قدر زیادہ حرارت جسم سے خارج ہو ضرور ہے کہ ان مادوں کی مقدار بھی جو آکسیڈیشن کے لیے درکار ہیں اُسی قدر زیادہ ہو۔ مگر آلات ہضم کی قوت محدود ہے۔ اسی وجہ سے جب ان کو اس مادہ کی۔ جو قیام حرارت کے لیے درکار ہے ایک بڑی مقدار تیار کرنی پڑتی ہے تو وہ اُس مادہ کی۔ جو جسم کے بنانے میں کارآمد ہوتا ہے صرف تھوڑی سی مقدار تیار کر سکتے ہیں۔ جب بہت زیادہ مادہ ایندھن ہی میں صرف ہو جاتا ہے۔ تو دوسرے کاموں کے لیے کم مادہ رہ جاتا ہے۔ پس اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو قد چھوٹا ہو جاتا ہے یا جسمانی ساخت ادنیٰ درجہ کی رہ جاتی ہے۔ یا دونوں نقص پیدا ہو جاتے ہیں۔

جسم کو حرارت پہنچانے کے اعتبار سے لباس خوراک کی ایک خاص مقدار کا کام دیتا ہے

اسی وجہ سے لباس نہایت مہتم الشان چیز ہے۔ مسٹر لیبک کہتے ہیں کہ "ہمارا لباس۔ جسمانی حرارت کے لحاظ سے۔ خوراک کی ایک مقررہ مقدار کے مساوی ہے"۔ چوں کہ لباس کے سبب جسم کی حرارت کم خارج ہوتی ہے۔ اس لیے حرارت قایم رکھنے کے لیے جو ایندھن مطلوب ہے اُس کی مقدار میں تخفیف ہو جاتی ہے۔ اور جب معدہ کو ایندھن بہم پہنچانے میں کم کام کرنا پڑتا ہے تو وہ دوسرے مادے بہم پہنچانے میں زیادہ کام دے سکتا ہے۔ اس نتیجہ کی تصدیق ان لوگوں کے تجربہ سے ہوتی ہے۔ جو حیوانات کا انتظام کرتے ہیں۔ حیوانات چربی یا عضلات یا نمو کا۔ جیسی کہ صورت ہو۔ نقصان اُٹھائے بغیر سردی کی برداشت نہیں کر سکتے۔

"اگر موٹے تازے مویشیوں کو ایسی جگہہ رکھا جائے جہاں حرارت کم ہو۔ تو یا تو اُن کے نمو میں فتور آجاتا ہے۔ یا اُن کی خوراک کا بہت زیادہ خرچ اُٹھانا پڑتا ہے[۵۱]"

مسٹر ایپیر اس بات پر نہایت زور دیتے ہیں کہ شکاری گھوڑوں کو اچھی حالت میں رکھنے کے لیے ضرور ہے کہ اصطبل کو گرم رکھا جائے۔ جو لوگ گھوڑدوڑ کے گھوڑے پالتے ہیں۔ ان کا یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ ایسے گھوڑوں کو سردی سے بچانا چاہیئے۔

بچوں کے جسم کا گرم رکھنا اور بھی زیادہ ضروری ہے اور اس امر کی تشریح مثالوں کے ذریعے سے۔

یہ علمی حقیقت جس کی توضیح علم النسل انسان کے ذریعے سے ہو چکی ہے اور جس کو کاشتکار اور شکاری تسلیم کرتے ہیں۔ بچوں پر بدرجہ اولیٰ صادق آتی ہے بچوں کو اپنی چھٹائی اور سرعت نمو کی مناسبت سے سردی سے زیادہ نقصان پہنچتا ہے۔ فرانس میں نوزائیدہ بچے سردی میں اکثر اس وجہ سے مرتے ہیں کہ پیدائش کے درج رجسٹر کرانے کے لیے ان کو میئر[۵۲] کے دفتر میں لے جاتے ہیں مسٹر کوئٹ لیٹ نے بیان کیا ہے کہ "بلجیم میں اگر جولائی میں ایک شیرخوار بچہ مرتا ہے۔ تو اُس کے مقابلہ میں جنوری میں دو مرتے ہیں" اور روس میں شیرخوار بچوں کی موت کسی قدر زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ جس جسم نے کما حقہ نشو و نما نہ پایا ہو۔ وہ بلوغ کے قریب پہنچ کر بھی نسبتہً سردی کھانے کی برداشت نہیں کر سکتا تمثیلاً اس بات پر غور کرو کہ سخت معرکہ میں نوجوان سپاہی بہت جلد مغلوب ہوتے ہیں۔ اس کی دلیل صاف ظاہر ہے۔ ہم یہ تو پہلے ہی بیان کر چکے ہیں کہ سطح اور جثہ کے کم و بیش تعلق کی وجہ سے۔ بمقابلہ بالغ آدمی کے بچہ کے

---

۵۱ دیکھو مارٹن صاحب کی کتاب موسوم بہ "قاموس زراعت" (Morton's Cyclopaedia of Agriculture) مترجم

۵۲ شہر کے بڑے مجسٹریٹ یا میونسپل کمیٹی کے بڑے افسر کو میئر کہتے ہیں۔ مترجم

جسم سے - حرارت کی مقدار نسبتہً زیادہ خارج ہوتی ہے - اور یہاں ہم کو یہ بتانا ضرور ہے کہ اس وجہ سے جو نقصان بچہ کو پہنچتا ہے وہ بہت زیادہ ہوتا ہے - مسٹر پے مان کہتے ہیں کہ "کاربانک ایسڈ کی جس قدر مقدار بچوں یا چھوٹے جانوروں کے جسم سے خارج ہوتی رہتی ہے - اگر اُس کا اندازہ بڑے آدمی کے ایک ایسے مفروضہ جسم کے ساتھ کیا جائے جو بچہ کے جسم کا ہم وزن ہو - تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ "بچے بہ نسبت بڑوں کے - دوچند کاربانک ایسڈ پیدا کرتے ہیں"۔ اب غور کرو کہ کاربانک ایسڈ کی جس قدر مقدار خارج ہوتی ہے - اگر ذرا صحت کے ساتھ اندازہ کیا جائے - تو وہ مقدار پیدا شدہ حرارت کی مقدار کے لحاظ سے کم یا زیادہ ہوتی ہے - پس ہم دیکھتے ہیں کہ بچوں کے جسم کو اُس وقت بھی - جب کہ حالات مساعد ہوں - حرارت پیدا کرنے کے لیے - مادہ کی تقریباً دوچند مقدار بہم پہنچانی پڑتی ہے -

بچوں کو ناکافی لباس پہنانا سخت حماقت ہے

پس بچوں کو کم لباس پہنانا سخت حماقت ہے - بھلا کون ایسا باپ ہوگا - گو اُس نے کماحقہ نشوونما حاصل کیا ہو - جس کے جسم سے حرارت کی مقدار نسبتہً دیر میں خارج ہوتی ہے - جس کے جسم کو روزمرہ پال یا مخمل کے سوا اور کسی چیز کی ضرورت نہیں - ہاں ہم پوچھتے ہیں کہ کون ایسا باپ ہے جو برہنہ ٹانگوں - برہنہ بازوؤں اور برہنہ گردن کے ساتھ اِدھر اُدھر پھرنا مفید خیال کرے گا ؟ تاہم یہ بار جس سے وہ خود جھجکتا ہے - اپنے چھوٹے بچوں کے جسم پر ڈالتا ہے جو اس کے برداشت کرنے کی بہت ہی کم قابلیت رکھتے ہیں یا اگر خود اس بار کو نہیں ڈالتا تو بلا اعتراض دوسروں کے ہاتھوں اُن پر اس بار کو پڑتے دیکھتا ہے - اُس کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ایک ایک اونس غذا جو قیام حرارت کے لیے بلا ضرورت صرف ہو جاتی ہے - اُس غذا میں سے منہا ہو جاتی ہے جس سے جسم بنتا ہے - اور یہ کہ

اگر بچے زکام - انجماد خون یا دیگر امراض سے جو اس وجہ سے پیدا ہوتے ہیں بچ گئے - تو بھی نمو کی کمی یا جسمانی ساخت کا نقصان لازمی نتیجہ ہے -

لباس کے متعلق ڈاکٹر کوم کا تجویز کیا ہوا قاعدہ

"پس قاعدہ یہ ہے کہ تمام حالتوں میں یکساں لباس نہیں پہننا چاہیے - بلکہ ایسا پہننا چاہیے جو نوعیت اور مقدار میں ہر شخص کی حالت کے لحاظ سے جسم کو سردی کے ایک دیرپا احساس سے - خواہ وہ کیسا ہی خفیف ہو - پوری طرح محفوظ رکھے" یہ قاعدہ جس کی عظمت کو ڈاکٹر کوم نمایاں الفاظ میں لکھ کر ظاہر کرتے ہیں - ایسا قاعدہ ہے - جس پر عالمان سائنس اور اطبا کا اتفاق ہے - ہم کو کوئی ایسا شخص - جو اس معاملہ پر رائے قایم کرنے کی قابلیت رکھتا ہو - ایسا نہیں ملا - جس نے بچوں کے اعضا کا کھلا رہنا سخت قابل الزام نہ ٹھیرایا ہو - اگر سب سے بڑھ کر کوئی امر ایسا ہے جس میں "مضر دستور" کو ترک کرنا چاہیے تو وہ یہی دستور ہے -

مائیں اپنے بچوں کو اہل فرانس کی تقلید میں بطور دکھاوا لباس پہناتی ہیں - جو ناکافی نامناسب اور نہایت مضر ہوتا ہے -

فی الحقیقت یہ بات قابل افسوس ہے کہ ماؤں کو اس نامعقول دستور کی پیروی میں اپنے بچوں کے جسمانی نظام کو سخت نقصان پہنچاتے دیکھا جاتا ہے - یہ بہت بڑی بات ہے کہ وہ ہر ایک حماقت کی پیروی کریں - جس کو اُن کے فرانسیسی ہمسائے رواج دینا پسند کرتے ہیں - مگر یہ بات نہایت وحشت انگیز ہے کہ والدین - بلا لحاظ اس امر کے کہ بچوں کا لباس ناکافی اور نامناسب ہے - اُن کو شیخی اور نمود کا وہ لباس پہناتے ہیں جو "خواتین کے ایک اخبار میں جس میں نئے نئے فیشن کے لباس کی تصویریں ہوتی ہیں" بتایا جاتا ہے - اس سے بچوں کو کم و بیش زیادہ تکلیف ہوتی ہے - اکثر بیماریاں اُن کے پیچھے لگ جاتی ہیں - نمو رک جاتا ہے یا جسمانی طاقت زائل ہو جاتی ہے - اور عموماً قبل

از وقت موت آجاتی ہے اور یہ تمام مصیبتیں اس وجہ سے اُٹھانی پڑتی ہیں۔ کہ یہ بات ضروری سمجھی گئی ہے کہ بچوں کے کوٹ اُسی ناپ اور اُسی کپڑے کے بنائے جائیں جس کی ہدایت اہل فرانس کی تلون مزاجی کرتی ہے۔ صرف اتنی ہی بات نہیں کہ مائیں اہل فرانس کی ریس سے اپنے چھوٹے بچوں کو اس طرح ناکافی لباس کے ذریعہ سے سزا اور تکلیف دیتی ہیں۔ بلکہ ایسی ہی وجہ سے اس وضع کا لباس تجویز کرتی ہیں جو صحت بخش کھیل کود کو روکتا ہے۔ اس خیال سے کہ لباس خوش نما معلوم ہو ایسے رنگ اور ایسی بناوٹ پسند کی جاتی ہے۔ جو اُس سخت لتاڑ کی برداشت کے لیے بالکل مناسب نہیں ہے۔ جو آزادانہ کھیل کود کے سبب ہوتی رہتی ہے۔ اور پھر آزادانہ کھیل کود کی ممانعت اس وجہ سے کی جاتی ہے کہ کپڑے خراب نہ ہوں۔ ایک بچہ جو زمین پر اِدھر اُدھر رینگ رہا ہے اُس کو حکم دیا جاتا ہے کہ "فوراً کھڑے ہو جاؤ۔ تمہارا صاف ستھرا کوٹ میلا ہو جائے گا" چند بچے اُستانی کی نگرانی میں ہیں ایک بچہ کسی ٹیلے پر چڑھنے کے لیے پٹا سے ہٹ گیا ہے۔ اور اُستانی اُس سے کہتی ہے "واپس چلے آؤ۔ تمہاری جرابیں میلی ہو جائینگی" اس طرح یہ خرابی دوچند ہو جاتی ہے۔ اِس غرض سے کہ بچے اپنی ماں کی خوب صورتی کے معیار تک پہنچ جائیں اور اُس کے دوست احباب اُن کو سراہیں۔ یہ امر ضروری ہے کہ اُن کا لباس مقدار میں کم اور بناوٹ میں نامناسب ہو۔ اور ان آسانی سے خراب ہو جانے والے کپڑوں کو صاف۔ ستھرا۔ اور صحیح وسالم رکھنے کے لیے بچوں کو اُس چونچال پن سے روکا جاتا ہے۔ جو اُن کے لیے بالکل جبلّی اور ضروری ہے جس ورزش کی ضرورت اُس وقت دوچند ہوتی ہے۔ جب کہ لباس ناکافی ہو۔ اس ورزش کو اس وجہ سے روکا جاتا ہے کہ مبادا کپڑے بدنما ہو جائیں۔ اے کاش اس انتظام کی خوفناک بے رحمی کو وہ لوگ سمجھ سکتے۔ جو اِس کو قایم رکھتے ہیں! ہم

اس بات کے کہنے میں پس وپیش نہیں کرتے کہ ظاہری بھڑک کے اس غیر محتاط خیال سے کم زور صحت - ناقص قوی اور زندگی کی ناکام یابی جوان باتوں کا نتیجہ ہے - ان کی وجہ سے ہزاروں آدمی سال لبسال بدبختی کی سزا بھگتتے ہیں - اور اگر وہ بالفرض قبل از وقت موت کے سبب - ماں کی خود بینی کے "دیوتا" کی بھینٹ سچ مچ نہیں چڑھتے تو بدبختی کی سزا تو ضرور ہی بھگت لیتے ہیں - ہم نہیں چاہتے کہ سخت تدبیریں سجھائیں - مگر دراصل یہ خرابیاں ایسی سخت ہیں کہ ماں باپ کی طرف سے دست اندازی یقیناً مناسب بلکہ ضروری ہے - پس ہمارے نتائج حسب ذیل ہیں -

لباس کے متعلق چند ہدایتیں -

اوّل - بچوں کا لباس ہرگز اس قدر زیادہ نہ ہونا چاہیئے - جس سے شدید حرارت پیدا ہو - اور ہمیشہ اس قدر کافی ہونا چاہیئے کہ سردی کا عام احساس نہ ہو -

دوم - بُروں[1] - سن یا ملی جلی بناوٹ کے مہین کپڑوں کے بجائے - جو عام طور پر استعمال کیے جاتے ہیں - کسی ایسے عمدہ مادہ کا کپڑا ہونا چاہیئے - جس سے جسم کی حرارت باہر نہ نکلنے پائے - مثلاً دبیز اونی کپڑا -

[1] اس بات کا بیان کرنا ضروری ہے کہ جن بچوں کی ٹانگیں اور بازو شروع ہی سے کھلے رہنے کے عادی ہوتے ہیں - اُن کو یہ شعور نہیں رہتا کہ کھلا ہوا بدن ٹھنڈا ہے - بعینہٖ جس طرح کہ ہم کو اُس وقت بھی جب کہ گھر سے باہر ہوتے ہیں - اس بات کا شعور نہیں ہوتا کہ ہمارے چہرے ٹھنڈے ہیں - لیکن اگرچہ ایسے بچوں کا احساس آئندہ باقی نہیں رہتا - تاہم اِن سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اُن کا جسم نقصان سے محفوظ رہتا ہے ٹھیک جیسے کہ یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ ٹیرا ڈل فیوگو کے باشندوں کو ننگے بدن رہنے سے اس وجہ سے نقصان نہیں پہنچتا کہ وہ برہنہ جسم پر بکلیتی برف کے گرنے کی بے پروائی سے برداشت کر سکتے ہیں - مصنف -

سوم - کپڑا ایسا مضبوط ہونا چاہیئے جس کو گھسنے اور پھٹنے سے کم نقصان پہنچے جو طفلانہ کھیل کود کی وجہ سے ہوتا ہے -

چہارم - اُس کا رنگ ایسا ہونا چاہیئے - کہ استعمال میں آنے اور کھُلے رہنے سے جلد نہ اُڑ جائے -

لڑکوں کی جسمانی ورزش کی طرف آجکل لوگوں کی توجہ مبذول ہونے لگی ہے -

جسمانی ورزش کی ضرورت پر تو اکثر لوگ پہلے ہی توجہ کرنے لگے ہیں - شاید جسمانی تعلیم کی اس ضرورت پر - بہ نسبت اکثر دیگر ضروریات کے - کم از کم جہاں تک کہ یہ تعلیم لڑکوں سے متعلق ہے - بحث کی ضرورت کم ہے - عام مدارس اور خانگی مدارس میں بھی خاصے کافی کھیل کے میدان مہیا کیے گئے ہیں - اور بیرونی کھیلوں کے لیے عموماً وقت کا معقول حصہ دیا جاتا ہے - اور اُن کی ضرورت تسلیم کی جاتی ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر اور کسی امر میں نہیں تو اس امر میں یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ طفلانہ میلان کی تحریک کی پیروی مفید ہے اور یہ جو آجکل دستور ہے کہ صبح اور شام کے دراز سبقوں کے بعد کھلی ہوا میں تفریح کے لیے چند منٹ کی چھٹی دیجاتی ہے حقیقت میں ہم کو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ کے قواعد و ضوابط کو شاگردوں کے جسمانی احساسات کے موافق بنانے کا میلان روز بروز بڑھتا جاتا ہے - پس یہاں تشریح یا تجویز کے طور پر کچھ بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے -

لڑکیوں کی جسمانی ورزش کی طرف سے لوگ ابتک غافل ہیں -

مگر ہم نے بیان مذکورہ میں یہ عبارت کہ "جہاں تک کہ یہ تعلیم لڑکوں سے متعلق ہے" اضافہ کر کے مجبوراً اُس کے مفہوم کو محدود کر دیا ہے - بدقسمتی سے لڑکیوں کے لیے صورت واقعہ بالکل مختلف ہے - یہ کسی قدر عجیب اتفاق ہے کہ ہم کو ہر روز لڑکوں اور لڑکیوں کا مقابلہ کرنے کا موقع ملتا ہے - ایک لڑکوں کا مدرسہ اور ایک لڑکیوں کا مدرسہ دونوں ہر روز ہماری نظر سے گزرتے ہیں - اور

اِن میں نمایاں فرق ہے لڑکوں کے مدرسہ میں تو ایک بڑے باغ کے قریب قریب پورے حصہ کو ایک کھلا میدان بنا دیا ہے جس میں بجری کٹی ہوئی ہے - کھیل کود کے لیے کافی گنجائش ہے - اور ورزش کے کرتبوں کے لیے بلّیاں اور ورزش کا سامان مہیا کیا گیا ہے - ہر روز ناشتہ سے پہلے - پھر گیارہ بجے کے قریب - پھر دوپہر کے وقت - پھر سہ پہر کو - اور مدرسہ بند ہونے کے بعد ایک دفعہ اور جب کہ لڑکے کھیلنے کے لیے باہر نکلتے ہیں تو آس پاس کے مقامات اُن کے اکٹھے مل کر شور و غل کرنے اور قہقہے لگانے سے گونج اُٹھتے ہیں - اور جب تک وہ وہاں رہتے ہیں آنکھیں اور کان دونوں اِس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ اُن پُر لطف کھیلوں میں محو ہیں جن سے نبض تیز چلنے لگتی ہے اور ہر ایک عضو کا صحت بخش عمل ہوتا ہے - مگر نوجوان شریف زادیوں کی تعلیم کا جو انتظام کیا گیا ہے - اُس کی تصویر کیسی مختلف ہے! جب تک یہ بات بتائی نہ گئی - درحقیقت ہم کو یہ معلوم نہیں ہوا تھا - کہ ہم سے جس قدر قریب لڑکوں کا مدرسہ ہے - اُسی قدر قریب لڑکیوں کا مدرسہ بھی ہے - اِس مدرسہ کے باغ میں جو بالکل اتنا ہی بڑا ہے جتنا لڑکوں کے مدرسہ کا - لڑکیوں کے کھیل کے سامان کا مطلق کوئی نشان نہیں ہے - مگر نفیس گھاس کے قطعات - بجری کی روشوں جھاڑیوں اور پھولوں سے بالکل آراستہ ہے - جیسا کہ مضافات میں معمولی طور پر ہوا کرتا ہے - پانچ مہینے میں ایک دفعہ بھی کسی لڑکی کے ہنسنے بولنے یا شور و غل کی آواز سے اس مدرسہ کی طرف ہماری توجہ مبذول نہیں ہوئی - کبھی کبھار لڑکیاں درسی کتابیں ہاتھ میں لیے روشوں پر پھرتی ہوئی - یا ہاتھ میں ہاتھ دیئے سیر کرتی ہوئی دیکھی جا سکتی ہیں - بے شک ایک دفعہ ہم نے باغ کے گرد ایک لڑکی کو دوسری لڑکی کے پیچھے دوڑتے دیکھا تھا مگر اس کے سوا کسی قسم کی طاقت بخش ورزش دیکھنے میں نہیں آئی -

کم خوری کم زوری اور نزاکت غلطی سے شریف زادیوں کی شان کے مناسب سمجھی جاتی ہیں یہی وجہ ہے کہ لڑکیوں کو کھیل اور ورزش سے روکا جاتا ہے۔

یہ تعجب خیز فرق کیوں ہے؟ کیا یہ بات ہے کہ لڑکی کی جسمانی ساخت لڑکے کی جسمانی ساخت سے اس قدر مختلف ہے کہ اُس کو اِن اچھل کود کی ورزشوں کی ضرورت نہیں ہے؟ کیا یہ بات ہے کہ لڑکیوں کو شور و غل کے کھیل کی طرف کوئی رغبت نہیں ہوتی۔ جس کی طرف لڑکوں کو رغبت ہوتی ہے؟ یا یہ بات ہے کہ لڑکوں کی اس رغبت کو تو جسمانی مستعدی کا محرک سمجھا جاتا ہے۔ جس کے بغیر کافی نشو ونما نہیں ہو سکتا۔ مگر اُن کی بہنوں کو قدرت نے یہ رغبت معلمات کے دق کرنے کے سوا اور کسی مقصد کے لیے نہیں دی؟ مگر شاید ہم اُن لوگوں کا مقصد سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں۔ جو لڑکیوں کو تربیت کرتے ہیں۔ ہم کو ایک خفیف سا گمان ہے کہ قوی الجثہ لڑکیوں کا پیدا کرنا غیر ضروری سمجھا جاتا ہے۔ دہقانوں کی سی صحت اور زیادہ طاقت فرا شرافت کے خلاف سمجھی جاتی ہیں۔ ایک طرح کی نزاکت۔ اتنی طاقت کہ ایک دو میل سے زیادہ پیدل نہ چل سکیں۔ نازک اور قلیل اشتہا اور ڈرپوک ہونا۔ جو کم زوری کے ساتھ عموماً ہوا کرتا ہے۔ یہ سب باتیں زیادہ تر خواتین کی شان کے شایان سمجھی جاتی ہیں۔ ہم کو یہ توقع نہیں کہ کوئی شخص صاف صاف اس بات کا اقرار کرے گا۔ مگر ہماری رائے میں اُستانی جی کے دل میں اکثر یہی خیال آتا ہو گا کہ ایک نوجوان خاتون کی ایسی کامل مثال پیدا کی جائے۔ جو نمونہ مذکورہ بالا سے کچھ کم مشابہت نہ رکھتی ہو۔ اگر یہ صورت ہے۔ تو یہ بات تسلیم کرنی چاہیے کہ لڑکیوں کی تربیت کے مقررہ دستور العمل کی بابت یہ رائے ٹھیک ہے کہ وہ اسی نمونہ کی لڑکیاں پیدا کرنی چاہتا ہے۔ مگر یہ خیال کہ عورتوں کا کامل معیار یہی ہے سخت غلطی ہے۔ یہ بات کہ "مرد۔ مردانہ عورتوں کی طرف عموماً مائل نہیں ہوتے" بلاشک صحیح ہے۔ ہم اس بات کو بالکل مانتے ہیں کہ وہ کم زوری۔ جو بمقابلہ مردوں کے عورتوں میں پائی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے اُن کی حفاظت کے لیے اعلیٰ طاقت (مردوں)

کی ضرورت ہے کشش کا ایک باعث ہے - مگر یہ تفاوت - جس کو اس طرح مردوں کے خیالات نے تسلیم کیا ہے - قدرتی اور ازل سے مقرر کیا ہوا ہے - جو بغیر مصنوعی وسائل کے خود بخود ظاہر ہوتا ہے - اور جب مصنوعی وسائل سے اِس تفاوت کا درجہ بڑھ جاتا ہے (یعنی عورتیں زیادہ زار و نحیف بن جاتی ہیں) تو یہ امر مردوں کی نفرت کا باعث ہوتا ہے - نہ کہ رغبت کا -

یہ خیال محض غلط ہے کہ اگر لڑکیوں کو لڑکوں کی طرح کھیل کود کی اجازت دی جائے - تو وہ شوخ اور بے باک ہو جائیں گی

اب ایک معقولیت کا حامی کہہ اُٹھے گا کیوں تو پھر لڑکیوں کو وحشیانہ کود پھاند یعنی لڑکوں کی طرح شوخ بننے اور اکھڑپنے کی کھیل کھیلنے اور بے باک بننے دینا چاہیئے ہمارا خیال یہ ہے کہ معلمات کو بھی کھٹکا ہمیشہ لگا رہتا ہے - ہم کو دریافت کرنے سے معلوم ہوا ہے کہ دو نوجوان خاتونوں کے مدرسہ میں شور و غل کے ایسے کھیل جو لڑکے ہر روز کھیلتے ہیں - قابل تعزیر جرم ہیں - اور ہم اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ ممانعت اس وجہ سے ہے کہ مبادا اُن میں ایسی عادتیں پیدا ہو جائیں - جو شریف زادیوں کے شان کے خلاف ہیں - مگر یہ خوف بالکل بے بنیاد ہے - کیونکہ جس حالت میں کھیل کود کی مستعدی جس کی اجازت لڑکوں کو دی جاتی ہے - لڑکوں کو بڑے ہو کر شریف آدمی بننے سے نہیں روکتی تو اسی قسم کے کھیل کود کی مستعدی لڑکیوں کو بڑے ہو کر شریف زادیاں بننے سے کیوں روکنے لگی ؟ جو نوجوان مدرسہ کی تعلیم سے فارغ ہو چکے ہیں کھیل کے میدان میں - خواہ کیسے ہی اکھڑپنے کے کھیل اُنہوں نے کھیلے ہوں - مگر وہ بازار میں دو بینا ڈرک کی جست[1] کا کھیل - یا ملاقات کے کمرہ میں سنگ مرمر کی گولیوں سے نہیں کھیلتے - جس وقت وہ طفلانہ لباس پہننا ترک کرتے ہیں - اُس کے ساتھ ہی کھیل کود کو بھی خیرباد کہہ دیتے ہیں"

[1] لڑکوں کا ایک کھیل ہے - اس میں ایک لڑکا آگے کو جھکا جاتا ہے - اور دوسرا اُس کے کندھوں پر ہاتھ دھر کر اوپر سے اُچک کر کود جاتا ہے - مترجم -

اور جو کرتب مردانہ نہیں ہیں۔ اُن سے باز رہنے کی ایک خواہش۔ بلکہ بسا اوقات ایک مضحکہ انگیز خواہش۔ ظاہر کرتے ہیں۔ پس اگر مناسب عمر کو پہنچ کر۔ مردانہ عزت کا پاس۔ لڑکوں کے کھیل کود کی ایسی پوری پوری روک تھام کرتا ہے تو کیا زنانہ شرم و حیا کا پاس۔ جو بلوغ کے ساتھ ساتھ پختہ ہو جاتا ہے لڑکیوں کے اُسی قسم کے کھیلوں کی پوری پوری روک تھام نہ کریگا؟ کیا عورتوں کو ظاہر داری کا خیال مردوں سے بھی زیادہ نہیں ہوتا؟ اور کیا اسی وجہ سے۔ جن کھیلوں میں اکھڑپن اور شوخی پائی جاتی ہے۔ اُن کی روک تھام کا اور بھی زیادہ خیال عورتوں میں پیدا نہ ہوگا؟ یہ قیاس کیسا بیہودہ ہے کہ اگر معلمات ”سخت تربیت“ نہ کریں۔ تو زنانہ فطرت کا ظہور نہ ہوگا۔

کھیل کود جمناسٹک سے بدرجہا بہتر ہے اور جمناسٹک کی نقصانات

مثل اور حالتوں کے اس حالت میں بھی ایک مصنوعی تدبیر کی خرابیوں کے تدارک کے لیے۔ دوسری مصنوعی تدبیر کو رواج دیا گیا ہے۔ چوں کہ قدرتی اور طبیعی ورزش کی ممانعت کی گئی ہے۔ اور ورزش نہ کرنے کے خراب نتیجے صاف نظر آتے ہیں اس لیے مصنوعی ورزش۔ یعنی جمناسٹک کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ مطلق ورزش نہ کرنے سے جمناسٹک بہتر ہے۔ مگر ہم اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ یہ ورزش کھیل کود کا کافی بدل ہے۔ اس کے نقصان مثبت اور منفی دونوں قسم کے ہیں۔

اوّل تو عضلات کی اِن حرکتوں میں جو یہ تکلیف کی جاتی ہیں۔ طفلانہ کھیل کود کی حرکتوں کے مقابلہ میں تنوّع یقیناً کم پایا جاتا ہے۔ اور اِن حرکتوں سے جسم کے کل حصوں پر فعل کی مساوی تقسیم نہیں ہوتی۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خاص خاص اعضا پر بار پڑنے کے سبب اس طریقہ سے۔ بہ نسبت کسی دوسرے طریقہ کے۔ تکان بہت جلد پیدا ہو جاتی ہے۔ اس نقصان پر سر دست ہم اتنا اضافہ اور کرتے

ہیں۔ کہ اگر خاص خاص اعضا پر ہمیشہ بار پڑتا رہے۔ تو اُس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نمو
میں تناسب قایم نہیں رہتا۔ دوسرے یہ کہ اس قسم کی ورزش کی مقدار نہ صرف
(اعضا کے فعل کی) غیر مساوی تقسیم کی وجہ سے کم ہوگی۔ بلکہ اُس میں اس وجہ سے
اور بھی کمی ہوگی کہ بچوں کو اُس سے دل چسپی نہیں ہوتی۔ اس قسم کی حرکتیں۔
مقررہ سبقوں کی شکل اختیار کر لینے کے سبب۔ بعض اوقات ناگوار ہوتی ہیں۔ اور
بالفرض ناگوار نہ ہوں۔ تو بھی بوجہ عدم تفریح۔ تکان کا باعث یقیناً ہوتی ہیں۔ یہ سچ
ہے کہ رقابت اِس قسم کی ورزشوں میں محرک کا کام دیتی ہے۔ مگر یہ محرک دیرپا
نہیں ہے۔ جیسا کہ طرح طرح کے کھیل کود کا لطف دیرپا محرک ہے۔ مگر سب سے
بھاری اعتراض ابھی باقی ہے۔ عضلات کی جو ورزش جمناسٹک سے
حاصل ہوتی ہے۔ وہ باعتبار کمیت کے تو ادنیٰ درجہ کی ہے ہی۔ مگر باعتبار
کیفیت کے اور بھی ادنیٰ درجہ کی ہے۔ مصنوعی ورزش سے نسبتۃً لطف
حاصل نہیں ہوتا۔ اور اُس کے جلد چھوڑ دینے کا ایک سبب ہم نے
یہی بتایا ہے۔ یہی سبب اس بات کا بھی ہے کہ اِس ورزش کا اثر نظام
جسمانی پر ادنیٰ درجہ کا ہوتا ہے۔ یہ عام خیال کہ جب تک جسمانی فعل کی
مقدار یکساں ہے۔ اُس وقت تک اس امر کا مضائقہ نہیں کہ وہ فعل
فرحت بخش ہے یا نہیں کا سخت غلطی ہے۔ نفسانی جوش۔ جو طبیعت
کے موافق ہوتا ہے۔ نہایت طاقت بخش اثر رکھتا ہے۔ دیکھو ایک
کم زور آدمی پر کسی خوش خبری یا پرانے دوستوں کی ملاقات کا کیسا اثر پڑتا ہے
غور کرو کہ سمجھدار طبیب کمزور لطبعوں کو زندہ دلی کے جلسوں میں شامل
ہونے کی کیسی تاکید کرتے ہیں۔ یا دکرو کہ نظارہ کی تبدیلی سے جو حظ حاصل
ہوتا ہے وہ صحت کے لیے کیا مفید ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خوشی مقویات

ہیں سب سے بڑھ کر ہے[۱] ۔ چونکہ خوشی ۔ دوران خون کو تیز کرتی ہے ۔ اس لیے ہر فعل آسانی سے پورا ہوتا ہے ۔ اسی وجہ سے اگر صحت پہلے سے موجود ہو تو اس میں ترقی ہوجاتی ہے اور زایل ہوجائے تو بحال ہوجاتی ہے ۔ ان وجوہات سے کھیل کود کو جمناسٹک پر حقیقی فوقیت حاصل ہے ۔ بچوں کو اپنے کھیلوں سے نہایت دلچسپی حاصل ہوتی ہے اور وہ ایک نشاط انگیز خوشی کے ساتھ اپنے لڑکپنے کے کھیلوں کو جاری رکھتے ہیں ۔ یہ دونوں باتیں ایسی ہی ضروری ہیں جیسی کہ ورزش جو ان کھیلوں کے ساتھ ہوجاتی ہے ۔ اور چونکہ جمناسٹک میں یہ روحانی محرکات نہیں ہیں ۔ اس لئے اس کی بنیاد ضرور ناقص ہونی چاہیئے۔

کھیل کود کے ساتھ کسی قدر جمناسٹک بھی کیجائے تو وہ مفید ہوتی ہے گر جمناسٹک کھیل کود کا معاوضہ نہیں کرسکتی

پس اگر یہ امر تسلیم کیا جائے ۔ جیسا کہ ہم تسلیم کرتے ہیں ۔ کہ اعضاء کی مصنوعی ورزشیں (جمناسٹک) مطلق ورزش نہ کرنے سے بہتر ہیں ۔ اور نیز یہ امر کہ اگر ان کو اور ورزشوں کے ساتھ ساتھ بطور مزید امداد کے استعمال کریں ۔ تو وہ مفید ہوتی ہیں ۔ تو بھی ہم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ وہ ان ورزشوں کی جگہ ۔ جن کی محرک طبیعت ہے ۔ ہرگز کام نہیں دی سکتیں ۔ کھیل کود کے کام جن کی طرف فطرۃً رغبت ہوتی ہے جسمانی بہبودی کی غرض سے لڑکوں اور نیز لڑکیوں کے لیے نہایت ضروری ہیں ۔ جو شخص اس کو روکتا ہے ۔ وہ ان وسائل کو روکتا ہے جو جسمانی نشو و نما کے لیے خدا تعالیٰ نے مقرر کیے ہیں ۔

لڑکی تاتنتی کی قوت اور اس کا اٹھان تنزل پر ہے ۔

ابھی ایک مضمون باقی ہے ۔ جو شاید پچھلے مضامین میں سب سے زیادہ غور طلب ہے ۔ بہت سے اشخاص یہ کہتے ہیں کہ تعلیم یافتہ جماعتوں میں بالغ نوجوان اور وہ لڑکے جو قریب البلوغ ہیں ۔ نہ تو ان کا نمو ایسا عمدہ ہے ۔ جیسا کہ ان کے

---

[۱] اسی مضمون کا ایک فارسی شعر یہ ہے ؎

مترجم	آدمی فربہ شود از راہ گوش	جانور فربہ شود از نای و نوش

بزرگوں کا تھا - اور نہ وہ ایسے مضبوط ہی ہیں - جب ہم نے اول اول یہ بات سنی تھی
تو ہماری طبیعت کا میلان اس طرف تھا کہ اس قول کو اُن بہت سی حکایات کے ذیل
میں شامل کر دیں - جن میں حال کی قدر و منزلت گھٹا کر ماضی کی قدر و منزلت بڑھانے
کا قدیمی رجحان پایا جاتا ہے - قدیمی زرہوں کی پیمائش سے ثابت ہے کہ آج کل کے
آدمی قدیم زمانہ کے آدمیوں سے ڈیل ڈول میں بڑے ہیں - اور موت کے نقشوں
سے ظاہر ہے کہ مدت عمر میں کمی نہیں بلکہ زیادتی ہے - ان دونوں واقعات کو ذہن میں
رکھ کر ہم نے اس رائے پر (کہ ہمی تانیتی کی طاقت اور اُس کا اُٹھان رو بہ تنزل ہے) جو
ایک بے بنیاد اعتقاد معلوم ہوتا تھا - کچھ توجہ نہیں کی تھی - مگر جزئیات کے استقرا
نے ہماری رائے کو متزلزل کر دیا - مزدوری پیشہ جماعتوں کو اس مقابلہ سے خارج
کر کے - ہم نے زیادہ تر حالتیں ایسی دیکھی ہیں - جن میں بچے اپنے والدین کے
قد کو نہیں پہنچتے - اور عمر کے تفاوت کا واجبی لحاظ رکھنے کے بعد تن و توش
میں بھی ایسی ہی کمی دیکھی جاتی ہے - اطبا کہتے ہیں کہ لوگ - آج کل اس قدر فصد
لینے کی برداشت نہیں کر سکتے جس قدر کہ گزشتہ زمانہ میں کر سکتے تھے - قبل
از وقت سر کے بالوں کا اُڑ جانا آج کل بمقابلہ زمانہ سابق بہت زیادہ عام ہے
اور ہمی تانیتی میں تعجب انگیز کثرت کے ساتھ دانتوں کا زوال قبل از وقت دیکھنے میں
آتا ہے - عام قویٰ میں بھی بالکل ایسا ہی عجیب تفاوت نظر آتا ہے - چوں کہ گزشتہ
نسلوں کے آدمی مطلق العنان زندگی بسر کرتے تھے - اس لیے وہ موجودہ نسل کے
آدمیوں سے - جو سنجیدہ زندگی بسر کرتے ہیں - زیادہ محنت برداشت کر سکتے تھے - اگرچہ
ہمارے حال کے بزرگ خوب پیتے تھے - وقت کے پابند نہ تھے - تازی ہوا
کا کچھ لحاظ نہیں رکھتے تھے - اور صفائی کا بھی چنداں خیال نہیں کرتے تھے - تاہم
انتہا سے پیری تک بھی - بغیر کسی نقصان کے - عرصہ دراز تک محنت کر سکتے تھے

مثال کے طور پر ججوں اور قانون پیشہ لوگوں کی تواریخ پر غور کرو۔ مگر ہم۔ جو کہ اپنی جسمانی بہبودی کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اعتدال کے ساتھ کھاتے ہیں۔ اور حد سے زیادہ نہیں پیتے۔ مکانات میں ہوا کی آمد و رفت پر توجہ کرتے ہیں۔ کثرت نہاتے دھوتے ہیں۔ ہر سال سیر و تفریح کے لیے باہر نکل جاتے ہیں۔ اور علم طب سے زیادہ تر فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ہم لوگ کام کے نیچے برابر کچلے چلے جاتے ہیں۔ باوجودیکہ ہم قوانین صحت پر بڑی توجہ کرتے ہیں۔ ہم اپنے اجداد سے زیادہ کم زور معلوم ہوتے ہیں۔ جو اکثر اعتبارات سے قوانین صحت کے خلاف ورزی کرتے تھے۔ اور اگر ہم تا نتی کی شکل و شباہت اور اس کی متواتر بیماریوں سے اندازہ کیا جائے۔ تو اس امر کا احتمال ہے کہ وہ ہم سے بھی زیادہ کم زور ہوں گے۔

اس کے متعدد وسائل ہیں۔ مگر خاص سبب دماغی محنت کی کثرت ہے۔

اس کے کیا معنی ہیں؟ کیا یہ معنی ہیں کہ قدیم زمانہ میں۔ بچوں اور بڑوں دونوں کی پُرخوری۔ اس کم خوری سے جس کی طرف اب ہم نے عام طور پر توجہ کی ہے۔ کم تر مضر تھی؟ یا یہ معنی ہیں کہ ناکافی لباس جس کو اس دھوکا دینے والے "جفاکشی کے خیال" نے تقویت دی ہے۔ قابل الزام ہے؟ یا یہ کہ چھوٹی صفائی اور ستھرائی کی پیروی میں۔ طفلانہ کھیل کود کی تھوڑی بہت مزاحمت۔ اس کا باعث ہے؟ ہمارے دلائل سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ اس خرابی کے پیدا کرنے میں۔ ان سببوں میں سے ہر ایک سبب غالباً کچھ نہ کچھ حصہ رکھتا ہے[۵۱]۔ مگر ایک

[۵۱] ٹیکے کے ذریعہ سے جسمانی بیماری کی دبی ہوئی صورتوں کا پھیل جانا بھی غالباً اس خرابی کا ایک سبب ہے۔ علم تشخیص الامراض کے چند واقعات ہم کو یہ نتیجہ سمجھاتے ہیں کہ جب کسی بچہ کے ٹیکا لگایا جاتا ہے تو اس کے جسم سے ٹیکے کا زہریلا مواد۔ آبلوں کے ذریعہ۔ خارج ہو جاتا ہے اور ان ہی آبلوں کے ذریعہ۔ دیگر فاسد مواد بھی خارج ہونا چاہتا ہے۔ خصوصاً اس صورت میں کہ یہ فاسد مواد اس قسم کا ہو۔

اور سفر اثر بھی اپنا عمل کر رہا ہے۔ جو شاید سب سے زیادہ قوی ہے اس سے ہماری مراد دماغی محنت کی کثرت ہے۔

آج کل معاشرت کے دباؤ نے جوانوں اور بڈھوں کو روز افزوں کشاکش میں مبتلا کر رکھا ہے۔ تمام کاموں اور پیشوں میں سخت تر مقابلہ ہر ایک بالغ آدمی کی قوتوں پر بار ڈالتا ہے۔ اور اس سخت تر مقابلہ میں نوجوانوں کو اس لائق بنانے کے لیے کہ وہ اپنی حالت کو برقرار رکھیں۔ بہ نسبت زمانہ سابق کے زیادہ سخت تربیت کی جاتی ہے پس اُن کو دُہرا نقصان پہنچتا ہے۔ باپ۔ جن کے حریفوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ اپنے آپ کو خطرناک حالت میں پاتے ہیں۔ اور باوجودیکہ وہ اس مصیبت میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اُن کو اپنے اخراجات بڑھانے پڑتے ہیں۔ اس لیے ان کو تمام سال تک اور بہ سویر۔ مجبوراً کام کرنا پڑتا ہے۔ وہ ورزش کم کرتے ہیں۔ اور صرف چھوٹی چھوٹی چھٹیاں حاصل کرتے ہیں۔ اِس متواتر "محنت کی کثرت" سے اُن کے پنجر ہل جاتے ہیں۔ اور ایسا ہی پنجر اُن کی اولاد کو وراثت میں ملتا ہے۔ یہ نسبتاً کم زور بچے۔ جو معمولی محنت ہی سے مضمحل ہونے کو تیار رہیں۔ اب اُن سے یہ خواہش کی جاتی ہے کہ وہ ایسے نصاب پر عبور حاصل کریں۔ جو اُس نصاب سے بھی بہت زیادہ وسیع ہے۔ جو گزشتہ نسلوں کے قوی بچوں کے لیے تجویز کیا گیا تھا۔

آج کل باپ روٹی کمانے کے لیے سخت محنت کرنے پر مجبور ہیں جس سے ان کی صحت اور اُن کی اولاد کی صحت کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۷۔ جو معمولاً جلد سے خارج ہوتا رہتا ہے جیسے کہ بعض نہایت ہی خراب مادے جسم سے نکلتے رہتے ہیں۔

پس اگر کسی بچہ کے جسم میں اس قدر خفیف زہر ہو کہ مرض مرئی کی شکل میں ظاہر نہ ہو سکے۔ تو یہ بات ممکن بلکہ اغلب ہے کہ ٹیکے کے فاسد مادہ کی وساطت سے جو اُس کے جسم سے لیا گیا ہے وہی زہر دوسرے بچوں کے جسم میں اور ان سے اوروں کے جسم میں سرایت کر جائے مصنّف۔

کثرتِ مطالعہ کے مضر نتائج اور اُس کی مثالیں۔

جن آفت ناک نتائج کی توقع ہو سکتی تھی ۔ وہ ہر جگہ نظر آتے ہیں ۔ تم جہاں چاہو چلے جاؤ ۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ایسے بچے یا جوان ۔ مرد عورت دونوں تمہارے دیکھنے میں آئیں گے ۔ جن کو ناواجب مطالعہ سے تھوڑا بہت نقصان پہنچا ہے ۔ کہیں تو ایسا دیکھنے میں آئے گا کہ اُس کمزوری کی حالت سے بحال ہونے کے لیے ۔ جو کثرتِ مطالعہ سے پیدا ہوئی ہے ۔ سال بھر تک مضافات میں رہنا ضروری سمجھا گیا ہے ۔ کہیں تم یہ دیکھو گے کہ دماغ کا خون منجمد ہو جانے کا مرض تین کئی مہینے سے موجود ہے ۔ اور اندیشہ ہے کہ کہیں عرصہ تک قایم نہ رہے ۔ کبھی تم ایسے بخار کا حال سنو گے ۔ جو اُس زائد از اعتدال تحریک کا نتیجہ تھا ۔ جو کسی وجہ سے مدرسہ میں پیدا ہو گئی تھی ۔ اور کبھی ایسے نوجوان کی مثال دیکھنے میں آئے گی جسے ایک مرتبہ پہلے بھی مطالعہ ترک کرنا پڑا تھا ۔ اور اب جب سے اُس نے دوبارہ مطالعہ شروع کیا ہے اُس کا یہ حال ہے کہ اکثر غشی کی حالت میں اُس کو جماعت سے اُٹھا کر لاتے ہیں ۔ ہم واقعات بیان کر رہے ہیں ۔ ایسے واقعات جن کو تلاش نہیں کیا گیا ۔ بلکہ گزشتہ دو سال کے عرصہ میں خود بخود ہمارے مشاہدہ میں آئے ہیں اور وہ بھی نہایت محدود حلقہ میں ۔ اور یہ فہرست ابھی ختم ہرگز نہیں ہوئی ہے ۔ حال ہی کا ذکر ہے کہ ہم کو یہ دیکھنے کا موقع ملا تھا کہ ایسے امراض کس طرح موروثی بن جاتے ہیں ۔ یہ مثال ایک شریف زادی کی ہے ۔ جس کے والدین تنومند ہیں ۔ مگر ایک سکاچ بورڈنگ اسکول کے دستور العمل ہے ۔ جہاں اُس کو خوراک کم ملتی تھی ۔ اور کام زیادہ لیا جاتا تھا ۔ اُس کے جسمانی نظام کو اس قدر نقصان پہنچا ہے کہ صبح کو اُٹھتے وقت ہمیشہ اُس کے سر کو چکر آنے لگتے ہیں ۔ اور چونکہ یہ ضعفِ دماغ اُس کے بچوں کو وراثتہً پہنچا ہے ۔ اِس لیے کئی بچے ۔ بغیر درد سر ۔ یا دوران سر کے ۔ معمولی مطالعہ کی بھی برداشت نہیں کر سکتے ۔ آج کل ایک نوجوان خاتون ۔ ہر روز ہمارے پیش

نظر ہے جس کا جسمانی نظام کالج کے نصاب تعلیم کی بدولت - جس پر اس نے عبور حاصل کیا ہے - عمر بھر کے لیے خراب ہو گیا ہے اُس کے قویٰ پر اس قدر بار پڑا تھا کہ اُس میں ورزش کی طاقت باقی نہیں رہی تھی - اور اب کہ وہ فارغ التحصیل ہو چکی ہے - اُس کو ہمیشہ امراض کی شکایت رہتی ہے - قلیل اور نہایت غیر مستقل اشتہا - جو اکثر گوشت سے ابا کرتی ہے - دائمی برد اطراف - اُس وقت بھی جب کہ موسم گرم ہو - ضعف جو نہایت ہی آہستہ خرامی کے سوا چلنے پھرنے سے باز رکھتا ہے - اور وہ بھی تھوڑے ہی عرصہ تک - زینہ پر چڑھنے سے اختلاج قلب کا پیدا ہوتا - سخت پریشان خواب نظر آنے - یہ تمام خرابیاں اور نیز نمو کا رک جانا - اور رگ و پے کا ڈھیلا پڑ جانا - یہ سب باتیں اُن نتائج میں سے ہیں جو کثرت مطالعہ سے مترتب ہوتے ہیں - خاتون مذکور کی مثال کے ساتھ ہم اُس کی ایک سہیلی اور ساتھ کی پڑھتی ہوئی لڑکی کی مثال اضافہ کر سکتے ہیں - وہ بھی ایسی ہی کم زور ہے - اُس کو خاموش جلیسوں کی صحبت میں بھی غشی کی نوبت آجاتی ہے اور اُس کے معالج طبیب نے آخر کار اُس کو بالکل ترک مطالعہ پر مجبور کیا ہے -

خفیف اور غیر نمایاں نقصانات جو کثرت مطالعہ سے پہنچتے ہیں وہ مذکورہ بالا نقصانات سے بہت زیادہ ہیں -

جب کہ ایسے نمایاں نقصان اس قدر کثیر الوقوع ہیں تو خفیف اور غیر نمایاں نقصان کیا کچھ عام نہ ہوں گے! بمقابلہ ایک ایسی حالت کے جس میں قطعی بیماری روز افزوں اعتدال محنت کا نتیجہ ہو - غالباً کم سے کم چھ حالتیں ایسی ہوں گی - جن میں یہ خرابی غیر نمایاں اور آہستہ آہستہ جمع ہوتی ہے - یعنی ایسی حالتیں جن میں جسم کے افعال میں ابتری پیدا ہو جاتی ہے - جو کسی نہ کسی خاص سبب یا جسم کی نزاکت سے منسوب کی جاتی ہے - ایسی حالتیں جن میں جسمانی نمو مند ہو جاتا اور قبل از وقت رک جاتا ہے -

ایسی حالتیں جن میں طبیعت کا مخفی رجحان مرض دق کی طرف ہو کر مستقل ہو جاتا

ایسی حالتیں جن میں اول ہی اُس عام دماغی مرض کا میلان پایا جاتا ہے۔ جو جوانی کی محنت کا نتیجہ ہے۔ جو لوگ سخت محنت کرنے والے پیشہ وروں اور تاجروں کے کثیر الوقوع امراض پر توجہ کر کے اُن بدتر نتائج پر غور کریں گے جو نا واجب محنت سے بچوں کے غیر نشو و نما یافتہ جسم پر مترتب ہوتے ہیں۔ اُن سب پر یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ اس وجہ سے صحت عموماً کیونکر زائل ہو جاتی ہے۔ بچے بالغوں کے برابر نہ تو سختی کی برداشت کر سکتے ہیں۔ نہ جسمانی محنت کی اور نہ دماغی محنت کی۔ جب کہ بالغوں کو اُس زائد از اعتدال محنت " سے جو اُن سے لی جاتی ہے۔ صریحاً اتنی تکلیف پہنچتی ہے۔ تو پھر انصاف کرو کہ اُس عقلی محنت کی وجہ سے۔ جو بچوں کو بھی بسا اوقات بالغوں کے برابر کرنی پڑتی ہے۔ بچوں کو کس قدر سخت نقصان پہنچے گا!

انگلستان کے ایک معمولی مدرسہ نسواں کا حیرت انگیز دستور العمل اور اسکے مضر نتائج۔

حقیقت یہ ہے کہ جب ہم مدرسہ کی اُس بے رحمانہ تربیت کی جانچ پڑتال کریں جس پر اکثر زور دیا جاتا ہے۔ تو تعجب اس بات کا نہیں کہ وہ نہایت مضر ہے۔ بلکہ اس بات کا ہے کہ بچے اُس کی برداشت ہی کیوں کر کر سکتے ہیں۔ ہم ایک مثال لکھتے ہیں۔ جو سر جان فاربس نے اپنے ذاتی علم سے بیان کی ہے۔ اور بہت کچھ تحقیقات کے بعد۔ انہوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ مثال کُل انگلستان کے معمولی مدارس نسواں کے دستور العمل کا متوسط نمونہ ہے۔ وقت کی مفصل تقسیم کو چھوڑ کر۔ ہم چوبیس گھنٹوں کا خلاصہ درج کرتے ہیں۔

سونا - - - - - ۹ گھنٹے (چھوٹے بچے ۱۰ گھنٹے)

مدرسہ میں مطالعہ یا بتایا ہوا کام کرنا ۹ "

مدرسہ میں یا گھر پر۔ بڑی عمر کے بچے اپنی

مرضی کے موافق مطالعہ کریں - اور

چھوٹے بچے کھیلیں - - - - ۳½ گھنٹے

کھانا - - - - - - - ۱½ "

ورزش کھلی ہوا میں - باقاعدہ چہل قدمی

کی صورت میں - اکثر پڑھائی کی کتابیں

ہاتھ میں لے کر - اور وہ بھی صرف اس

وقت جب کہ وقت مقررہ پر مطلع صاف ہو ۱ گھنٹہ

۲۴

بھلا اس حیرت انگیز دستور العمل کے نتائج - جس کا یہ نام سرجان
فاربس نے رکھا ہے - کیا ہوتے ہیں؟ ضعف - زرد روئی - افسردہ
دلی - اور عام صحت کی خرابی - بلاشبہ اس کے نتائج ہیں - مگر صاحب
موصوف کچھ اور ہی بیان کرتے ہیں - نفس کی ترقی کا بدرجہ غایت خیال رکھنے کی
بدولت - جسمانی سود و بہبود کا مطلق لحاظ نہیں کیا جاتا - یعنی دماغی ورزش عرصہ دراز
تک کی جاتی ہے - اور ہاتھ پاؤں کی ورزش کم کی جاتی ہے - اس کا نتیجہ -
صاحب موصوف کی تحقیقات کے موافق - عادتاً صرف جسمانی افعال کی ابتری
بلکہ جسمانی ساخت کی بے قاعدگی بھی ہے - وہ کہتے ہیں کہ ہم نے حال ہی میں
ایک بڑے قصبہ میں - ایک بورڈنگ اسکول کا معائنہ کیا تھا -
جس میں چالیس لڑکیاں تھیں - اور غور و صحت کے ساتھ تحقیقات
کرنے پر ہم کو یہ بات معلوم ہوئی کہ ان لڑکیوں میں سے ایسی ایک بھی نہیں
ہے - جس کو مدرسہ میں دو سال ہو چکے ہوں -
(اور اکثر لڑکیوں کو اسی قدر عرصہ ہو گیا تھا) اور اس کی کمر تھوڑی

بہت نہ جھک گئی ہو۔[۵]

ممکن ہے کہ ۱۸۳۳ء سے۔ جبکہ سر جان فاربس نے یہ واقعہ تحریر کیا تھا۔ اس وقت تک کچھ ترقی ہو گئی ہو۔ ہم کو امید ہے کہ ترقی ہوئی ہے۔ مگر یہ بات کہ طریقہ مذکور کا اب تک عام رواج ہے۔ نہیں بلکہ بعض حالتوں میں۔ بہ نسبت سابق کے اس کو پہلے سے بھی زیادہ حد درجہ تک پہنچا دیا گیا ہے۔ ہم بذات خود اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ ہم حال میں ایک ٹریننگ کالج (مدرسہ تعلیم المعلمین) دیکھنے گئے تھے۔ جو نوجوان مردوں کے لیے بنایا گیا ہے۔ یہ ان کالجوں میں سے ہے جو مدارس میں عمدہ تربیت یافتہ معلم بہم پہنچانے کی غرض سے حال ہی میں قائم کیے گئے ہیں۔ اس کالج میں جہاں کہ خانگی مدارس کی معلمات کی راے سے کسی قدر بہتر توقع ہونی چاہیئے تھی۔ سرکاری نگرانی میں ہیں۔ ہم نے روزانہ دستور العمل حسب ذیل دیکھا ہے:۔

ایک ٹریننگ کالج کا اس سے بھی بدتر دستور العمل جس کو مصنف نے بچشم خود دیکھا ہے۔

۶ بجے طالب علموں کو جگایا جاتا ہے۔

۷ سے ۸ تک مطالعہ۔

۸ سے ۹ تک کتاب مقدس کا پڑھنا۔ نماز۔ اور ناشتہ۔

۹ سے ۱۲ تک مطالعہ۔

۱۲ سے ½۱۲ تک فرصت۔ جو چلنے پھرنے یا کسی اور ورزش کے لیے برائے نام مخصوص ہے۔ مگر اکثر مطالعہ میں صرف ہوتی ہے۔

½۱۲ سے ۱ تک کھانا۔ کھانے میں عموماً ۲۰ منٹ لگتے ہیں۔

۲ سے ۵ تک مطالعہ۔

---

[۵] دیکھو کتاب "طب عملی کی قاموس" جلد اول۔ صفحات ۶۹۷-۶۹۸۔
(Cyclopaedia of Practical Medicine Vol. I. PP. 697-698.)

۵ سے ۶ تک چائے اور تفریح۔

۶ سے ۸½ تک مطالعہ۔

۸½ سے ۹½ تک اگلے دن کے سبق تیار کرنے کے لیے بطور خود مطالعہ کرنا۔

۱۰ بجے سونا۔

پس چوبیس گھنٹوں میں سے آٹھ گھنٹے سونے کے لیے مخصوص کیے گئے ہیں سوا چار گھنٹے کپڑے پہننے۔ نماز۔ اور کھانے میں صرف ہوتے ہیں۔ اور آرام کے مختصر وقفے اسی کے ساتھ شامل ہیں۔ ساڑھے دس گھنٹے مطالعہ کے لیے دیئے گئے ہیں، اور سوا گھنٹہ ورزش کے لیے جو اختیاری ہے اور اکثر نہیں کی جاتی۔ مگر جو وقت ورزش کے لیے مقرر ہے۔ اُس کو کتابوں کے لیے مخصوص کر کے۔ نہ صرف مقررہ مطالعہ کے ساڑھے دس گھنٹوں کو بڑھا کر اکثر ساڑھے گیارہ کر دیا جاتا ہے۔ بلکہ بعض طالب علم اپنے سبق تیار کرنے کے لیے صبح کے چار بجے اُٹھتے ہیں۔ اور معلم اُن کو ایسا کرنے کی سچ مچ ترغیب دیتے ہیں! وقت معین میں جس قدر نصاب پر عبور حاصل کرنا پڑتا ہے وہ اِس قدر وسیع ہے۔ اور معلم۔ جن کی نیک نامی کی بازی اپنے شاگردوں کو اچھی طرح امتحان پاس کرانے پر لگی ہوئی ہوتی ہے۔ اُن پر اس قدر زور ڈالتے ہیں کہ اُن کو عقلی محنت میں عموماً بارہ تیرہ گھنٹے روز صرف کرنے کی ترغیب ہوتی ہے!

کالج مذکور کے طلبہ کی صحت نہایت خراب رہتی ہے۔

اِس بات کے سمجھنے کے لیے کسی پیغمبر کی ضرورت نہیں ہے کہ اس محنت سے جو نقصان پہنچتا ہے۔ وہ بالضرور سخت ہوگا۔ جیسا کہ اس کالج کے ایک شخص نے ہم سے بیان کیا تھا۔ کہ جن لوگوں کا رنگ کالج میں داخل ہونے کے وقت سرخ و سفید ہوتا ہے تھوڑے ہی عرصہ میں اُن کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے۔ وہ اکثر مریض رہتے ہیں۔ بعض طالب علموں کا نام ہمیشہ بیماروں کی فہرست میں درج رہتا ہے۔ زوال اشتہا اور

سوء ہضمی نہایت عام ہیں۔

مرض اسہال کا غلبہ رہتا ہے۔ عموماً کل تعداد طلبہ کا ایک تہائی حصہ ایک ہی وقت میں اس بیماری میں مبتلا رہتا ہے۔ درد سر کی عام شکایت ہے۔ اور بعض طلبہ قریباً قریب ہر روز۔ مہینوں تک اس میں مبتلا رہتے ہیں۔ اور ایک خاص فی صدی تعداد طلبہ ایسی ہے جو بالکل مضمحل ہو کر کالج کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔

کسی ٹریننگ کالج کا ایسا دستور العمل ہونا تعلیم یافتہ جماعت کی جہالت کا ثبوت ہے۔

یہ امر وحشت انگیز ہے کہ جو درس گاہ ایک قسم کا نمونہ ہے۔ جس کو زمانہ حال کے روشن خیال لوگوں کی جماعت نے قایم کیا ہے۔ اور جو اُن کی نگرانی میں ہے۔ اُس کا دستور العمل اس قسم کا ہو! سخت امتحانات کی وجہ سے۔ جس کے ساتھ یہ خرابی بھی لگی ہوئی ہے کہ تیاری کے لیے تھوڑی مدت مقررہ کی جاتی ہے۔ طالب علموں کو مجبوراً ایسے طریقہ کی طرف رجوع کرنی پڑتی ہے۔ کہ جو لوگ اُس کو اختیار کریں۔ اُن کی صحت یقیناً زائل ہو جاتی ہے۔ یہ بات بے رحمی کا ثبوت نہ سہی۔ افسوس ناک جہالت کا ثبوت تو ہے۔

بے شک یہ مثال زیادہ تر ایک مستثنیٰ صورت[۵] ہے۔ اور اسی قسم کی دوسری

---

[۵] مصنف نے اپنے وطن کی عام تعلیمی حالت کو مدنظر رکھ کر اس قسم کے مدرسوں کو ایک مستثنیٰ صورت قرار دیا ہے اور جب یہ کتاب لکھی گئی تھی۔ اُس وقت سے اب تک وہاں مدارس کی حالت میں بہت کچھ ترقی ہو گئی ہے۔ لیکن اگر ہم ہندوستان کے مدارس کی موجودہ حالت پر غور کریں تو بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ شاید کوئی مدرسہ ایسا نہ ہوگا کہ جس میں متوسط درجہ کے طلبہ کو بارہ تیرہ گھنٹے روز سے کم محنت کرنی پڑتی ہو۔ ہندوستان کے مدارس کا نصاب تعلیم اس قدر سخت اور بے قاعدہ ہے کہ طلبہ کو امتحان پاس کرنے کے لیے نہایت سخت محنت کرنی پڑتی ہے۔ اُن کے جسمانی نظام پر نہایت مضر اثر پڑتا ہے۔ یہ بیان میرے ذاتی تجربہ پر مبنی ہے جو علمی اور متعلمی کی حیثیت سے مجھ کو حاصل ہوا ہے۔ ملک کے روشن خیال آدمیوں کو اس کا انتظام ضرور کرنا چاہیے۔ اور نصاب تعلیم کو معقول بنانے کے لیے بدلائل معقول گورنمنٹ سے درخواست کرنی چاہیے۔ مترجم

درس گاہوں میں شاید کہیں اس کی نظیر مل سکے۔ مگر ایسی سخت مثالوں کا وجود ہی بہت کچھ اس بات کا ثبوت ہے کہ ننھی ننھی جانوں کے نفسوں پر حد سے زیادہ بوجھ ڈالا گیا ہے بچوں کو ایسے ٹریننگ کالجوں کی ضرورت۔ تعلیم یافتہ جماعتوں کے خیالات کو ظاہر کرتی ہے۔ اس لیے کسی دوسری شہادت کی عدم موجودگی میں بھی۔ یہ ضرورت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ اُن کا رجحان زیادہ تر۔ تربیت کے ایسے دستورالعمل کی طرف ہے جو طلبہ پر زیادہ نا واجب بار ڈالتا ہے۔

زائد از اعتدال تعلیم بچپن اور جوانی دونوں میں یکساں مضر ہے۔

یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ لوگوں کو جوانی کی "زائد از اعتدال" تعلیم کے خطروں سے اِس قدر کم واقفیت ہو۔ جب کہ بچپن کی "زائد از اعتدال" تعلیم کے خطروں سے اس قدر عام واقفیت ہے۔ شیرخوار بچوں کے "قبل از وقت نشوونما" سے جو خراب نتیجے پیدا ہوتے ہیں۔ اُن سے اکثر والدین کسی قدر واقف ہیں۔ ہم ہر ایک قوم میں یہ بات دیکھ سکتے ہیں کہ ایسے لوگوں کو زجر و ملامت کی جاتی ہے جو اپنے چھوٹے بچوں کے نفسوں میں قبل از وقت تحریک پیدا کر دیتے ہیں۔ اور اس بچپن کی تحریک کا خطرہ اُسی قدر زیادہ ہوتا ہے جس قدر کہ اُس کے نتائج سے کافی واقفیت ہوتی ہے۔ اُس رائے پر غور کرو جو علم الاعضاء کے ایک ممتاز پروفیسر نے کنایتہً ظاہر کی ہے۔ جس نے ہم سے کہا تھا کہ "میں اپنے چھوٹے بچے کو کسی قسم کے سبق پڑھانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ جب تک کہ اُس کی عمر آٹھ سال کی نہ ہو جائے" جب کہ سب لوگ اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ بچپن میں عقل کو زبردستی ترقی دینے سے۔ یا تو جسمانی کمزوری لاحق ہوتی ہے۔ یا آخر کار حمق پیدا ہو جاتا ہے۔ یا قبل از وقت موت آجاتی ہے۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ یہی حقیقت تمام جوانی میں بھی صادق آتی ہے۔ مگر یقیناً ایسا ہی ہوتا ہے۔ قوی کا نشوونما ایک خاص ترتیب

اور ایک خاص رفتار کے موافق ہوتا ہے - اگر تعلیم کا نصاب اُسی ترتیب اور اُسی رفتار کے مطابق ہو - تو بہتر - اور اگر یہ بات نہ ہو - یعنی اگر علم کو ایسی ترتیب سے سکھایا جائے جو بہ نسبت اُس ترتیب کے جو سریع الفہم ہے - زیادہ پیچیدہ اور زیادہ عقلی ہو - جس سے بچپن ہی میں اعلیٰ درجہ کے قویٰ پر زیادہ بار پڑ جائے - یا اگر "زاید از اعتدال تربیت" کی وجہ سے عقل عموماً اُس درجہ سے زیادہ ترقی کر جائے جس درجہ تک کہ اُس عمر میں قدرتی طور پر اُس کی ترقی ہو سکتی ہے - تو اس بات سے جو خلاف ضابطہ فائدہ حاصل ہوگا - اُس کے ساتھ اُسی قدر - یا اُس سے زیادہ نقصان یقیناً پیش آئے گا -

اس امر کی تشریح کہ قدرت ایک سخت محاسب ہے

اس کا سبب یہ ہے کہ قدرت ایک سخت محاسب ہے - اور جس قدر خرچ کرنے کے لیے وہ آمادہ ہے - اگر تم کسی مد میں اس سے زیادہ رقم کا مطالبہ کرو - تو وہ کسی دوسری مد سے کاٹ کر حساب برابر کر دیتی ہے - اگر تم قدرت کو اُسی کے رستہ پر چلنے دو - اور اس بات کی احتیاط رکھو کہ جسمانی اور عقلی نمو کے لیے جس قدر اور جس قسم کا خام مصالح ہر ایک عمر میں درکار ہو - وہ ٹھیک ٹھیک بہم پہنچا دیا جائے - تو وہ آخر کار ایک ایسا فرد پیدا کرے گی - جس کے نشو و نما میں کم و بیش باقاعدگی پائی جائے گی - لیکن - اگر تم کسی ایک حصہ کے قبل از وقت یا ناواجب نمو پر زور دو - تو وہ کم و بیش اعتراض کے ساتھ اس بات کو قبول تو کر لیتی ہے مگر اس زائد کام کے پورا کرنے کے لیے - یہ ضرور ہے کہ وہ اپنا زیادہ تر ضروری کام ناتمام چھوڑ دے - یہ بات کبھی بھولنی نہیں چاہیے کہ نشو و نما کی قوت - جو جسم میں کسی وقت موجود ہوتی ہے محدود ہے - اور چوں کہ وہ قوت محدود ہے - اس لیے یہ بات ناممکن ہے کہ اُس سے ایک مقررہ مقدار سے زیادہ نتائج حاصل ہو سکیں - بچوں یا جوانوں کی اس قوت نمو پر سخت اور مختلف قسم کے مطالبے ہیں - جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں - روزانہ جسمانی ورزش سے جو نقصان ہوتا ہے اُس کی تلافی کرنی پڑتی ہے

روزانہ مطالعہ سے جو دماغ فرسودہ ہوتا رہتا ہے۔ اُس کا تدارک کرنا
پڑتا ہے۔ جسم کے کسی قدر زائد نمو اور نیز دماغ کے کسی قدر زائد نمو کے
لیے سامان بہم پہنچانا پڑتا ہے اور جس قدر قوت خوراک کی اُس کثیر مقدار کے ہضم
کرنے میں صرف ہوتی ہے۔ جو اِن بہت سے مطالبوں کے پورا کرنے کے لیے مطلوب
ہے۔ اُس قوت کو بھی اِس پر اضافہ کرنا چاہیئے۔ اگر زائد قوت کا رُخ اِن رستوں میں سے
کسی رستہ کی طرف موڑ دیا جائے۔ تو اُس کا رُخ دوسرے رستوں کی طرف سے
ہٹ جاتا ہے" یہ بات ہر شخص کے تجربہ سے۔ برہان لِمّی کے ذریعہ سے ظاہر
اور برہان اِنّی کے ذریعہ سے ثابت ہے۔ مثلاً ہر شخص جانتا ہے کہ زیادہ کھانے
کے ہضم کرنے میں جسم پر اس قدر بار پڑتا ہے کہ نفس اور جسم میں کسل پیدا ہو جاتا
ہے اور اُس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر نیند آتی ہے۔ ہر شخص یہ بھی جانتا ہے کہ اعتدال
سے زیادہ جسمانی ورزش غور و فکر کی قوت کو گھٹاتی ہے۔ مثلاً عارضی افسردگی۔
جو یک لخت محنت کرنے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ یا تیس[۳۰] میل پیدل چلنے سے
جو تکان ہوتی ہے۔ اُس کی وجہ سے عقلی محنت سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے
ایک مہینے تک پیدل سفر کرنے سے عقلی سستی اس قدر ہوتی ہے کہ اُس کو
رفع کرنے کے لیے کئی دن لگتے ہیں۔ اور جو کسان جسمانی محنت میں اپنی عمر میں
صرف کرتے ہیں۔ اُن میں نفس کی مستعدی بہت کم ہوتی ہے۔ پھر اس حقیقت سے
بھی سب لوگ واقف ہیں کہ اُس نمو کے دوران میں جو کبھی کبھی بچپن میں تیزی کے
ساتھ واقع ہوتا ہے۔ قوت کا بڑا حصہ کھچ کر صرف ہو جاتا ہے۔ اور یہ بات جسمانی
اور عقلی افسردگی سے۔ جو اُس کو لازم ہے۔ ثابت ہوتی ہے۔ اِس کے علاوہ یہ
واقعات کہ دو گنا کھانے کے بعد جو سخت جسمانی تکان ہوتی ہے۔ اُس سے ہاضمہ
رُک جاتا ہے" اور جن بچوں سے ابتدا میں سخت محنت لی جاتی ہے۔ اُن کے

نمو میں فتور واقع ہو جاتا ہے"۔ یہ واقعات بھی اسی اختلاف کو ظاہر کرتے ہیں۔ یعنی یہ واقعات بھی اسی طرح اس بات پر دلالت کرتے ہیں۔ کہ اگر کسی ایک کام میں اعتدال سے زیادہ مستعدی ظاہر کی جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ دوسرے کاموں میں مستعدی کی کمی ہو جاتی ہے۔ پس یہی قانون جو سخت حالتوں میں اس طرح صاف صاف نظر آتا ہے۔ تمام حالتوں میں صادق آتا ہے۔ جب یہ ناواجب مطالبے (یعنی قویٰ سے زائد از اعتدال کام لینا) خفیف اور دائمی ہوتے ہیں۔ اُس وقت بھی قوت کا خرچ ہو جانا یقیناً ایسا ہی مضر ہوتا ہے۔ جیساکہ اُس وقت۔ جب کہ وہ مطالبے سخت اور ناگہانی ہوتے ہیں اسی لیے اگر بچپن میں دماغی محنت کا خرچ۔ قدرت کی مقررہ مقدار سے بڑھ جائے تو جس قدر خرچ دوسرے کاموں میں ہونا چاہیئے تھا۔ وہ واجبی انداز سے گھٹ جاتا ہے۔ اور کسی نہ کسی قسم کی خرابیاں یقیناً عاید ہوتی ہیں۔ آؤ ان خرابیوں پر اختصار کے ساتھ بحث کریں۔

اگر دماغی محنت حد اعتدال سے کسی قدر زیادہ ہو تو اُس کا اثر جسم پر کیا ہوگا

فرض کرو کہ وہ زائد از اعتدال دماغی محنت" باضابطہ محنت سے ذرا ہی زیادہ ہو۔ تو سوائے اس کے کہ جسمانی نشو و نما میں کچھ خفیف سا خلل واقع ہو۔ کچھ زیادہ نقصان نہ ہوگا۔ یعنی یا تو قد اُس اندازہ سے کسی قدر کم رہ جائے گا۔ جہاں تک کہ وہ بصورت دیگر پہنچ سکتا تھا۔ یا جثہ جس قدر کہ ہونا چاہیئے تھا۔ اُس سے کم رہ جائے گا۔ اور یا جسم کا مادہ باعتبار اپنی کیفیت کے ایسا عمدہ نہ ہوگا۔ ان میں سے ایک یا زیادہ نتیجے یقیناً پیش آئیں گے۔ دماغی محنت کے دوران۔ اور اُس زمانہ مابعد میں جب کہ دماغی مادہ کی تلافی کی جاتی ہے۔ خون کی جو زائد مقدار دماغ کے لیے مہیا کی جاتی ہے یہ وہی خون تو ہے جو بصورت دیگر اعضاء اور امعاء میں گردش کرتا۔ اور اُس نمو یا بدل یا متحلل میں۔ جس کے لیے وہ خون۔ مواد بہم پہنچاتا۔ خلل واقع ہوتا ہے۔

جب کہ یہ جسمانی نقصان یقینی ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ آیا وہ نفع جو زائد تربیت کا نتیجہ ہے۔ نقصان کے مساوی ہے یا نہیں؟ جسمانی نمو یا جسمانی ساخت جس سے طاقت اور استقلال پیدا ہوتا ہے۔ آیا اس نمو کے نقصان اور اس ساخت کے ناکمل رہ جانے کا معاوضہ اس زائد علم سے جو حاصل ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے یا نہیں؟

اگر دماغی محنت حد اعتدال سے بہت زیادہ ہو۔ تو اس کا اثر جسم پر کیا ہوتا ہے؟

جب دماغی محنت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ تو اور بھی زیادہ سخت نتیجے پیدا ہوتے ہیں۔ جو نہ صرف جسمانی تکمیل۔ بلکہ خود دماغ کی تکمیل پر بھی مضر اثر ڈالتے ہیں۔ علم الاعضاء کا ایک قانون۔ جو اول اول مسٹر ایسیڈ ورسینٹ ہلیر[۱] نے بنایا تھا۔ اور جس پر مسٹر لیوئس نے اپنے ایک مضمون میں جس کا عنوان ہے "پست قد اور دراز قد" توجہ مبذول کی تھی۔ یہ ہے کہ گروتھ (نمو) اور ڈیولپ مینٹ (نشوونما) میں تضاد ہے۔ لفظ نمو سے جیسا کہ وہ اس متضاد معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ جثہ کی زیادتی سمجھی جاتی ہے۔ اور نشوونما سے بناوٹ کی زیادتی۔ اور قاعدہ یہ ہے کہ ان دونوں عملوں میں سے کسی ایک کا عمل کا بہت زیادہ بڑھ جانا دوسرے عمل کے رک جانے یا بند ہو جانے پر دلالت کرتا ہے۔ اس بات کی ایک عام مثال کیٹر پلر اور کرسلس[۲]

---

[۱] مسٹر ایسیڈ ورسینٹ ہلیر۔ انیسویں صدی کا ایک مشہور فرانسیسی عالم اور مدبر سلطنت ہے مترجم۔

[۲] کیٹر پلر۔ ریشم کے کیڑے کی اس حالت کو کہتے ہیں جب کہ وہ انڈے سے نکل کر شکل کرم ہوتا ہے۔ اس حالت میں چھ سات ہفتہ تک رہتا ہے۔ کھاتا بہت ہے اور جلدی جلدی بڑھتا ہے انڈے سے نکل کر صرف پاؤ انچ لمبا ہوتا ہے۔ مگر آخر میں تین انچ لمبا ہو جاتا ہے۔ اب کھانا چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے جبڑے کے نیچے دو نلیاں ہوتی ہیں۔ ان میں سے ریشم کے تار نکال نکال کر اپنے اوپر کویا بنا لیتا ہے۔ اس کے بعد مردہ سا ہو جاتا ہے۔ پوست چکنا اور رنگ سنہری سا ہو جاتا ہے اس حالت کو انگریزی میں کرسلس (سنہری) کہتے ہیں۔ تین ہفتے اس طرح کویے کے اندر مردہ سا رہتا ہے۔ اور پھر اندر ہی اندر پروانہ بن کر کویے کو چیر کر نکل جاتا ہے مترجم۔

کی مختلف حالتوں سے ملتی ہے۔ کیٹرپلر کا جثہ بہت ہی جلد بڑھتا ہے۔ مگر جب وہ
پورے قد کا ہو جاتا ہے۔ اُس وقت بھی اوس کی بناوٹ۔ بہ نسبت اس حالت
کے جب کہ وہ چھوٹا تھا۔ شاید ہی کچھ زیادہ پیچیدہ ہوتی ہو۔
کرِسالس کا جثہ نہیں بڑھتا۔ برعکس اس کے۔ زندگی کی اس حالت مین اُس کا وزن
گھٹ جاتا ہے۔ مگر زیادہ تر پیچیدہ بناوٹ کی تکمیل بڑی سرعت کے ساتھ جاری
رہتی ہے۔ یہ اختلاف جو یہان ایسا صاف نظر آتا ہے۔ اعلیٰ درجہ کے جانوروں میں
اِس کا سُراغ کم ملتا ہے۔ کیوں کہ اُن میں یہ دونوں عمل ساتھ ساتھ جاری رہتے ہیں۔
مگر یہ تفاوت ہماری نوع میں۔ جب کہ مردوں اور عورتوں کا باہم مقابلہ کریں۔ خاصی اچھی
طرح نظر آتا ہے۔ لڑکی کا جسم اور نفس جلدی جلدی نشوونما پاتے ہیں۔ اور اُن کا نمو
نسبتہً جلد رُک جاتا ہے۔ لڑکے کا جسمانی اور عقلی نشوونما زیادہ آہستہ آہستہ ہوتا ہے
اور اُس کا نمو بھی زیادہ ہوتا ہے۔ جس عمر میں لڑکی بالغ ہو جاتی ہے۔ اُس کی جسمانی ساخت
مکمل ہو جاتی ہے۔ اور اُس کے تمام قویٰ اپنا عمل پوری طرح کرنے لگتے ہیں۔ اُس
عمر میں لڑکے کی جسمانی ساخت نسبتہً نامکمل ہوتی ہے۔ کیوں کہ اُس کے قوائے نامیہ
جثہ کی زیادتی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اور یہ بات مقابلتہً لڑکے کے ادھڑپن سے
ظاہر ہے۔ پس یہ قانون جسمانی ساخت کے ہر ایک جداگانہ حصہ پر اور نیز بحیثیت
مجموعی صادق آتا ہے۔ جب کسی عضو کی بناوٹ میں خلاف قاعدہ
جلد ترقی ہو جاتی ہے۔ تو یہ امر اُس کے نمو کے قبل از وقت رُک
جانے پر دلالت کرتا ہے۔ اور یہ بات نفس کے ساتھ اسی طرح
پیش آتی ہے۔ جس طرح کہ کسی دوسرے عضو کے ساتھ۔ دماغ
ابتدائی عمر میں جثہ کے لحاظ سے نسبتہً بڑا۔ مگر ساخت کے لحاظ سے نامکمل ہوتا ہے
اور اگر ناواجب مستعدی کے ساتھ دماغ سے کام لیا جائے۔ تو جس قدر ترقی اُس

عمر کے مناسب حال ہونی چاہیئے۔ اُس سے زیادہ ترقی تو ہو جاتی ہے۔ مگر آخری نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ جس درجہ تک اس کا قد اور طاقت۔ بصورت دیگر۔ پہنچ سکتے تھے اُس میں کمی واقع ہو جاتی ہے "قبل از وقت نمو پانے والے" بچے اور جوان۔ جو ایک خاص عرصہ تک تمام مشکلات پر غالب آتے تھے۔ اُن کی ترقی بسا اوقات دیکایک رک جانے۔ اور اُن کے والدین کی بڑی بڑی امیدوں کے خاک میں مل جانے کی ایک وجہ بلکہ خاص وجہ یہی ہے۔

سخت دماغی محنت کا اثر صحت پر کیا ہوتا ہے

مگر "زیادہ از اعتدال تعلیم" کے یہ نتائج جو اوپر بیان ہوئے ہیں۔ گو آفت ناک ہیں تاہم بمقابلہ اُن نتائج کے۔ جو صحت پر مترتب ہوتے ہیں۔ مثلاً جسمانی نظام کا زوال۔ ضعف قوٰی۔ خیالات فاسدہ۔ شاید کم آفت ناک ہوں۔ علم الاعضا کی حال کی تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ دماغ کا اثر جسمانی افعال پر کس قدر زیادہ ہوتا ہے۔ دماغی تحریک سے ہضم۔ اور دوران خون۔ اور ان کی بدولت تمام اعضاء کے افعال پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ ویگس ایک عصب ہے جو دماغ کو امعاء سے ملاتا ہے جس شخص نے ہماری طرح اُس تجربہ کو بار بار دیکھا ہے جو اول اول ویبر نے کیا تھا جس سے اِس عصب کی خراش کا نتیجہ ظاہر ہوتا ہے یعنی جس شخص نے یہ دیکھا ہے کہ قلب کا فعل اِس عصب کو خراش پہنچانے سے یکایک بند ہو جاتا ہے۔ اور جب یہ خراش جاتی رہتی ہے۔ تو وہ فعل آہستہ آہستہ دوبارہ شروع ہو جاتا ہے۔ اور اُس کے از سر نو شروع ہوتے ہی۔ قلب کا فعل پھر رُک جاتا ہے۔ وہ صاف صاف یہ بات سمجھے گا کہ دماغ سے بہت زیادہ کام لینا جسم پر کیا کچھ افسردگی پیدا کرنے والا اثر ڈالتا ہے۔ یہ نتائج جن کی تشریح اس طرح علم الاعضا سے کی گئی ہے۔ اُن کی مثال درحقیقت معمولی تجربہ میں ملتی ہے۔ کوئی ایسا شخص نہ ہوگا جس نے اُس اختلاج قلب کو محسوس نہ

کیا ہو۔ جو اُمید۔ خوف غصہ اور خوشی کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ کوئی ایسا شخص نہ ہوگا
جس نے یہ مشاہدہ نہ کیا ہو کہ جب یہ جذبات شدید ہوتے ہیں۔ تو قلب کے فعل میں
کیسے زحمت کے آثار نظر آتے ہیں۔ اگرچہ بہت سے آدمی ایسے ہیں۔ جنہوں نے
کبھی ایسے سخت جذبہ کی تکلیف نہیں اُٹھائی جس سے قلب کا فعل رُک جاتا ہے
اور غش آجاتا ہے۔ تاہم ہر شخص جانتا ہے کہ یہ دونوں باتیں بطور علت و معلول کے
ہیں۔ یہ بھی ایک مشہور بات ہے کہ معدہ کا خلل اُس نفسانی تحریک کا نتیجہ ہوتا ہے
جس کی شدت ایک خاص حد سے تجاوز کر جاتی ہے۔ زوال اشتہا نفس کی
نہایت فرحت بخش اور نیز نہایت درد انگیز حالتوں کا یکساں نتیجہ ہے۔ جب کھانا کھانے
کے تھوڑے عرصہ بعد کوئی ایسا واقعہ جس سے نفس کو راحت یا رنج پہنچے پیش
آجائے۔ تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یا تو معدہ کھائی ہوئی غذا کو رد کر دیتا ہے۔ یا بڑی دقت
اور ایا کے ساتھ اُس کو ہضم کرتا ہے۔ اور جب خالص عقلی عمل حد اعتدال سے بڑھ
جاتا ہے۔ تو اُس سے بھی ایسے ہی نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ اور ہر شخص جو اپنے
دماغ پر زیادہ بار ڈالتا ہے۔ اِس امر کی تصدیق کر سکتا ہے۔ پس دماغ اور جسم کا
تعلق۔ جو ان سخت حالتوں میں صاف صاف نظر آتا ہے معمولی اور کم نمایاں حالتوں
میں بھی بالکل اسی طرح قایم رہتا ہے۔ جس طرح کہ یہ سخت مگر عارضی دماغی تحریک۔ اسعار
میں سخت مگر عارضی خلل پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح خفیف مگر دیرپا دماغی تحریک اسعار میں
خفیف مگر دیرپا خلل پیدا کرتی ہے۔ یہ نرا نتیجہ ہی نہیں ہے۔ یہ تو ایک واقعی بات ہے
جس کی تصدیق ہر ایک طبیب کر سکتا ہے۔ اور جس کا افسوس ناک تجربہ ہم نے ایک
عرصہ تک کیا ہے۔ اور ہم بذات خود اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ جسمانی ابتری کی
مختلف صورتیں اور مختلف مدارج ایسے ہوتے ہیں۔ جن کی جزوی اصلاح کے
لیئے مجبوراً برسوں تک کام چھوڑ کر آرام لینا پڑتا ہے۔ اور یہ بات دماغ سے عرصہ دراز

تک زیادہ کام لینے کا نتیجہ ہے - بعض اوقات قلب پر بالخصوص اثر پڑتا ہے - مثلاً دائمی اختلاج قلب - اور نبض کا زیادہ ضعیف ہوجانا - اور نبض کی ضربوں کی تعداد میں بالعموم کمی ہوجانا مثلاً بہتر فی منٹ سے گھٹ کر ساٹھ تک آجانا - یا اس سے بھی کم - بعض اوقات معدہ میں نمایاں ابتری نظر آتی ہے - مثلاً سوء ہضمی جس سے زندگی وبال ہوجاتی ہے - اور جس کا علاج سوائے وقت کے اور کچھ نہیں ہے - بہت سی حالتوں میں قلب اور معدہ دونوں مبتلا ہوجاتے ہیں - بسا اوقات نیند کم آتی ہے اور کبھی نیند میں آنکھ کھل جاتی ہے - اور تھوڑی بہت عقلی افسردگی عموماً ہوتی ہے -

اب غور کرو کہ وہ نقصان کیا کچھ سخت نہ ہوگا - جو ناواجب نفسانی تحریک سے بچوں اور جوانوں کو پیش آتا ہے - واجبی مقدار سے بڑھ کر دماغ سے کام لینے کا نتیجہ یہ ہے کہ جسمانی نظام میں ضرور کم و بیش فتور واقع ہوتا ہے - اور اگر بالفرض اس قدر زیادہ فتور نہ بھی واقع ہو - جس سے یقینی بیماری پیدا ہو - تو بھی یہ نتیجہ تو یقیناً پیدا ہوگا کہ ان نقصانات کے آہستہ آہستہ جمع ہونے سے جسمانی انحطاط پیدا ہوتا ہے - قلیل اور نازک اشتہا - ناقص ہاضمہ اور ضعف دوران خون کے ساتھ نشو و نما پانے والا جسم کیوں کر پنپ سکتا ہے؟ نشو و نما کے ہر عمل کا پورا ہونا - عمدہ خون کے کافی ذخیرہ پر منحصر ہے - عمدہ خون کی کافی مقدار کے بغیر غدود مناسب طور پر خون سے پیدا نہیں ہوسکتا - امعاء اپنا فرض پوری طرح ادا نہیں کرسکتیں - عمدہ خون کی کافی مقدار کے بغیر کسی عصب - عضلہ - جھلی - یا کسی اور مادہ کی کمی اچھی طرح پوری نہیں ہوسکتی - عمدہ خون کی کافی مقدار کے بغیر - نمو نہ تو کامل ہوتا ہے - اور نہ کافی - اب اس بات کا اندازہ کرو کہ جب ضعیف معدہ نمو کرنے والے جسم

کے لیے ایسا خون مہیا کرے - جو کمیت کم ہیں اور کیفیت میں ادنیٰ درجہ کا ہو - اور
ضعیف قلب قلیل اور ادنیٰ درجہ کے خون کو غیر طبیعی آہستگی کے ساتھ آگے کو حرکت
دے - تو کیا کچھ خراب نتیجے پیدا نہ ہوں گے -

طوطے کی طرح بے سوچے سمجھے حفظ کرنے کا طریقہ سخت قابل الزام ہے اور اُس کے متعدد نقصانات

اگر جسمانی انحطاط کثرت مطالعہ کا نتیجہ ہے - جیسا کہ اُن تمام آدمیوں کو جو اِس
معاملہ کی تحقیقات کرتے ہیں - ضرور تسلیم کرنا پڑے گا - تو طوطے کی طرح یاد کر لینے کا طریقہ
جس کی مثالیں اوپر بیان ہو چکی ہیں کس قدر سخت قابل الزام نہ ہو گا - یہ طریقہ
ایک خوفناک غلطی ہے - خواہ کسی حیثیت سے اُس پر نظر کی جائے -

پہلا نقصان

اول - یہ ایک غلطی ہے - جہاں تک محض تحصیل علم سے متعلق
ہے - کیونکہ نفس بھی جسم کی طرح ایک خاص اندازہ سے بڑھ کر کسی شئے کو قبول
نہیں کر سکتا - اور جس قدر عرصہ میں کہ نفس واقعات کو اخذ کر سکتا ہے -
اگر اس سے زیادہ جلد اُن کے اخذ کرنے کا بار اُس پر ڈالا جائے تو وہ واقعات تھوڑے
عرصہ میں پھر ذہن سے نکل جاتے ہیں - اور بجائے اِس کے کہ اُن سے عقلی
عمارت قایم ہو - امتحان پاس کرنے کے بعد ہی جس کے لیے وہ ازبر کیے گیے
تھے - یاد سے اُتر جاتے ہیں -

دوسرا نقصان

دوم - یہ ایک غلطی ہے - اِس وجہ سے بھی کہ اس طریقہ سے مطالعہ بے
لطف ہو جاتا ہے - خواہ اُس دردانگیز تسلسل خیالات کی بدولت - جو
متواتر عقلی محنت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے - خواہ دماغ کی ابتر حالت کی بدولت جو
اُس کا نتیجہ ہے - یہ طریقہ اکثر اوقات کتابوں سے متنفر کر دیتا ہے - اور بجائے
اِس کے کہ بعد میں اپنے نفس کی آپ تربیت کی جائے - جس کی طرف معقول
تعلیم ہدایت کرتی ہے - قدم بقدم رجعت قہقری ہوتی جاتی ہے -

تیسرا نقصان

سوم - یہ ایک غلطی ہے - اِس اعتبار سے بھی کہ اس میں یہ فرض کر لیا جاتا ہے

کہ "حصول علم ہی سب کچھ ہے" اور یہ بات فراموش کردی جاتی ہے کہ اس سے بھی زیادہ ضروری بات "علم کا انضباط" ہے۔ جس کے لیے وقت اور بطور خود فکر کرنا ضروری ہے۔ جیسا کہ ہمبولٹ نے بالعموم ترقیٔ عقل کی بابت بیان کیا ہے۔ کہ "جب منتشر واقعات نہایت کثرت کے ساتھ دماغ میں بھر دیے جاتے ہیں۔ جس سے بیان کا زور کم ہوجاتا ہے۔ تو قدرت کا مطالب مبہم ہوجاتا ہے" اسی طرح شخصی عقل کی ترقی کی بابت کہا جاسکتا ہے کہ وہ کثیر معلومات جو اچھی طرح ذہن نشین نہیں ہوتے۔ سخت بار اور وبال جان ہوتی ہے۔ وقعت اُس علم کی نہیں جو بطور "عقلی چربی" کے جمع ہوجاتا ہے۔ بلکہ وقعت اُس علم کی ہے۔ جو "عقلی عضلہ" بن جاتا ہے۔

چوتھا نقصان

چہارم۔ مگر یہ غلطی اور بھی زیادہ سخت ہے۔ اگر بالفرض طوطے کی طرح یاد کرلینا اس لحاظ سے عمدہ ہوتا کہ اُس سے عقلی قابلیت پیدا ہوتی۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔ تاہم طریقہ مذکور۔ جیسا کہ ہم ثابت کرچکے ہیں۔ اس وجہ سے خراب ہوتا کہ وہ اُس جسمانی طاقت کو۔ جو زندگی کی کشاکش میں عقلی تربیت حاصل کرنے کے لیے درکار ہے۔ زائل کرتا ہے۔ جو معلم اپنے شاگردوں کے نفسوں کو ترقی دینے کے شوق میں اُن کے جسموں سے غفلت کرتے ہیں۔ اُن کو یہ بات یاد نہیں کہ دنیا کی کامیابی۔ بہ نسبت معلومات کے زیادہ تر جسمانی قوت پر منحصر ہے۔ اور جو تدبیر علم کو دماغ میں ٹھونس لینے کے سبب جسمانی قوت کو زائل کرتی ہے وہ آپ اپنی ناکامی کا باعث ہے۔ مضبوط ارادہ اور نہ تھکنے والی مستعدی جو حیوانی طاقت کی افراط کا نتیجہ ہیں۔ یہ دونوں باتیں تعلیم کے بڑے بڑے نقصانوں کا بہت کچھ معاوضہ کرسکتی ہیں۔ اور جب اِس طاقت کے ساتھ اُس کافی و وافی تعلیم کو شامل کرلیا جائے۔ جو صحت کو قربان کیے بغیر حاصل ہوسکے۔ تو اُن

حریفوں پر - جن کو کثرت مطالعہ نے ضعیف کر دیا ہے - یقیناً بآسانی فتح حاصل ہو سکتی ہے - اگرچہ وہ علم میں افلاطون زمانہ ہی کیوں نہ ہوں - جو انجن نسبتہً چھوٹا ہو اور اچھا بنا ہوا نہ ہو - اگر اس سے زیادہ زور سے کام لیا جائے - تو وہ اُس انجن سے زیادہ کام دے سکتا ہے جو بڑا اور خوب عمدہ بنا ہوا ہو - اور جس سے زیادہ زور کے ساتھ کام نہ لیا جائے - پس یہ کیسی حماقت ہے کہ جس حالت میں انجن کی تکمیل کی جائے اُس کے بھبکے کو ایسا نقصان پہنچایا جائے کہ اس میں بھاپ پیدا نہ ہو!

پانچواں نقصان

پنجم - پھر یہ طریقہ اس وجہ سے بھی ایک غلطی ہے کہ وہ زندگی کی بہبودی کا ایک غلط اندازہ قایم کرتا ہے - اگر بالفرض یہ طریقہ - دنیاوی ناکامی کا ذریعہ ہونے کے بجائے - دنیاوی کامیابی کا ذریعہ بن جائے - تو بھی بہ سبب اُس خراب صحت کے جو اُس کا نتیجہ ہے - وہ اور بھی زیادہ آفت برپا کرے گا - اگر دولت کے ساتھ لگاتار بیماریاں لگی ہیں - تو دولت کے حاصل کرنے سے کیا فائدہ ہے؟ عزت و امتیاز کی کیا وقعت ہے - اگر اُس کے ساتھ مراق بھی پیدا ہو جائے؟ یقیناً کسی شخص کو اس بات کے بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ عمدہ ہاضمہ - سرعت نبض - اور اعلیٰ درجہ کا نشاط - خوشی کے عناصر ہیں - جن کا مقابلہ خارجی منافع نہیں کر سکتے - کسی مزمن جسمانی بیماری کی وجہ سے نہایت ہی روشن امیدوں پر غم کی تاریکی چھا جاتی ہے - مگر عمدہ صحت کی زندہ دلی - بدقسمتی پر بھی ملمع کر دیتی ہے -

نقصانات مذکورہ کا خلاصہ

پس ہم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ یہ زاید از اعتدال تعلیم ہر ایک اعتبار سے خراب ہے - یعنی -

(۱) خراب اِس اعتبار سے کہ جو کچھ علم اُس سے حاصل ہوتا ہے وہ جلد فراموش ہو جاتا ہے -

(۲) خراب اِس اعتبار سے کہ وہ علم سے متنفر کر دیتی ہے۔

(۳) خراب اِس اعتبار سے کہ وہ اُس انضباط علم سے غافل ہے جو تحصیل علم سے بھی زیادہ ضروری ہے۔

(۴) ۔خراب اِس اعتبار سے کہ وہ اُس قوت کو ضعیف یا ضائع کرتی ہے جس کے بغیر تربیت یافتہ عقل بیکار ہے۔ اور

(۵) خراب اِس اعتبار سے کہ وہ اُس خراب صحت کا باعث ہے۔ جس کا معاوضہ کامیابی بھی نہیں کر سکتی۔ اور جو ناکامی کو دوچند تلخ کر دیتی ہے۔

یہ جابرانہ طریقہ تعلیم عورتوں کے لیے زیادہ مضر ہے

مرد عورتوں میں کن کن صفتوں کو پسند کرتے ہیں

محبت پیدا کرنے والے اسباب کون سے ہیں۔

ممکن ہے کہ اِس جابرانہ طریقہ تعلیم کے نتائج ۔ بہ نسبت مردوں کے عورتوں کے لیے اور بھی زیادہ مضر ہوں ۔ چونکہ لڑکیوں کو اُن طاقت بخش اور فرحت بخش جسمانی ورزشوں سے بہت کچھ روکا جاتا ہے ۔ جن کے ذریعہ سے لڑکے ۔ کثرت مطالعہ کی خرابیوں کو کم کرتے ہیں ۔ اس لیے وہ اِن خرابیوں کی پوری پوری سختی محسوس کرتی ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ بہت کم لڑکیاں ایسی نکلتی ہیں جو بڑی ہو کر تندرست نہیں اور جن کے اعضا میں تناسب پایا جائے ۔ زرد رو ۔ بد شکل ۔ چپٹے سینہ والی نوجوان خواتین ۔ جو لندن کے ملاقات کے کمروں میں کثرت کے ساتھ دیکھی جاتی ہیں ۔ اِن خواتین میں ۔ اُس بے رحمانہ محنت کا نتیجہ نظر آتا ہے ۔ جس کو جوانی کے کھیلوں سے ہلکا نہیں کیا جاتا ۔ اور جس قدر کہ اُن کے اکثر کمالات اُن کی بہبودی میں ممدو معاون ہوتے ہیں ۔ اُس سے کہیں زیادہ جسمانی انحطاط مزاحم ہوتا ہے ۔ جو مائیں اپنی بیٹیوں کو دل کش بنانے کی خواہش مند ہیں ۔ وہ اِس سے زیادہ کوئی مضر طریقہ ۔ جو جسم کو نفس پر قربان کر دیتا ہے ۔ شاید ہی پسند کر سکیں ۔ وہ یا تو مردوں کے مذاق کا لحاظ

نہیں رکھتیں یا مردوں کے مذاق کا صحیح تصور نہیں کر سکتیں۔ مرد عورتوں کے علم کی کچھ ایسی پروا نہیں کرتے۔ مگر اُن کے جسمانی حسن۔ نیک طینتی۔ اور عقل سلیم کا بہت کچھ خیال کرتے ہیں۔ بھلا ایک عالم و فاضل شریف زادی اپنے وسیع علم تاریخ کی بدولت کتنے دلوں کو مسخر کر سکتی ہے؟ کون ایسا آدمی ہے؟ جو کسی عورت پر اس وجہ سے فریفتہ ہوا ہو کہ وہ اٹلی کی زبان سمجھتی تھی؟ ایسا مجنون کہاں ہے جو لیلیٰ[1] پر اس وجہ سے گرویدہ ہوا ہو کہ وہ جرمنی زبان جانتی تھی؟ مگر گل رنگ رخسار اور چشم خنداں میں بڑی کشش ہے۔ ایک اچھی مکمل شکل۔ نگاہ تحسین کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ زندہ دلی۔ خوش مزاجی۔ جو کامل صحت کا نتیجہ ہیں۔ محبت کے قائم کرنے میں بہت کچھ اثر رکھتی ہیں۔ ہر شخص کو ایسی حالتیں معلوم ہیں۔ جہاں اور سب خوبیوں کی عدم موجودگی میں صرف جسمانی حسن نے طبیعت میں ایسا جوش پیدا کر دیا ہے۔ جو سب خوبیوں پر غالب آگیا ہے۔ مگر مشکل سے کوئی شخص ایسی حالت بتا سکتا ہے۔ جہاں اخلاقی یا جسمانی اوصاف سے قطع نظر کر کے عقلی علوم کی تحصیل نے طبیعت میں ایسا جوش پیدا کیا ہو۔ سچ یہ ہے کہ ان جملہ اُن بہت سے عناصر کے۔ جو انسان کے سینہ میں اس پیچیدہ جذبہ کے پیدا کرنے کے لیے جسے ہم محبت کہتے ہیں۔ مختلف نسبت سے باہم ملتے ہیں۔ سب سے زیادہ قوی عناصر وہ ہیں جو جسمانی کشش سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے بعد بلحاظ قوت کے۔ دوسرا درجہ اُن کا ہے۔ جو اخلاقی کشش سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور سب سے کمزور وہ ہیں جو عقلی کشش سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور اُن کا دار و مدار بھی کسبی علم پر اسقدر نہیں۔ جس قدر کہ قدرتی لیاقت پر ہے۔ مثلاً عقل و ذکاوت۔ فہم و فراست

[1] اصل کتاب میں ایڈورڈ اور انجلینا ہے۔ جو اپنے عشق کی وجہ سے انگریزی میں ضرب المثل ہیں۔ جنہیں مضمون کی مناسبت سے ان کا ترجمہ مجنون اور لیلیٰ کیا ہے۔ مترجم۔

اور بصیرت اگر بعض اشخاص اس دعویٰ کو بے وقعت خیال کریں - اور مردوں کی طبیعت کے اس طرح مغلوب ہو جانے کی مخالفت کریں - تو ہمارا جواب یہ ہے کہ جب وہ قوانین الٰہی کے ساتھ اس طرح معارضہ کرتے ہیں - تو وہ یہ نہیں جانتے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں - اگر ترتیب مذکورہ بالا کا مفہوم صاف ظاہر نہ ہوتا - تو بھی ہم یقین کر سکتے تھے کہ اُس سے کسی اہم مقصد کا پورا کرنا مدنظر ہے - مگر جو لوگ تحقیقات کرتے ہیں اُن پر اس کا مفہوم بالکل ظاہر ہے - جب ہم اس بات کو یاد کریں کہ قدرت کے مقاصد میں سے ایک مقصد - بلکہ سب سے اعلیٰ مقصد آیندہ نسل کی بہبودی ہے - اس کے علاوہ جو ترقی یافتہ عقل خراب جسمانی نظام پر مبنی ہے - اُس کی وقعت - جہاں تک کہ آیندہ نسل کا تعلق ہے - کم ہوتی ہے - کیوں کہ اُس کی اولاد ایک ہی دو پشتوں میں ختم ہو جائے گی - برعکس اس کے کہ عمدہ جسمانی نظام کا قایم رکھنا - گو اُس کے ساتھ قوائے عقلیہ کیسے ہی ادنیٰ درجہ کے ہوں - ضروری ہے - کیوں کہ آیندہ پشتوں میں قوائے عقلیہ بے انتہا ترقی کر سکتے ہیں - تو ہم سمجھ لیں گے کہ طبیعی میلانوں کا وہ موازنہ جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے - کس قدر ضروری ہے - مگر فایدہ سے قطع نظر کر کے - جب کہ ان طبیعی میلانوں کا موازنہ اسی طرح ہے - تو پھر کسی ایسے طریقہ پر - جس سے لڑکیوں کے جسم کو نقصان پہنچے - اس غرض سے اصرار کرنا کہ اُن کے حافظہ میں بہت سا علم کوٹ کر بھر دیا جائے - حماقت ہے - جہاں تک ممکن ہو اعلیٰ التعلیم دو - بل کہ جتنی اعلیٰ التعلیم دی جائے اُتنی ہی بہتر ہے - بشرطیکہ کوئی جسمانی نقصان نہ ہو - (اور ہم سر دست یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ اگر طوطے کی سی لیاقت کو کم - اور انسانی لیاقت کو زیادہ ترقی دی جائے اور اگر تعلیم و تربیت کو اُس زمانہ تک - جو مدرسہ چھوڑنے اور شادی کرنے کے درمیان واقع ہے - اور جو آج کل رائگاں جاتا ہے وسعت دی جائے - تو کافی اعلیٰ درجہ کی

تعلیم ہوسکتی ہے) مگر ایسے طریقہ سے یا ایسی حد تک تعلیم دینا جس سے جسمانی انحطاط پیدا ہو اُس بڑے مقصد کو فوت کر دیتا ہے۔ جس کے لیے محنت۔ خرچ۔ اور فکر برداشت کیے جاتے ہیں۔ والدین۔ اپنی بیٹیوں کو اِس طریقہ تعلیم میں مبتلا کر کے اُن کی زندگی کی امیدوں کو اکثر برباد کر دیتے ہیں۔ کمزور صحت اور اُس کی تمام تکالیف۔ ناتوانی وافسردگی کا وبال اُن پر ڈالتے ہیں۔ اور اس کے علاوہ اکثر اوقات تجرد کا فتوٰی بھی اُن پر لگا دیتے ہیں۔

آج کل بچوں کی جسمانی تعلیم میں زیادہ ترجہ نقص پائے جاتے ہیں

پس بچوں کی جسمانی تعلیم مختلف اعتبارات سے نہایت ناقص ہے

اوّل۔ تو اس میں یہ غلطی ہے کہ بچوں کو ناکافی خوراک دی جاتی ہے۔

دوم۔ ناکافی لباس پہنایا جاتا ہے۔

سوم۔ ناکافی ورزش کرائی جاتی ہے (کم سے کم لڑکیوں سے)۔

چہارم۔ عقلی محنت بہت زیادہ لی جاتی ہے۔

اگر اس دستور العمل پر بحیثیت مجموعی غور کی جائے۔ تو اُس کا رجحان یہ ہے کہ وہ واجبی مقدار سے زیادہ مطالبہ کرتا ہے۔ یعنی مانگتا بہت زیادہ ہے۔ اور دیتا بہت کم ہے۔ قوائے نشوونما پر اس قدر بار ڈالتا ہے کہ بچوں کی زندگی کو بالغوں کی زندگی سے جسقدر مشابہت ہونی چاہیئے۔ اُس سے بہت زیادہ مشابہت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اِس حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے کہ جس طرح جنین کی پوری زندگی نمو میں صرف ہوتی ہے۔ جس طرح شیر خوار بچہ کی زندگی نمو میں اس قدر زیادہ صرف ہو جاتی ہے کہ جسمانی یا عقلی عمل کے لیے بہت ہی کم گنجائش باقی رہتی ہے۔ اسی طرح تمام بچپن اور جوانی میں زیادہ تر ضرورت نمو کی ہے۔ اور باقی تمام ضرورتیں اسی ضرورت کے تابع ہونی چاہئیں۔ یہ وہ ضرورت ہے جو اس امر کی ہدایت کرتی ہے کہ زیادہ دیا جائے اور کم لیا جائے۔ یہ وہ ضرورت ہے جو سرعت نمو کی مناسبت

سے جسمانی اور دماغی محنت کو محدود کرتی ہے - یہ وہ ضرورت ہے جو جسمانی اور دماغی
عملوں کو صرف اُس وقت بڑھنے دیتی ہے - جب کہ نمو کی رفتار گھٹ جاتی ہے -

اِس سخت جابرانہ تعلیم کی اصل یہ ہے کہ وہ ہمارے تمدن کی حالت موجودہ
کا نتیجہ ہے - ابتدائی زمانہ میں جب کہ محض صحت اور مدافعت بڑے بڑے مجلسی
کام سمجھے جاتے تھے - جسمانی طاقت اور جرأت کی - جو اُس کو لازم ہے - بڑی
ضرورت تھی - اور اُس وقت تعلیم تقریباً بالکل جسمانی ہوتی تھی - عقلی تربیت کا خیال
کم کیا جاتا تھا - اور جیسا کہ قرونِ متوسط میں ہوتا تھا - درحقیقت اُس کو بسا اوقات
نظرِ حقارت سے دیکھا جاتا تھا - مگر اب کہ ہماری حالت نسبتہً صُلح جُو ہو گئی ہے - اب کہ
ہاتھ پاؤں کی محنت کے سوا کسی دوسرے کام میں جسمانی قوت بہت کم کار آمد ہے -
جب کہ معاشرت میں تقریباً ہر قسم کی کامیابی بہت کچھ عقلی قوت پر منحصر ہے - ہماری
تعلیم بھی قریب قریب بالکل عقلی ہو گئی ہے - جسم کا لحاظ رکھنے اور نفس سے غفلت
کرنے کے بجائے - ہم آج کل نفس کا لحاظ رکھتے اور جسم سے غفلت کرتے ہیں - یہ
دونوں طریقے غلط ہیں ہم نے اب تک اِس حقیقت کو نہیں سمجھا کہ جس طرح ہماری اِس
زندگی میں نفس کا دارومدار جسم پر ہے - اسی طرح جسم کو نقصان پہنچا کر عقل کو ترقی نہیں دینی
چاہیئے - قدیم اور جدید خیالات کو ضرور باہم شامل کر لینا چاہیئے -

شائد اِس اعتقاد کے پھیلنے سے کہ صحت کا قائم رکھنا فرض ہے - نہ کہ اور
کسی وجہ سے - جلد وہ زمانہ قریب آجائے گا - جب جسم اور نفس دونوں کی کافی غور و
پرداخت کی جائے گی - بہت کم لوگ اس امر سے واقف معلوم ہوتے ہیں کہ جسمانی
اخلاق بھی کوئی شے ہے - لوگوں کے اقوال و افعال ہمیشہ اس خیال کو کنایتہً ظاہر کرتے
ہیں کہ "ہم آزاد ہیں جس طرح چاہیں جسم کے ساتھ برتاؤ کریں" قدرت کے احکام کی
نافرمانی سے جو بیماریاں پیدا ہوتی ہیں اُن کو محض اپنی حق تلفی سمجھتے ہیں - نہ کہ اُس چال چلن کا

عقلی تعلیم پر اِس قدر زور دینا اور جسمانی تعلیم سے اِس قدر غفلت کرنا ہمارے موجودہ تمدن کا نتیجہ ہے -

صحت کا قائم رکھنا فرض ہے اور جب تک یہ خیال ذہن نشین نہ ہو اُس وقت تک جسمانی تربیت پر کما حقہ توجہ نہیں ہو سکتی -

نتیجہ جس میں تھوڑی بہت خرابی پائی جاتی ہے۔ اگرچہ وہ بد نتیجے جو اُن کے متوسلوں اور آیندہ نسلوں کو بھگتنے پڑتے ہیں۔ وہ اکثر ایسے ہی سخت ہوتے ہیں۔ جیسے کہ وہ نتیجے جو کسی جرم سے پیدا ہوتے ہیں۔ تاہم وہ اپنے آپ کو ذرا بھی مجرم نہیں سمجھتے یہ سچ ہے کہ شراب خواری میں جسمانی خلاف ورزی کی بُرائی تسلیم کی جاتی ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص یہ نتیجہ نہیں نکالتا کہ وہ اگر جسمانی خلاف ورزی (یعنی شراب خواری) ایک خراب بات ہے۔ تو یہی کیفیت ہر ایک جسمانی خلاف ورزی کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قوانین صحت کی تمام خلاف ورزیاں جسمانی گناہ ہیں۔ جب یہ بات عام طور پر سمجھ میں آجائے گی اُسی وقت۔ اور شائد اُس سے پہلے نہیں بچوں کی جسمانی تربیت پر کماحقہ توجہ کی جائے گی۔

دیباچہ



کتاب "ایجوکیشن" مصنّفہ ہربرٹ سپنسر

کے

اُردو ترجمہ پر تقریظین

(۱) از جناب شمس العلماء خان بہادر مولوی محمد ذکاء اللہ فیلو

الہ آباد یونیورسٹی۔ سابق پروفیسر ورنیکیولر سائنس اینڈ لٹریچر سنٹرل

میور کالج الہ آباد

ہربرٹ سپنسر صاحب انگلستان کے ارسطو تھے۔ اُنہون نے تعلیم کے باب میں یہ رسالہ لکھا ہے جس کا ترجمہ مولوی خواجہ غلام الحسنین صاحب نے کیا ہے۔ یہ ترجمہ ایسا ہے کہ جس سے بہتر ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ مترجم نے بڑی عرق ریزی و جانفشانی سے ترجمہ کیا ہے۔ اور فقط ترجمہ ہی نہیں کیا۔ بلکہ کتاب کے اصل مضامین کو اپنے حواشی و تشریح سے آئینہ بنایا ہے۔ ہر مضمون کی پیشانی اور ہر باب کا خلاصہ اور مصنف کا تذکرہ لکھا ہے۔ غرض مترجم نے اپنی قابلیت اور لیاقت کو سب طرح سے ثابت کیا ہے۔ یہ اس کتاب کی خوش نصیبی تھی کہ اس کے لیے مترجم ایسا لائق اور قابل مل گیا۔

مصنف نے انگلستان کی تعلیم موجودہ کے کل عیبوں اور نقصوں کو بتا کر اُن کے

دور کرنے کی تدابیر بتائی ہیں - اور سمجھایا ہے کہ تعلیم سے اصل مقصود کیا ہونا چاہیے -
اور علوم باہم وقعت میں کیا نسبت رکھتے ہیں - وہ کیونکر سکھائے جائیں - جسمانی و عقلی
و اخلاقی تعلیم کس طرح ہونی چاہیے -

یہ ترجمہ علی العموم ہندوستانیوں کے لیے جو اپنی اولاد کی تعلیم کا خیال رکھتے ہیں خصوصاً
وہ جو اپنی اولاد کو انگلستانی تعلیم دلانی چاہتے ہیں جس کی اس زمانہ میں اشد ضرورت ہے -
نہایت مفید اور کارآمد ہے - مجھے امید ہے کہ انجمن ترقی اُردو جس کے ایما سے یہ
ترجمہ عمدہ کاغذ پر - خوشخط عمدہ چھپا ہے پوری قدر شناسی کرے گی اور پبلک بھی
مترجم کا احسان مانے گی -

(۲) از جناب شمس العلماء مولانا خواجہ الطاف حسین صاحب حالی

میں نے انگلستان کے نامور حکیم ہربرٹ سپنسر مرحوم کی بیمثل کتاب "ایجوکیشن" کا ترجمہ
جو "انجمن ترقی اُردو" کی فرمائش سے مولوی خواجہ غلام الحسنین پانی پتی نے کیا ہے -
مختلف مقامات سے خود بھی دیکھا اور مترجم موصوف نے بھی اُس کا بہت بڑا حصہ مجھے
پڑھ کر سنایا - اور جس احتیاط اور صبر کے ساتھ اُنہوں نے اس ترجمہ کو پورا کیا ہے - اُس سے
بھی میں بخوبی واقف ہوں -

اگرچہ اس ترجمہ کی نسبت - جو کہ انگریزی سے اُردو زبان میں کیا گیا ہے - ایک ایسا
شخص جو انگریزی زبان سے بالکل نابلد ہو رائے دینے کا استحقاق نہیں رکھتا - لیکن وہ
اس بات کا اندازہ کر سکتا ہے کہ مترجم نے اپنے ترجمے کے ذریعہ سے مصنف کے عمیق و دقیق
خیالات کو کہاں تک اُردو داں پبلک کے فہم کے لائق کر دیا ہے - اور جس زبان میں اصل کتاب کے

مضامین ادا کیے گیے ہیں وہ کہاں تک سائنس کے بیان کے لیے موزوں اور مناسب ہیں
میرے نزدیک ان دونوں باتوں کے لحاظ سے مترجم کو توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی
ہے جس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ انہوں نے ترجمہ کی تکمیل اور زبان
کی صفائی اور شستگی میں اپنے اصلی فرائض سے بہت زیادہ اور انجمن
کی امیدوں سے بمراتب بڑھکر عرق ریزی و جانفشانی کی ہے۔
درحقیقت یہ ایک حسن اتفاق ہے کہ انجمن کو اس کتاب کے ترجمہ کے لیے ایک ایسا
شخص مل گیا جو قطع نظر انگریزی۔ عربی اور فارسی کی جامعیت کے فطرۃً علمی مشاغل
پر فریفتہ اور اپنے فرائض کو عاشقانہ دلچسپی اور شغف کے ساتھ انجام
دینے والا ہے۔ فقط۔

(۱۳) از جناب مولوی محمد اقبال صاحب ایم اے اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور

میرے عزیز دوست خواجہ صاحب ایں نے آپ کے ترجمہ کتاب "ایجوکیشن" مصنفہ
ہربرٹ سپنسر کا ایک حصہ دیکھا ہے۔ سال گزشتہ جب مولانا شبلی نے مجھ سے دریافت
کیا تھا کہ آیا سپنسر کی سنتھیٹک فلاسفی (فلسفۂ ترکیبی) کے بعض حصوں کا اُردو میں
ترجمہ ہونا ممکن ہے یا نہیں۔ تو میں نے اُن کو لکھ دیا تھا کہ اِس ارادہ میں زیادہ تر اِس
وجہ سے ناکامیابی ہوگی کہ (اُردو کا) ظرف اِس قدر تنگ ہے کہ اُس میں مظروف (فلسفیانہ
خیالات) کے لیے گنجائش نہیں ہے۔ مگر آپ کے ترجمہ نے یہ بات میرے ذہن نشین
کردی کہ میری اُس رائے کی بنیاد اس امر پر تھی کہ مجھے معلوم نہ تھا کہ اِس نہایت ہی خوبصورت
اور ترقی کرنیوالی زبان (اُردو) میں ایسے مضامین کے ادا کرنے کی قوت کہاں تک موجود

ہے۔ باوجودیکہ عربی میں مثل دیگر السنۂ ترکیبی کے۔ ادائے مطالب کی پوری قابلیت اور
مرکب الفاظ وضع کرنے کی عجیب و غریب طاقت موجود ہے۔ تاہم مغربی علوم کے جو ترجمے
آجکل عربی زبان میں ہوئے ہیں۔ ان میں بعض اوقات تکلف اور تصنع کی بو پائی جاتی ہے۔
مگر جب اِس بات پر غور کی جائے کہ ہماری زبان ابھی ترقی کے پہلے ہی
زینہ پر ہے۔ تو آپ کے ترجمے کی بے تکلف روانی بالکل حیرت انگیز ہے
اگر ہربرٹ سپنسر ہندوستانی ہوتا۔ تو وہ بھی اُردو میں اس سے بہتر طرز تحریر
اختیار نہ کرسکتا۔ یہ بات کہ اُردو میں ایسا ترجمہ ممکن ہے۔ اس سے نہ صرف آپ کی
لیاقت اور قدرت بیان ظاہر ہوتی ہے۔ بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نو عمر اور ہونہار
اُردو میں ادائے مطالب کی کس قدر قابلیت موجود ہے۔

میں اِس موقع پر آپ کے قابل قدر ترجمہ کی ایک اور خصوصیت بیان
کرتا ہوں۔ آپ نے اپنے ترجمے کے دیباچہ میں تمام کتاب کے مطالب کا ایک مسلسل
خلاصہ درج کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مسئلہ کی اہم اور ضروری باتوں پر حاوی
ہوجانے کی کیسی زود رس قوت آپ میں موجود ہے۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ
کی کتاب کو بہت سے لوگ پڑھیں گے۔ اور آپ کے "خلاصہ" سے ناظرین
کتاب کو سپنسر کے خیالات کے سمجھنے اور اُن کی قدر کرنے میں بڑی سہولت ہوگی[۵۱]

(۴) از جناب مولوی سید وحیدالدین صاحب سلیم سابق لٹریری اسسٹنٹ ٹو سر سید احمد خان و سابق ایڈیٹر "معارف"

اگر کوئی زمانہ ہندوستان میں ایسا آئے کہ یورپ کے علوم جدیدہ کی تمام ابتدائی اور

۵۱ اصل انگریزی چٹھی۔ جو پروفیسر صاحب نے مترجم کے نام بھیجی ہے۔ کتاب کے آخر میں درج کی گئی ہے۔

انتہائی کتابیں اردو زبان میں ترجمہ ہو جائیں اور علمی الفاظ کی قیمتیں معین ہو جائیں اور علمی اصطلاحوں کی فرہنگیں مرتب کر لی جائیں تو وہ زمانہ اس قابل ہوگا کہ ہربرٹ سپنسر کی کتاب "ایجوکیشن" کا ترجمہ اُردو زبان میں شایع کیا جائے۔ اس سے یہ نتیجہ صاف طور پر مستنبط ہوتا ہے کہ اس کتاب کے مترجم مولوی خواجہ غلام الحسنین نے جو کام کیا ہے وہ زمانہ موجودہ کی قابلیت سے اور اس لیے اُن کی طاقت سے باہر تھا۔ اور جو کامیابی اُنھوں نے اس کام میں حاصل کی ہے۔ اُس کی کوئی نظیر اس زمانہ میں نہیں مل سکتی۔

دیباچہ میں لائق مترجم نے جو مشکلات اس کتاب کے ترجمہ کی بیان کی ہیں اُن میں سے ایک مشکل یہ تھی کہ "انجمن ترقی اُردو" نے اُن کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ مصنف کے خیالات کو اپنی زبان میں ادا کرنے ہی پر قانع نہ ہوں۔ بلکہ اُس کی طرزِ تحریر اور اسلوبِ بیان کو بھی علیٰ حالہ رہنے دیں۔ لائق مترجم نے اس قید کو ایسی محنت اور لیاقت سے نباہا ہے کہ اگر اُن کو بس یہی فتح حاصل ہوتی۔ تو یہ اس بات کے لیے کافی تھی کہ اُن کو دیگر تمام مترجموں پر ترجیح دی جائے۔ عربی زبان میں جو ترجمے علمی کتابوں کے ہماری نظر سے گزرے ہیں (حالاں کہ عربی زبان میں بہ نسبت اُردو زبان کے علمی مطالب کو ادا کرنے کی زیادہ قابلیت ہے) اُن میں ہمیشہ مترجموں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ مصنفوں کے خیالات عربی زبان میں ادا کر دیے جائیں۔ نہ یہ کہ اُن کی لفظی ترکیبیں بھی بدستور قایم رکھی جائیں۔ کتاب زیرِ بحث کے بعض بعض مقامات بھی ترجمہ ہو کر بطور اقتباس کے عربی زبان کی جدید کتابوں میں داخل کیے گیے ہیں۔ اور وہ بھی ہماری نظر سے گزرے ہیں۔ مگر اُن میں بھی کسی جگہ اس مالایطاق شرط کی پابندی نہیں کی گئی۔ ہربرٹ سپنسر کی سوشیالوجی (علم عمران) کے بعض مضامین بھی ہم نے عربی زبان میں پڑھے ہیں۔ مگر اُن میں بھی اس قید کی پروا نہیں کی گئی۔ کتاب ہٰذا کے اُردو ترجمے کو اگر اس قید سے مقید نہ کیا جاتا۔ تو لائق مترجم اپنے کام کو غالباً بہت آسانی سے اور بہت جلد پورا کر دیتے

مگر اس صورت میں وہ غیر معمولی تعریف اُن کی ہرگز نہ ہوتی جس کے وہ اب مستحق ہیں۔ اس کے علاوہ اُنہوں نے جو ہربرٹ سپنسر کا تذکرہ۔ کتاب "ایجوکیشن" کے مطالب کا خلاصہ۔ فٹ نوٹ۔ مارجنل نوٹ۔ اور مجمل اور مفصل فہرست مطالب کتاب کی اپنے ترجمہ کے ساتھ شامل کی ہے۔ اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ لایق مترجم نے ترجمہ ہی کے فرض سے سبک دوشی حاصل نہیں کی۔ بلکہ اُس سے کچھ بڑھکر کام کیا ہے۔ اور بالفاظ دیگر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُنہوں نے ترجمہ بھی کیا ہے اور اپنے ترجمہ کو اوڈٹ بھی کیا ہے۔

مصنف کی روح اس وقت عالم بالا پر ہے۔ مگر مترجم کی نسبت بھی اُس وقت تک زندہ رہنے کی اُمید نہیں کی جاسکتی۔ جبکہ اُن کی محنت کی اصلی داد دی جائیگی۔ اور اُن کے کام کی سچی تعریف اکثر لوگوں کی زبان پر ہوگی۔ بشرطیکہ ہندوستان میں کوئی ایسا زمانہ آئے۔ کیونکہ ہم کو یقین ہے کہ اگر لایق مترجم حصولِ معاش کا کوئی ذاتی ذریعہ نہ رکھتے تو ایسی کتابوں کے ترجمہ کرنے اور اوڈٹ کرنے میں ہربرٹ سپنسر کی طرح مفلس ہوجاتے۔

شاید عام لوگ میرے اِس کہنے کو مبالغہ میں داخل سمجھیں۔ مگر جب اُنھیں معلوم ہوگا کہ یہ کتاب جس میں قومی ترقی کے اعلیٰ سے اعلیٰ اسرار کھول کر بیان کیے گیے ہیں۔ اُس فایق ترین علامہ اور اُستاد فلاسفہ کی تصنیف ہے جس نے ابتداے آفرینش سے آج تک کی معلوماتِ انسانی کو اپنے دماغ میں جمع کرکے اُن پر اپنے فلسفہ کی بنیاد رکھی ہے اور یہ ترجمہ حتی الامکان اس کتاب کا بہتر سے بہتر ترجمہ ہے۔ جو زیادہ سے زیادہ انسانی محنت اور لیاقت سے تیار کیا گیا ہے۔ تو کچھ عجب نہیں ہے کہ آخر کار ہر شخص میری رائے سے اتفاق کرنے پر مجبور ہوگا۔

(۵) از جناب مولوی خواجہ سجّاد حسین صاحب بی-اے اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس حلقۂ راولپنڈی (پنجاب)

مولوی غلام الحسنین کا ترجمہ "ایجوکیشن" مصنفۂ ہربرٹ سپنسر اُردو علم ادب میں ایک قیمتی اضافہ ہے - اور اُن والدین کے لیے جو اپنے بچوں کو صحیح اصول پر تربیت کرنے کے خواہشمند ہیں - نہایت ہی مفید کتاب ہے - اِس کام کے لیے نہ صرف انگریزی اور اُردو کی عمدہ واقفیت اور انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرنے کی مشق درکار تھی - بلکہ بحیثیت ایک معلم کے بہت کچھ ذاتی تجربہ کی بھی ضرورت تھی - اور اس ترجمے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مولوی غلام الحسنین میں اِن تمام اوصاف کی کچھ کمی نہیں ہے -

جس محنت و جانکاہی سے یہ ترجمہ مکمل اور مرتب ہوا ہے - اور مترجم کی طرف سے جو دیباچہ اور ہربرٹ سپنسر کا تذکرہ اصل کتاب پر اضافہ کیا گیا ہے - اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب موصوف نے دلی شوق سے ترجمہ کیا ہے - جس نمایاں کامیابی کے ساتھ مترجم نے یہ ترجمہ تکمیل کو پہنچایا ہے - اُس پر اُن کو مبارکباد دینی چاہیئے - اور انجمن اُردو بھی اِس وجہ سے مبارکباد کی مستحق ہے کہ اُس کی سررشتی میں سب سے پہلے ترجمہ کے لیے یہ کتاب تجویز کی گئی - اور اُس کے لیے ایسا مترجم انتخاب کیا گیا[۱]

[۱] - یہ اُس انگریزی رائے کا ترجمہ ہے - جو کتاب کے آخر میں درج ہے -

(۶) از جناب شمس العلماء ڈاکٹر مولانا حافظ نذیر احمد صاحب ایل - ایل - ڈی بالقابہ

اب[1] شاید ہی کسی کو اس سے انکار ہو کہ کیا باعتبار فتوحات ملکی اور کیا باعتبار تمول اور کیا باعتبار دانائی اور کیا باعتبار تہذیب یورپ کی ہر قسم کی ترقی اور برتری کا اصلی سبب اعلیٰ درجہ کی تعلیم ہے۔ اس کے ماننے پیچھے چار وناچار یہ بھی ماننا پڑے گا کہ سپنسر کی کتاب جو اُس نے تعلیم پر لکھی ہے تعلیم کا بہتر سے بہتر دستور العمل بہتر سے بہتر ہدایت نامہ بہتر سے بہتر راہنما بہتر سے بہتر صلاح کار ہے۔ اب کہ ہمارے ہاں ہر طرف تعلیم کا چرچا ہے اور ہم تعلیم کے رستے پر کچھ پڑ لیے ہیں اور کچھ پڑتے جاتے ہیں۔ عین وقت پر خواجہ غلام الحسنین نے سپنسر کی کتاب "ایجوکیشن" کا سلیس شگفتہ بامحاورہ مطلب خیز ترجمہ کر کے قوم کی اور ملک کی بڑی سخت ضرورت کو پورا کیا ہے۔ انگریزی کتابوں کے ترجموں میں عموماً ایک نقص یہ ہوتا ہے کہ جابجا لوگوں اور مقاموں کے نامانوس نام آتے ہیں اور اُن کا کچھ حال اُس مقام پر لکھا نہیں ہوتا تو پڑھنے والے کی طبیعت اُلجھتی ہے۔ خواجہ غلام الحسنین نے فٹ نوٹ میں ضروری کیفیت لکھ کر اس اُلجھن کو بھی رفع کر دیا ہے۔ آدمی کا نام ہے تو اُس کا سال ولادت سال وفات تک لکھ دیا ہے۔ جگہ کا ہے تو اُس کا پتہ بتا دیا ہے۔ اس کے لیے مترجم کو کیسی کچھ زحمت اُٹھانی پڑی ہوگی۔ اس کے علاوہ دیباچہ میں ساری

---

[1] ہم کو افسوس ہے کہ یہ رائے ہمارے پاس اُس وقت پہنچی ہے جبکہ دیگر حضرات کی رائیں کا پی لکھا
تحریر کر چکا تھا۔ اس لیے ہم معافی مانگنے کے بعد اس کو اخیر میں درج کرتے ہیں۔ مترجم

کتاب کے مضامین کی جامع فہرست لگادی ہے کہ پڑھنے والا ایک نظر میں کتاب کے مضامین پر اجمالاً حاوی ہو سکتا ہے۔ فی الجملہ ترجمہ اچھا اور بہت اچھا ہے۔ اور اتنا اچھا ہے کہ شمس العلماء مولوی الطاف حسین حالی کے ایک عزیز سے اتنے ہی اچھے کی توقع کی جا سکتی تھی۔ فقط۔

۱۷۔ دسمبر ۱۹۰۲ء

نذیر احمد

شکریہ

مندرجہ بالا رائیں اُن نامور بزرگانِ قوم کی ہیں جنہوں نے اِس کتاب کو اشاعت سے پہلے ملاحظہ فرمایا تھا۔ ان بیش بہا رایوں پر ناچیز مترجم کو فخر و ناز ہے اور وہ حضرات ممدوح کی خدمت میں دلی شکریہ ادا کرتا ہے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ اشاعت کے بعد بہت سے دیگر اربابِ علم بھی جو علمی مذاق رکھتے ہیں اس کتاب پر اپنی رائیں تحریر فرما کر شکریہ کا موقع دیں گے۔

(نیاز مند مترجم)

B. A., Assistant Inspector Rawalpindi Circle, writes:—

"Maulvi Ghulam-ul-Hasanain.'s translation of Herbert Spencer's "Education" is a *valuable addition to Urdu literature, and a most useful book for Indian parents* anxious to bring up their children on right lines.

The work required not only a good knowledge of English and Urdu and practice in rendering one into the other but also a good deal of experience as a teacher, and his translation shows that *Maulvi Ghulam-ul-Husanain possesses all these qualities in no small degree.*

From the painstaking manner in which the work has been completed and edited, and the *useful additions* made to the original in the shape of a biographical sketch of Herbert Spencer and an introduction by the translator, it seems that the translation has been a *labour of love* with the Moulvi Sahib. *He is to be complimented on the very successful manner* in which it has been accomplished, and the Anjuman-i-Urdu is to be congratulated on their selection of the first book to be published under their auspices and of the translator."

Damodar Printing Works—Agra Cant.

REVIEWS

ON

THE URDU TRANSLATION

OF

HERBERT SPENCER'S "Education."

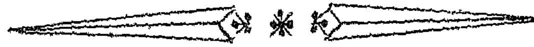
Professor M. Muhammad Iqbal M. A., Government College Lahore, writes:-

"MY DEAR KHAWJA SAHIB,"

I have looked through a part of your Urdu translation of *Spencer's* "*Education.*" When *Maulana Shibli* asked me, last year, whether some parts of Spencer's *Synthetic philosophy* could be translated into Urdu, I wrote to him that such an attempt would fail, largely on the ground that the vessel was too narrow for the contents. But your translation has brought home to me that my judgment was due to my own ignorance of the possibilities of this most beautiful and progressive language. With all the flexibility of *Arabic* and its wonderful power of making compounds which it shares with other synthetic languages, recent translations of Western Scientific ideas into that language sometimes, show sings of affectation and effort; while *the easy flow of your sentences, considering the preliminary stage of the development of our language, is simply surprising. Had Herbert Spencer been a Hindustani, he could not have adopted a better style.* That such a translation is possible in Urdu, shows not only your *power* and *ability*, but also reflects on the genius of the young and promising Urdu.

I may notice here *another feature* of your *valuable translation.* You have added to your work a running *analysis* of the whole book which shows *how keen is your faculty of seizing the salient points of a problem.* I hope your book would be widely read and the analysis would *greatly tfcliiaate* the understanding and appreciation of *Spencer's* views."

اشتہار چھپائی مطبع مفید عام آگرہ



خدا کے فضل وکرم سے اس مطبع مین ہر قسم وہر زبان کی کتابین اُردو ہندی - فارسی - عربی - بہایت خوشخط صحیح وعمدہ جلد ارزان نرخ پر عمدہ سیاہی مصالحہ سے لیتھو مین طبع ہوتی ہین - عدالتون ومحکمہ بندوبست اور چنگی وغیرہ کے جملہ کاغذات بھی چھپتے ہین یہ نامی مطبع چالیس برس سے اپنے فرائض منصبی کو بہایت ایمانداری اور خوش معاملگی سے ادا کر رہا ہے اور اسکی شہرت ونیکنامی روزافزون ہے اور اس مطبع مین کتب بہ نسبت اور مطابع کے بہت خوشخط وصاف وعمدہ چھاپی جاتی ہین جن صاحبونکو کچھہ چھپوانا ہو اُنکو کیفیت نرخ وغیرہ کی خط وکتابت سے معلوم ہوسکتی ہے - نمونہ کے لئے ہمارے مطبع کی چھپی ہوئی کتابین کافی ووافی ہین - فقط

المشتہر

محمد قادر علی خان صوفی مالک ومہتمم مفید عام آگرہ